وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(حصّہ اوّل، دوم وسوم)

موجودہ دور کے اجتماعی مسائل اور قانون شریعت کے نفاذ میں
درپیش مشکلات کا حل، احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

تالیف
اُستاذ الحدیث مولانا سیّد محمد بدر عالم صاحبؒ

ناشر
ایچ۔ ایم سعید کمپنی
ادب منزل پاکستان چوک کراچی

حرفِ آغاز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
حامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا
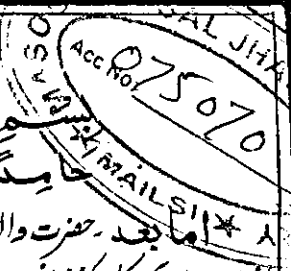
امابعد۔ حضرت والد ماجد کا مدت سے یہ شوق تھا کہ اسلامی معاشرت جو ایک عام لفظ ہے اور آج کل اکثر زبانوں پر اس کا ذکر بھی آتا ہے مگر اس کا صحیح اور مکمل نقشہ کم دماغوں میں موجود ہوگا اس لئے ترجمان السنۃ کی کم از کم دو جلدوں میں اس کو مبسوط طریقہ پر احادیث کیساتھ ساتھ جمع کیا جائے افسوس ہے کہ اس درمیان میں والد ماجد کو شدید خطرناک علالت پیش آگئی لیکن جو خیال ان کے قلب میں پہلے سے پختہ ہو چکا تھا وہ اب بھی اسی طرح موجزن رہا بالآخر اسی علالت کی حالت میں لیٹے لیٹے اس کا پہلا حصہ بطور املا تالیف فرمایا۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں بھلا احادیث کی تشریحات کیا ممکن تھیں اس لئے پہلا حصہ بہت ہی مجمل اور مختصر انداز میں تالیف ہو سکا اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ حسب توفیق الٰہی تالیف فرمایا جو پہلے حصہ سے کسی قدر مفصل تھا اسی کیفیت میں تیسرا حصہ بھی بطور املا ہی تالیف فرمایا جس میں بعض وقتی مسائل کے حل کی طرف توجہ فرمائی ہے آپ اس حصہ کو بھی اسلامی معاشرت کا ایک خاص گوشہ تصور کریں اور جس طرح اس کے پہلے حصے صرف حدیثی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں اس کو بھی اسی کی ایک کڑی تصور فرمائیں۔

رسالۂ ہذا کا مقصد صرف علمی ہے، جنگ زرگری نہیں، آپ کسی الجھاؤ کے بغیر صاف دماغ سے اسکو مطالعہ فرمائیں تاکہ آپ کو بداہۃً ثابت ہو جائے کہ اسلام میں حاکمیت کی سب سے بڑی روح موجود ہے اس میں محکومیت کی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے یہ ہماری ہی ذہنیت کی پستی ہے کہ ہم کو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی راہ صرف دوسروں کی اتباع اور نقالی میں نظر آنے لگی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے دل و دماغ کو پھر صحیح آزادی سے آشنا کر دے ؎

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ والد ماجد کے ظلِ عاطفت کو ہمارے سروں پر تا دیر قائم و دائم رکھے[1] اور اس رسالہ سے جو والد ماجد کی تمنا ہے وہ پوری فرمائے اور مسلمانوں کے لئے اس کو زیادہ سے زیادہ نافع بنائے۔

آفتاب احمد
نزیل مدینہ منورہ

[1] افسوس کہ اس بزرگ کا ۱۳۸۸ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قطب العارفین حضرت مولانا سید بدر عالم مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ دورِ حاضر کے مشہور و معروف محدث، شیخ طریقت اور صاحب تصنیف و تالیف بزرگ گذرے ہیں۔ وہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رح کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ان کے علوم و معارف کے ایک بڑے محافظ اور شارح تھے علمی اور روحانی عظمت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کا خصوصی وصف یہ تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی صلاح و فلاح کا سوز و درد اُن کو ہمیشہ مضطرب رکھتا تھا چنانچہ اہلِ ملت کی اصلاح اور مختلف فکری اور عملی فتنوں سے اُن کی حفاظت کے لئے انھوں نے کئی رسائل تصنیف فرمائے۔

حضرت مولانا کا پہلا وطن میرٹھ تھا لیکن وہ چونکہ تحریک پاکستان کے پُرزور مؤید اور متحدہ قومیت کے نظریہ کے علی الاعلان مخالف تھے، اس لئے پاکستان کی تخلیق کے بعد وہ یہاں منتقل ہو گئے تھے اور انھیں پاکستان کے استحکام اور اس کی ترقی سے خصوصی اور قلبی لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۱ء میں جب وہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ کے مقیم بن گئے، تب بھی اُن کا دل پاکستان کی ہر نقصان رساں بات پر مچل جاتا تھا اور ہر استحکامی اقدام سے وہ باغ باغ ہو جاتے تھے۔

۱۳۸۲ھ میں جبکہ مولانا صاحبِ فراش ہو چکے تھے انھیں اس خیال نے مضطرب کر دیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کو بطور خاص اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو عمومی طور پر ایسی دینی و عملی روشنی عطا کی جائے جس کی وجہ سے ان کے ذہن میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ ہمارے موجودہ گوناں گوں مسائل کا حل اسلام میں بہ تمام و کمال موجود ہے، اس کے لئے انھوں نے لیٹے ہی لیٹے ایسی احادیث جن سے مذکورہ غایت پوری ہو انتخاب فرما کر مختصر تشریح کے ساتھ قلمبند کرا دیں اور اس کا نام "جواہر الحکم" تجویز فرمایا "جواہر الحکم" کے دو چھوٹے حصے اور پھر ایک تیسرا ضخیم حصہ ایک برس کے اندر اندر شائع فرمایا۔

"جواہر الحکم" کی تالیف کی غرض و غایت خود حضرت ممدوح نے یہ تحریر فرمائی ہے:

"اس مختصر رسالہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ جن ناواقف اصحاب کو اسلام کی طرف سے بے وجہ اور بے دلیل یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ اسلام میں صرف مابعد الموت یا ہماری معاد کا حل ہے اور ہمارے موجودہ مسائل کے لئے اس میں کوئی روشنی نہیں ان کو ان چند احادیث اور مختصر اشارات سے جو کہیں کہیں

حدیثوں کی تشریح کے دوران آگئے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام نے اجتماعی مسائل کو کتنی اہمیت کے ساتھ حل کیا ہے اور ان کو کس طرح آسانی کے ساتھ سلجھا کر رکھ دیا ہے"۔ (حصہ دوم)

پھر "جواہر الحکم" کے حصۂ سوم کی ابتداء میں اس کو اور زیادہ شرح و بسط اور قوت کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"یہ سطور بستر علالت پر لیٹ کر بطور املا لکھوا دی ہیں تاکہ ناظرین کو نمونۃً یہ اندازہ ہو سکے کہ کتبِ فقہ اور فتاوے صحابہؓ اور اسلامی ججوں کے فیصلوں کو چھوڑ کر صرف حدیثی روشنی میں ہماری موجودہ مشکلات کا حل موجود ہے"۔

"اس کے بعد یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلامی آئین کی راہ میں جو مشکلات بھی اس وقت نظر آ رہی ہیں ان کا بڑا سبب ہماری تعلیم، ہماری معاشرت اور ہمارے دماغوں کے مسافت کی تبدیلی ہے"۔

"میں نے احادیث اور قضایا صحابہؓ اور دورِ اوّل کے فاضل ججوں کے فیصلوں کی طرف ابھی اس لئے توجہ نہیں دلائی کیونکہ پہلے ہی قدم میں ہمارے دماغوں میں ان کے مطالعہ اور فہم کی استعداد پیدا ہونی مشکل ہے اس لئے اگر ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھائیں تو ہمارے دماغوں میں ممکن ہے کہ قدرت یہ جذبہ پیدا کر دے کہ ہم کو ان متقدمین اصحاب کے مرتب کردہ آئین و ضوابط دیکھنے کا خود بخود شوق پیدا ہو جائے اور اس رستہ سے ہم صحیح اسلامی آئین سمجھنے کی استعداد اور اس کے نفاذ کے طریقے اور اس کے منافع محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں"۔

مؤلف گرامی رحمۃ اللہ علیہ کے ان چند اقتباسات سے یہ اندازہ بخوبی ہو گیا ہو گا کہ ان کی یہ تالیف کس قدر اہم مفید اور ضرورتِ وقت کی تکمیل کا اثر لئے ہوئے ہے جس وقت مؤلفِ گرامی نے یہ کتاب لکھی تھی اُس وقت سے کہیں زیادہ آج اس کی افادیت بڑھ گئی ہے جب کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے گرامی مرتبت صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے احکاماتِ اسلامی کی تنفیذ کا بیڑا اٹھایا ہے چنانچہ اسی غرض و غایت کے پیشِ نظر محترم الحاج حافظ فریدالدین احمد الوجیہہ (خلف محترم خان بہادر حاجی وجیہ الدین المیرٹھی مہاجر مدنی رح) نے جو حضرت مولانا سید بدرِ عالم نور اللہ مرقدہٗ کے مسترشدِ خاص ہیں اس وقت "جواہر الحکم" کی اشاعتِ نو کی طرف توجہ دلائی اور اس طرح یہ سعادت ہمارے حصے میں آئی اللہ تعالیٰ انھیں اس کی جزائے کثیر عطا فرمائے اور اہلِ ملت کا فکری دامن ان جواہر پاروں سے بھر جائے وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

طالب دعا
محمد زکی عفی عنہ

ادب منزل کراچی
رجب المرجب [illegible]ھ

فہرست عنوانات "جواہر الحکم"

(حصّۂ اول، دوم، سوم)

عرضِ مؤلّف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا ط

زلاف حمد و نعمت اولیٰ است بر خاکِ ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

امّا بعد ۔ بندہ ہیچمداں عرض پرداز ہے کہ آیتِ قرآنی وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تعلیم دیا کرتے تھے جس کا نام یہاں حکمت رکھا گیا ہے۔ اس لفظ کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ حکمت سے مراد سنت ہے۔

میرے دل کی تمنّا تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو لیکر تبلاتا کہ وہ حکمت کے لفظ کا مصداق کتنی صاف طور پر بن سکتی ہے، مگر اس وقت عام ضعف کے علاوہ خاص طور پر دماغی ضعف ایسا عارض ہو گیا ہے کہ اس اہم موضوع پر لکھوانا موجودہ حالت میں ناممکن ہے۔ خدائے تعالیٰ ہدایت دے ان منکرینِ حدیث کو، جنھوں نے انکارِ حدیث کر کے آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بہت بڑے بیش قیمت ذخیرے ہی کو آپ کی تعلیم سے خارج کر کے اُس سے نہ یہ کہ خود ہی محروم ہوئے بلکہ امتِ مسلمہ کو بھی محروم کرنے کا ناپاک ارادہ کیا ہے اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ

اس وقت دل میں یہ خیال موجزن ہے کہ اگر اس اہم مقصود کے لکھوانے سے محرومی رہی تو لاؤ جس طرح بھی ممکن ہو گر پڑ کر چند ہی حدیثیں لکھوا کر پیش کر دوں جن کا

حکمت ہونا ہر ذی فہم مسلمان سمجھ سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب ضعفِ ایمان کی وجہ سے ہم مسلمانوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ لفظِ حکمت کی تفسیر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے کی جا سکتی ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ رازاست وگرنہ
اینہا ہمہ رازاست کہ معلومِ عوام است

اس قسم کی احادیث صرف ایک کتاب "مشکوٰۃ" میں سینکڑوں سے متجاوز ہیں جن کا حکمت ہونا بدیہی ہے۔ مجھ میں اس وقت اتنا دم بھی نہیں کہ ان کے استیعاب کا ارادہ کر سکوں اس لئے محدثین کی اتباع میں سردست صرف چالیس حدیثوں کا مجموعہ لکھوا کر اُن اکابر کی نقالی کر رہا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ اسی کو پسند فرما کر میری مغفرت کا ذریعہ بنا دے اور اس کا نام جواھر الحکم رکھتا ہوں۔ اگر زندگی باقی رہی اور توفیق شاملِ حال رہی تو اسی طرح چالیس چالیس حدیثوں کے مجموعے لکھوا کر مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرتے رہنے کا خیال ہے یہ سب حصے اسی جواھر الحکم کے ہوں گے۔

پہلے حصے کی ترتیب اس طرح عمل میں آئی ہے کہ برخوردار عزیزم مولوی حافظ آفتاب احمد سلمہٗ سے حدیثیں پڑھوا کر اُن پر نشان دہی کی، اور عزیزم حافظ اسماعیل بلبلیہ سلمہٗ سے اُن کو علیحدہ نقل کرایا، پھر جب ذرا دل و دماغ نے ساتھ دیا اور توفیقِ الٰہی نے دستگیری فرمائی تو ایک ایک حدیث کا ترجمہ لکھوا دیا اور اس کے بعد پھر جب کبھی ہمت نے ساتھ دیا تو کہیں کہیں کچھ فوائد بغرض تشریح و تفہیم بھی لکھوا دیئے اور اس طرح یہ مجموعہ جو چند دنوں کا کام تھا چند مہینوں میں مکمل ہوا۔

مؤلف کا یہاں ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ اگر قارئینِ کرام اپنے اپنے ذوق کے مطابق جن احادیث کو پسند فرمائیں اُن کو خوبصورت کتبوں کی شکل میں طبع کرا کر ان تصویروں یا غالب کے اشعار کے بجائے ان جواھر الحکم کو اپنے گھروں میں آویزاں

کرلیں تو ممکن ہے کہ کسی سعیدِ ازلی کے دل میں یہ پُراز حکمت مختصر کلمات اثر کر جائیں اور اُن پر عمل کرنے کی توفیق میسر ہو جائے۔

محدثین نے اس سلسلہ میں جو مجموعے چہل حدیث کے عنوان سے جمع کئے ہیں وہ مختلف نظریات کے ماتحت ہیں مگر اس بندۂ حقیر نے صرف یہ ارادہ کیا ہے کہ ایسی مختصر مختصر احادیث کو جمع کیا جائے جو ہماری دین و دنیا کی فلاح و بہبود کے لئے کافی ہوں اور اسانید پر بحث کئے بغیر صرف صاحبِ مشکوٰۃ کے نقل فرمانے پر اعتماد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو اُن کے سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق بخشے، اور اپنی رحمت کے طفیل میں اس عاجز کو اس تالیف میں اخلاص کی نعمت سے نوازے اور ان پر عامل ہونے کا شرف عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ الَّذِىْ عَلَّمَهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَخَصَّصَهٗ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ ذَوِى الْمَجْدِ وَ الْكَرَمِ ـ

نزیل المدینۃ المنورہ
۱۱، صفر المظفر ۱۳۸۲ھ
بندہ محمد بدر عالم

نوٹ:- افسوس ہے کہ اس مجموعہ کو مؤلف مکرر دیکھ بھی نہ سکا، اس لئے جو فروگذاشت رہ گئی ہو وہ قابل معافی سمجھیں اور جو کوئی بات قابل پسندیدگی نظر آئے اس کو حق سبحانہ وتعالیٰ کا فضل تصور فرمائیں۔
فَاِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاِنْ كَانَ خَطَأً فَمِنِّيْ وَمِنَ الشَّيْطَانِ ؛

مقدمۃ الکتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بَارِئِ النَّسَمِ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ خُصَّ بِجَوَامِعِ الْکَلِمِ وَجَوَاہِرِ الْحِکَمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ خَیْرِ الْاُمَمِ

امابعد اللہ ربّ العزّت کا کس زبان سے شکر ادا کروں کہ اس نے اپنی رحمت کاملہ سے اس ہیچمدان کو اتنے ضعف اور اتنی علالت کے باوجود "جواہر الحکم" کے دوسرے حصّہ کی تکمیل کی توفیق بخشی۔ اس وقت عالم کے انقلابات کا ہولناک نقشہ اور علماء وصالحین کا بڑی تیزی کے ساتھ اٹھتے چلے جانے کا عبرتناک سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لئے اس سلسلہ کی چند احادیث اس حصّہ میں بے اختیار درج ہوگئی ہیں تاکہ اہل فہم وسعادت اپنی قلیل فرصت کو بیکار ضائع نہ کریں اور جتنی جلد ممکن ہو اعمال خیر میں ہمّت سے کام لیں۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ وَسَارِعُوْآ اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ط

ایک اہم اور قابل توجہ گذارش

اس مختصر رسالہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ جن ناواقف اصحاب کو اسلام کی طرف سے بے وجہ اور بے دلیل یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ اسلام میں صرف مابعد الموت یا ہماری معاد کا حل ہے اور ہمارے موجودہ مسائل کے لئے اس میں کوئی روشنی نہیں۔ ان کو ان چند احادیث اور بہت مختصر اشارات سے جو کہیں کہیں حدیثوں کی تشریح کے دوران میں آگئے ہیں یہ معلوم

ہو جائے کہ اسلام نے اجتماعی مسائل کو کتنی اہمیت کے ساتھ حل کیا ہے اور ان کو کس طرح آسانی سے سُلجھا کر رکھ دیا ہے۔

اب یہ فرض آپ کا ہے کہ ان ٹھوس باتوں کو اپنے جدید اصطلاحی الفاظ میں ترتیب دے کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مؤلفِ ضعیف ان تفصیلات کے لئے کتنا بے چین و مضطرب ہے، اس کو یورپ زدہ کیا جانیں، اس کو وہی سمجھ سکے گا جس کو یہ یقین اور عین الیقین ہو کہ یہ دین کامل دین ہے، آخر اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا) (پارہ ۶ رکوع ۵) کے کچھ معنٰی ہیں یا نہیں، یہ چند سطریں بطورِ نمونہ مشتے از خروارے پیش کی جا رہی ہیں۔ آپ جس طرح غور کے ساتھ انگریزوں کی تعلیمات دیکھا کرتے ہیں ذرا تھوڑے سے حُسنِ ظن کے ساتھ خدارا ان پر بھی تو غور کریں اور انصاف کریں کہ آپ کے دین میں وہ کونسا گوشۂ زندگی باقی ہے جس پر بحث نہیں کی گئی۔

"جواہر الحکم" کا پہلا حصہ بھی اسی نظر سے لکھا گیا تھا مگر افسوس یہ ہے کہ اپنے انتہائی ضعف کی وجہ سے اس کی احادیث پر عنوانات قائم نہیں کئے جا سکے اور نہ تشریحات میں ان پر تنبیہات اور مختصر اشارات ہی کئے جا سکے۔ ضعف کی حالت اس وقت بھی کم نہیں لیکن اس حصہ میں توفیقِ الٰہی نے ساتھ دے دیا اور جو آنا ممکن ہو سکا پیش کر دیا گیا ہے۔

"جواہر الحکم" کے دونوں حصوں میں اس بات کی رعایت کی گئی ہے کہ دین کے وہ بہت سے اہم گوشے اجاگر ہوں جو نہ صرف عملی طور پر معطل ہو چکے ہیں بلکہ ہمارے دماغوں سے بھی نکل چکے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس خلافِ شرع امور اور بدعملی ہمارے ماحول میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اب اس سے بچنا گویا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

اس لئے میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں بڑی خیر خواہی اور دردمندی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ہر ہر حدیث کو بار بار اور بہت غور کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں اور اپنی زندگی کے بگڑے ہوئے شعبوں کی اصلاح کی طرف ان احادیث کی روشنی میں تیز قدم اٹھائیں اور صرف

علمی بحثوں میں اُلجھ کر اور کٹ حجتی میں پڑ کر ان جواہرات کی قدر دانی سے محروم نہ رہیں۔ علام الغیوب کی جانب سے انسانیت کی اصلاح کے جو علوم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی معرفت آتے رہے ہیں اب آنحضرت صلی اللہ علیہ کے ذریعہ اس کی بہت مکمل اور آخری قسط آچکی ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ م بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (اب کس بات پر اس کے بعد یقین لائیں گے) (پارہ ۲۹ رکوع ۲۲) اس لئے اہوائے نفسانیہ اور اپنی عقول ناقصہ کی پرواز کی حد پہچان کر یہ امید منقطع کر دیں کہ آپ کی فلاح وبہبود کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ نکل سکتا ہے اور یہ تو سودائے خام ہے کہ اس مکمل آئین میں کسی ادنیٰ ترمیم کا خیال دماغوں میں لائیں۔

دنیوی ترقیات کا دروازہ یقیناً کھلا ہوا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا لیکن اس ذات کی قسم کہ جس نے زمین اور آسمان کو بنایا اور اس کا ایک آئین بھی خود ہی بنا دیا ہے کہ اب دین میں کسی جدت کی نوکیا ایک چھوٹا سا نقطہ بھی رکھنے کی گنجائش باقی نہیں ہے، یہ بات دوسری ہے کہ ہم اپنی غفلت اور دینی جہالتوں کے باعث ان سہولتوں اور وسعتوں سے فائدہ اٹھانا تو درکنار ان کو دیکھے بغیر محض اپنی جسارت سے دین میں تنگی اور شدت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ اور نہ رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل، دین تمہارے باپ ابراہیم کا) (پارہ ۱۷، رکوع ۱۷)

یہ ایک مختصر رسالہ ہے اس لئے نہ اس کی تمہید کو زیادہ طول دیا جاسکتا ہے اور نہ آپ کو "تشریحی نوٹوں" میں اس کا انتظار کرنا چاہیئے۔ میرا علم ناقص در ناقص ہے اور دماغ بھی غیر حاضر ہے اس لئے آپ صرف ان پیش کردہ احادیث کے "انمول موتیوں" سے بے کھٹکے اپنا دامن بھر لیں اور تشریحات میں جو سقم نظر آئے اس کو احقر کا قصورِ علم تصور فرمائیں۔

میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان چند اوراق کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ کر دے اور میری مغفرت کا ایک بہانہ بنا دے ؂

وذٰلک فی ذات الالٰہ وان یشاء ٭ یبارک علی اوصال شلو ممزع

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ اَفْضَلِ الْاَنْبِيَاءِ وَسَيِّدِ الرُّسُلِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ نُجُوْمِ الْهِدَايَةِ وَهُدَاةِ السُّبُلِ ۔

نوٹ :۔ اس حصہ میں ہر حدیث کے اخیر میں مشکوٰۃ شریف طبع ہندی کے صفحات بھی لکھ دئے گئے ہیں تاکہ اگر کسی کو اصل کتاب میں حدیث تلاش کرنی ہو تو بآسانی تلاش کی جاسکے ۔ اس حصہ میں ستر ۷۰ حدیثیں بخاری و مسلم اور موطا امام مالک اور سنن کی ہیں بقیہ مسند امام احمد اور بیہقی کی شعب الایمان کی ہیں اور ان کے علاوہ تین چار حدیثیں دیگر کتب کی بھی روایت کردہ ہیں "جواہر الحکم" کا پہلا حصہ اس وقت سامنے نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس حصہ میں کوئی حدیث مکرر آگئی ہو تاہم مکرر بھی ہو تو قند مکرر کا لطف دے گی انشاء اللہ تعالیٰ ۔

المدینۃ المنورہ
۱۳۸۲ھ

بندہ محمد بدرِ عالم غفرلہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِؕ

ایک اہم اور قابل توجہ گذارش

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ بَارِئِ النَّسَمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ خُصَّ بِجَوَامِعِ الۡکَلِمِ وَجَوَاھِرِ الۡحِکَمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ خَیۡرِ الۡاُمَمِ

اس مختصر رسالہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ جن ناواقف اصحاب کو اسلام کی طرف سے بے وجہ اور بے دلیل یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ اسلام میں صرف ما بعد الموت یا ہماری معاد کا حل ہے اور ہمارے موجودہ مسائل کے لیے اس میں کوئی روشنی نہیں، ان کو ان چند احادیث اور مختصر اشارات سے جو کہیں کہیں حدیثوں کی تشریح کے دوران میں آگئے ہیں، یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام نے اجتماعی مسائل کو کتنی اہمیت کے ساتھ حل کیا ہے اور ان کو کس طرح آسانی سے سلجھا کر رکھ دیا ہے۔

اب یہ فرض آپ کا ہے کہ ان ٹھوس باتوں کو اپنے جدید اصطلاحی الفاظ میں ترتیب دے کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مؤلفِ ضعیف ان تفصیلات کے لیے کتنا بے چین و مضطرب ہے اس کو یورپ زدہ کیا جانیں، اس کو وہی سمجھ سکے گا جس کو یہ یقین اور عین الیقین ہو کہ یہ دین کامل دین ہے، آخر اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ (آج میں پورا کر چکا تمھارے لیے دین تمھارا۔ پ۶، رکوع ۵) کے کچھ معنٰی ہیں یا نہیں۔

یہ چند سطریں بطورِ نمونہ مشتے از خروارے پیش کی جا رہی ہیں، آپ جس طرح غور کے ساتھ انگریزوں کی تعلیمات دیکھا کرتے ہیں، ذرا ٹھنڈے دل سے حسنِ ظن کے ساتھ

خدارا ان پر بھی تو غور فرمائیے اور انصاف کیجئے کہ آپ کے دین میں وہ کون سا گوشۂ زندگی باقی ہے جس پر بحث نہیں کی گئی۔

جواہرالحکم کے دونوں حصوں میں اس بات کی رعایت کی گئی ہے کہ دین کے وہ بہت سے اہم گوشے اجاگر ہوں جو نہ صرف عملی طور پر معطل ہو چکے ہیں، بلکہ ہمارے دماغوں سے بھی نکل چکے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس خلافِ شرع امور اور بدعملی ہمارے ماحول میں اس درجہ سرایت کر چکی ہے کہ اب اس سے بچنا گویا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے اس لیے میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں بہت خیر خواہی اور دردمندی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ہر ہر حدیث کو بار بار اور بہت غور کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں اور اپنی زندگی کے بگڑے ہوئے شعبوں کی ان احادیث کی روشنی میں اصلاح کا تیز قدم اٹھائیں اور صرف علمی بحثوں میں الجھ کر اور کٹ حجتی میں پڑ کر ان جواہرات کی قدردانی سے محروم نہ رہیں۔

علام الغیوب کی جانب سے انسانیت کی اصلاح کے جو علوم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی معرفت آتے رہے ہیں، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی بہت مکمل اور آخری قسط آ چکی ہے۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ (اب کس بات پر اس کے بعد یقین لائیں گے) (پ ۲۹، رکوع ۲۲) اس لیے اہوارِ نفسانیہ اور اپنی عقولِ ناقصہ کی پرواز کی حد پہچان کر یہ امید منقطع کر دیں کہ آپ کی فلاح و بہبود کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ آئندہ نکل سکتا ہے اور یہ تو سودائے خام ہے کہ اس مکمل آئین میں کسی ادنیٰ ترمیم کا خیال دماغوں میں لائیں۔

دنیوی ترقیات کا دروازہ یقیناً کھلا ہوا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا لیکن اس ذات کی قسم کہ جس نے زمین اور آسمان کو بنایا اور ان کا ایک آئین بھی خود ہی بنا دیا ہے کہ اب دین میں کسی جدت کی تو کیا، ایک چھوٹا سا نقطہ بھی رکھنے کی گنجائش

باقی نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اپنی غفلت اور دینی جہالتوں کے باعث ان سہولتوں اور وسعتوں سے فائدہ اٹھانا تو درکنار ان کو دیکھے بغیر محض اپنی جسارت سے دین میں تنگی اور شدت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ۚ (اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل، دین تمھارے باپ ابراہیم کا) (پ۱۷، رکوع ۱۷)

رسالہ کے ملاحظہ فرمانے سے قبل ناظرین کرام کی خدمت میں یہ التماس کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کا تعلق نہ کسی جماعت کے ساتھ ہے نہ کسی خاص شخصیت سے اس کا تعارف ہے۔ وہ مدتوں سے عالم گمنامی میں پڑا ہوا اپنی حیات مستعار کے دن پورے کر رہا ہے۔ اس لیے اس رسالہ کو زبردستی کسی کی طرف اشارہ سمجھنے یا کسی پر چسپاں کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ عالم اسلامی کا عام انتشار دیکھ کر ایک زخم خوردہ دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے چند اشکہائے غم حقیر الفاظ کی شکل میں بہا دے تاکہ اگر ان کو اس مختصر عرضداشت سے کوئی صحیح راستہ کا سراغ ہاتھ نہ لگ سکے تو کم از کم میرا دل تو کچھ ٹھنڈا ہو جائے۔ ؎

مقصود عرضداشت سے اظہارِ حال ہے
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

اب اس کے بعد آپ کو اختیار ہے کہ اس عرضداشت کو قبول فرمائیں یا نہ فرمائیں، لیکن خدارا اس دورِ اختلاف میں کسی اور نئے اختلاف کا اکھاڑا نہ بنائیں۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ یہ صرف چند اسلامی اہم ضرورتوں کے حدیثی روشنی میں حل کا ایک نمونہ ہے اور وہ بھی حدیث کی ایک ایسی مختصر کتاب سے چن کر پیش کیا گیا ہے جس میں بڑی کتابوں کے طویل طویل بابوں میں سے چند احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے۔ میں نے اس رسالہ میں اس مختصر انتخاب کے استیعاب کا بھی ارادہ

نہیں کیا بلکہ اس میں سے بھی صرف نمونہ کے طور پر ایک ایک دو دو حدیثیں چن لی ہیں لہٰذا اس کو یہ سمجھ لینا کہ یہ اسلامی آئین کے متعلق کوئی مستقل اور مستوعب تصنیف ہے صحیح نہیں ہے اور نہ مؤلف اپنی سہ سالہ مسلسل علالت کے بعد استیعاب کا ارادہ کر سکتا ہے۔ یہ سطور بستر علالت پر لیٹ کر بطور املاء لکھوا دی ہیں تاکہ ناظرین کو نمونۃً یہ اندازہ ہو سکے کہ کتب فقہ اور فتاوائے صحابہؓ اور اسلامی ججوں کے فیصلوں کو چھوڑ کر صرف حدیثی روشنی میں موجودہ مشکلات کا حل موجود ہے یا نہیں۔

آمدم برسرِ مطلب، اب سوال یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں کیا اسلام پر عمل کرنا کچھ مشکل ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلامی آئین کی راہ میں جو مشکلات بھی اس وقت نظر آ رہی ہیں، ان کا بڑا سبب ہماری تعلیم، ہماری معاشرت اور ہمارے دماغوں کی ساخت کی تبدیلی ہے۔

انگریزی دورِ حکومت نے ہماری عربی اور انگریزی درسگاہوں کو ایسا برباد کیا اور ایسے لایعنی اختلافات میں پھانس دیا کہ جو عربی خواں بنے ان کو اپنی گذشتہ صدیوں کے دورِ حکومت کے اندرونی و بیرونی نظام کے مطالعہ کا خیال نہ گذر سکا۔ عہد صحابہؓ کے قضایا اور اسلامی حکومت کی عدالتوں کے نظام اُن کے فاضل ججوں کے فیصلوں پر گہری نظریں ڈالنے سے ہٹا کر ان کو جزئی اختلافات میں پھانس دیا، ملکی سیاست اور دوسرے ممالک سے اپنے تعلقات کی نوعیت اور دوسرے امور کی طرف اسلامی نظریہ سے جائزہ لینے کا کبھی ان کو موقع نہ دیا، پھر جن شاذ افراد کو اس طرف توجہ کرتے دیکھا، ان میں سے کسی کو جلا وطن کر دیا اور کسی کو طرح طرح سے بدنام کر دیا حتیٰ کہ ان کی تصانیف سے بھی ہم کو اتنا محروم کر دیا کہ مشکل سے چیدہ چیدہ کچھ افراد ہی نکلیں گے جنھوں نے اس نظریہ سے کچھ دلچسپی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہوگا۔

اب انگریزی درسگاہوں کی طرف توجہ فرمائیے تو ان کو اس طرح برباد کیا کہ ہمارے دماغوں میں انگریز کی خدمت و عظمت اور ان کے خطابات کی ہوس کے سوا کوئی نصب العین ہی باقی نہ چھوڑا، اپنی اسلامی روایات کا زندہ کرنا تو درکنار اس کے برعکس ان سے اتنی نفرت دلوں میں پیدا کردی کہ اکل طعام و شراب کے طریقے، لباس کی وضع قطع حتیٰ کہ معاشرہ کے ایک ایک گوشہ میں ان ہی کی تہذیب زندہ کرنے میں ہم اپنی ترقی کا راز مضمر سمجھنے لگے، سی، آئی، ڈی کے محکمے مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے انگریزی افسران بلکہ انگریزوں کے تمام محکموں کے چلانے کی تمام مشینریاں ان ہی درسگاہوں سے تیار ہوئیں، پھر ہمارے قانونی دماغوں کو جس قانون سے واسطہ پڑتا رہا وہ یہی انگریزی قانون تھا اس لیے اسی کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہو گیا اور انہی علمی سرگرمیوں نے ہمارے دماغوں کی ساخت اتنی بدل ڈالی کہ اب جو قانون ان کے قانون سے ملتا جلتا تھا وہ ہمارے دماغوں کے لیے بے دلیل قابلِ تسلیم تھا اور جو اس کے ذرا خلاف ہوتا وہ بے دلیل ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

رہا اسلامی قانون تو اول تو عربی سے ناواقفیت کی بدولت اس کا مطالعہ کرنے کی نوبت ہی کب آسکتی تھی بلکہ جب مختلف انگریزی قانون کے مطالعہ اور انگریزی عدالتوں میں کھڑے ہو کر اسی کے مطابق پیروی کرنے میں عمر بسر ہو گئی تو اب ہمارے دماغوں میں اسلامی قانون کے نظریات سمجھنے کی استعداد ہی کیا باقی رہ سکتی تھی۔ آج بھی یہ تجربہ ہے کہ وکلاء میں جو وکیل فوجداری کا کام زیادہ کرتا ہے آخر میں اس کا دماغ دیوانی مقدمات میں زیادہ نہیں چلتا اسی طرح اس کے برعکس ہے۔

یہ فرق کیوں پیدا ہو گیا اسی لیے نا کہ ایک طویل مشاقی کے بعد انسانی غور و فکر کا زاویۂ نظر ہی ایک خاص دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے باہر وہ نکلنا چاہے بھی تو نکل نہیں سکتا خواہ اس کو اپنی اس خامی کا خود شعور ہو یا نہ ہو، اسکے

علاوہ جو ایک عمیق عیاری انگریزوں نے کی وہ یہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور علمار کے مابین نفرت کی اتنی بڑی خلیج حائل کردی کہ اس کی وجہ سے ایک دوسرے کے کبھی قریب آہی نہ سکا۔ اس لیے سیاست و مذہب کے دو ٹکڑے ہوگئے اور ایک دوسرے سے اتنے بعید ہوگئے کہ کبھی اجتماعی طور پر ہم کو اسلامی آئین کے لیے مل جل کر غور کرنے کا موقعہ ملنا ہی ناممکن ہوگیا پھر جب ہم کو آزادی ملی تو ایسی حالت میں ملی کہ ہمارے دماغ ان مسموم اثرات سے اتنے متاثر ہوچکے تھے کہ مذہب و وطن کے ایک رشتہ میں منسلک ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے بدگمان رہے کہ اب ہر جماعت کو اپنی کامیابی کا راز دوسری جماعت کی شکست میں نظر آنے لگا اور یہی نظریہ ابھی تک کارفرما ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اس لیے موجودہ زمانے میں اسلامی آئین میں اگر کوئی دشواری ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو تعلیم یافتہ دماغ سالہا سال سے انگریزی کا مطالعہ کرتے کرتے اب تھک چکے ہیں ان کے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ از سر نو پھر اتنی ہی محنت اٹھائیں کہ اسلامی قوانین سے براہ راست پورے طور پر استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔ ان کیلئے اب دو ہی راہیں تھیں، یا اسلامی قوانین کا انگریزی تراجم کے ذریعہ سے مطالعہ کریں، یا ایسے علمار سے مشورہ طلب کریں جو کسی علمی یا انسانی کمزوری کی وجہ سے ان کی ہم نوائی کرنے پر مجبور ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ آئندہ اس کا کوئی حل ہے بھی یا نہیں، تو جواب کھلا ہے کہ سب سے پہلے تو عربی اور انگریزی درسگاہوں اور اہل علم میں جو منافرت و عداوت قائم ہوچکی ہے اس کے دور کرنے کی پوری جدوجہد کی جائے اور یہ فیصلہ کرکے کی جائے کہ اسلامی قوانین کو انگریزی سائنس کے سامنے جھکانا ہے یا اسلامی قانون کے اندر رہ کر جدید ترقیات سے استفادہ کرنا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ یہ بگڑا ہوا نقشہ چند مہینوں یا سالوں میں تبدیل نہیں ہو سکتا، کیونکہ عملی اختلاف اب عقائد کی جگہ حاصل کر چکا ہے، اس لیے جانبین کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹنا ایک پہاڑ نظر آنے لگا ہے، بالخصوص جبکہ علمی روشنی کے ساتھ خواہ وہ کفر کے قوانین ہی ہوں، ہم کو ظاہری شان و شوکت بھی حاصل ہو، اس لیے ایک طرف کچھ ہم کو تنزل کرنا ہوگا دوسری طرف صحیح علماء کو دوسرے مشاغل سے الگ ہو کر کچھ ترقی کرنی ہوگی اور اسلامی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا جس میں احادیث، صحابہؓ اور عہد سلف کے فیصلے، خلفاء کے زمانہ کا نظامِ حکومت، پھر درجہ بدرجہ ہر دور کے اکابر اور فاضل ججوں کا طرز عدالت، یہ سب اشیاء اس وقت تصانیف کی شکل میں موجود ہیں اور متاخرین میں سے اس پر حافظ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل وغیرہ وغیرہ کی کتب کا پورے غور و فہم کے ساتھ مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔

اسی کے ساتھ ساتھ اگر جدید تعلیم یافتہ جو دینی اور مذہبی خیال رکھنے والے ہیں وہ تھوڑا سا وقت عربی کے ایک مختصر کورس کے پڑھنے میں صرف کریں جو میرے نزدیک چار سال سے زیادہ کا نہ ہوگا مگر اس میں یہ رعایت رکھنی لازمی ہے کہ وہ کورس اتنا ٹھوس ہونا چاہیئے جس کا نتیجہ بھی ٹھوس نکل سکے۔ نیم ملّا جو بھی ہوگا وہ خطرۂ ایمان ثابت ہو کر رہے گا۔ یہ بحث تو اصولی ہے لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا دور کر دینا بھی اصولاً ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دماغوں میں بے وجہ یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مذہب اور سائنس پر بیک وقت عمل پیرا ہونا مشکل ہے، حالانکہ ان دونوں میں ٹکراؤ کا کہیں موقع ہی نہیں۔ سائنسِ جدید کی ترقیات کا عام تعلق عالمِ مادیات سے ہے جس میں مذہب کہیں حائل نہیں ہوتا اور اگر کسی شعبہ میں معمولی سا تصادم نظر آئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ سائنس کا اقتضا نہیں آپ کی خواہشات کا تقاضا ہے، اس لیے سائنس اور جدید خواہشات کے تقاضوں میں اگر آپ فرق ملحوظ رکھ لیں تو اسلامی قانون کی طرف سے بدگمانیوں کا دروازہ

خود بخود بند ہو جائے گا۔

اس کے بعد میرا خیال تھا کہ میں اسلامی نظریہ کے مطابق چند اہم نکات اور پیش کرتا جو اسلامی آئین کی ترتیب میں بڑی حد تک روشنی کا موجب ہو سکتے تھے لیکن جب یہ دیکھا کہ اگر ان کو اجمالی شکل میں بھی پیش کیا جاتا ہے تو یہ مختصر تمہید بھی ایک مستقل رسالہ کی شکل اختیار کرلے گی، اس لیے اپنے قلم کو اس حد پر روک کر صرف بہت دردمندانہ اور مخلصانہ طریقہ پر اتنی عرضداشت پیش کرنی ضروری سمجھتا ہوں کہ قانون جو بھی بنے لیکن جب تک وہ صحیح معنٰی میں اسلامی قانون نہ ہو بلکہ انگریزی قوانین کا صرف ایک چربہ ہو اس کا نام اسلامی قانون نہ رکھا جائے اور اس درمیان میں اسلامی عہد کے قوانین بالخصوص سلطان عالمگیرؒ جس کو انگریزی تاریخ بھی (Emperor Aurangzeb The Great) کہہ کر یاد کرتی ہے، کم سے کم انھیں کے دور کے قوانین کا مطالعہ جاری رکھا جائے اور اگر موجودہ ترقی یافتہ دماغ ان میں کوئی روشنی محسوس کرے تو ان سے استفادہ کی کوشش ضرور جاری رکھے۔

میں نے احادیث اور قضایائے صحابہؓ اور دور اول کے فاضل ججوں کے فیصلوں کی طرف ابھی اس لیے توجہ نہیں دلائی کہ پہلے ہی قدم میں ہمارے دماغوں میں ان کے مطالعہ اور فہم کی استعداد پیدا ہونی مشکل ہے اس لیے اگر ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھائیں گے تو ہمارے دماغوں میں ممکن ہے کہ قدرت یہ جذبہ پیدا کردے کہ ہم کو ان متقدمین اصحاب کے مرتب کردہ آئین وضوابط دیکھنے کا خود بخود شوق پیدا ہو جائے اور اس راستہ سے ہم صحیح اسلامی آئین سمجھنے کی استعداد اور اس کے نفاذ کے طریقے اور اس کے منافع محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور خود تراشیدہ آئین کا نام اسلامی آئین رکھ دیا گیا تو صرف یہی نہیں کہ یہ خلاف واقعہ ہوگا بلکہ ایک اخلاقی اور مذہبی جرم بھی ہوگا اور جب کبھی مسلمانوں کو آئندہ دور میں اسلامی تاریخ کے صحیح مطالعہ کا

موقع ملے گا تو ان کو یہ مغالطہ بجا طور سے لگ سکتا ہے کہ شاید اسلام بھی مختلف زمانوں میں مختلف مصالح کے پیش نظر سانپ کی طرح کینچلی بدلتا چلا آیا ہے جس کا دنیا میں درحقیقت نہ کوئی نصب العین تھا اور نہ کوئی حقیقی وجود تھا، بس جس دور میں مسلمانوں نے کسی آئین کا نام اسلامی آئین رکھ لیا اس کی حقیقت صرف اتنی ہی تھی اور بس۔

یہ میری ایک ہمدردانہ گذارش ہے، اس میں نہ کسی خاص شخص پر نکتہ چینی مقصود ہے اور نہ کسی پارٹی کی ترجمانی کرنی منظور ہے، کیونکہ احقر کے نزدیک ان چالبازیوں سے علم کا کوئی تعلق نہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس رسالہ کے عنوانات کی ایک اجمالی فہرست آپ کے سامنے پیش کردوں۔ میں نے اپنے دور میں انسان کے خون کی قیمت کی جو ارزانی دیکھی اس سے میرے دل کو اتنا دکھ ہوا کہ میں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ میں سب سے پہلے اسلامی نظریہ سے انسان کی قیمت کی اہمیت بیان کروں۔ اس کے بعد مجھ کو ہماری اپنی موجودہ بربادی کا جو سب سے بڑا سبب معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں اُنس اور محبت، اغماض اور حسن ظنی کی بجائے بغض اور عداوت، بدگمانی اور بے وجہ جھگڑے پیدا کرنے کی خصلت پیدا ہو چکی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ میں اس حقیقت کو واضح کردوں کہ اسلامی نظریہ سے انس و محبت صرف مسلمانوں کے مابین نہیں بلکہ جملہ مخلوق کے ساتھ یہ تعلق رکھنا ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد چند عنوانات حاکم اور محکوم کے باہمی تعلقات اور ان کے چند فرائض کے متعلق ہیں پھر چند ایسی فلسفیانہ نصائح درج کی گئی ہیں جو دیکھنے میں بہت سطحی نظر آتی ہیں مگر ان کے اثرات بہت عمیق اور گہرے ہیں، رسالہ کے خاتمہ پر صرف ایک حدیث صحابۂ کرام کے متعلق لکھی گئی ہے کیونکہ دین انہی کے واسطہ سے ہم کو پہنچا، اس لیے اگر ان کا صحیح تعارف نہ کرایا جائے تو یہ رسالہ یقیناً نامکمل رہے گا۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى

اللهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ (کہدے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں) (پ ۱۳، رکوع ٦)

میرا علم ناقص در ناقص ہے اور دماغ بھی غیر حاضر ہے اس لیے آپ صرف ان پیش کردہ احادیث کے انمول موتیوں سے بے کھٹکے اپنا دامن بھر لیں اور تشریحات میں جو سقم نظر آئے اس کو احقر کا قصورِ علم تصور فرمائیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان چند اوراق کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ کر دے اور میری مغفرت کا ایک بہانہ بنا دے۔ ؎

وذٰلك فی ذات الاله وان يشاء ⁂ يبارك علٰی اوصال شلو ممزع

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ۔

(نوٹ) یہ حکومت اسلامیہ کے متعلق چند احادیث کا ترجمہ ہے، مختصر تشریحات کے ساتھ اس کا نام آئین اسلام رکھنا صحیح نہیں اور وہ بھی ایسی غیر ذمہ دارانہ حالت میں لکھا گیا ہے کہ مصنف بسترِ علالت پر پڑا ہوا ہے اور اس کو دوبارہ سننے کی ہمت بھی نہیں ہے۔ طالبینِ حق کو چاہیئے کہ وہ تعبیری اصلاحات خود فرمالیں اور اصل مقصد کو سمجھنے میں بے وجہ نہ الجھیں۔

فقط والسلام

بندہ محمد بدر عالم غفر لہٗ

المدینۃ المنورہ

۳ ر ذی الحجۃ الحرام ۱۳۸۲ھ

جواہر الحکم حصۂ اوّل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

(۱)

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِظْنِیْ وَاَوْجِزْ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلٰوتِکَ فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ وَلَا تَکَلَّمْ بِکَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْہُ غَدًا وَاجْمَعِ الْاِیَاسَ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ (رواہ احمد م ص ۴۴۵)

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی مجھ کو کوئی مختصر سی نصیحت فرمادیجئے۔ آپؐ نے فرمایا اچھا تو جب نماز پڑھنے کھڑا ہو تو ایسی نماز پڑھنا جیسا رخصت ہونے والا آخری نماز پڑھتا ہے۔ اور ایسی بات زبان سے مت نکالنا جس پر کل کو معذرت کرنی پڑے اور دوسروں کے پاس جو مال ہے اس کی کوئی طمع اپنے دل میں نہ رکھنا۔

شرح: یہ تین مختصر نصائح انسانی معاش اور معاد کی خوشحالی کے لئے کافی ہیں۔

یہاں پہلی نصیحت نماز کے متعلق ہے۔ نماز کیا ہے، یہی کہ دونوں ہاتھ اٹھائے گویا دنیا کو پس پشت ڈال دیا اور اللہ اکبر کہہ کر گویا اس جہان سے نکل کر عالم قدس میں داخل ہو گیا، اب نہ کھانا ہے نہ پینا۔ نہ کسی سے خطاب کرنا ہے، نہ کسی کی طرف التفات، مُصلّی کو دیکھو تو سر تا پا ادب ہی ادب نظر آتا ہے، کھڑا ہے تو ہمہ تن کسی سے مناجات میں منہمک ہے، کبھی رکوع میں جھکتا ہے تو کبھی سجدہ میں جاپڑتا ہے۔

اور کچھ دیر کے لئے کسی کی تسبیح و تقدیس میں ایسا مشغول ہے کہ اس کی نظروں میں کوئی دوسرا گویا موجود ہی نہیں، اسی محویت کی صورت سے گزر کر با ادب دوزانو بیٹھ جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے دائیں بائیں والوں کو اس طرح السلام علیکم کہتا ہے گویا کسی دوسرے عالم سے ابھی ابھی اس جہان میں آیا ہے۔

نماز کیا ہے عین اقامت کی حالت میں ایک عجیب سفر ہے، کتنا طویل ہے اور کتنا مختصر۔ طویل تو اتنا کہ عالمِ اسفل سے عالمِ بالا کا، اور مختصر اتنا کہ صرف چند لمحات میں واپسی ہو جاتی ہے۔ کاش اگر اس صورتِ سفر میں ہمارے دلوں میں یہ تصور پختہ ہو کر حقیقت کا رنگ پیدا کر لے تو ہماری نمازوں میں بس جان پڑ جائے اور مومنوں کے لئے نماز کے معراج ہونے کا مطلب شاید کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے کتنی مشکل اور دشوار گذار حقیقت کو کتنے آسان طریقے پر ادا فرما دیا ہے یعنی یہ کہ یوں نماز پڑھو گویا سب کو رخصت کر دیا اور سب سے رخصت ہو گئے اور یہ یقین کر لو گویا تمام جہان کو رخصت کر کے یہ آخری نماز پڑھ رہے ہو، اب معلوم نہیں کہ میسر ہو کہ نہ ہو۔

دوسری[۲] بات کیسی عجیب فرمائی کہ جب منھ سے کوئی بات نکلے تو ہمارا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ہم یہ خوب سوچ لیں کہ کل بندوں کے سامنے یا فردائے قیامت میں پروردگار کے سامنے قابلِ ندامت نہ ہو کہ پھر اس کی معذرت کرنی پڑے۔

تیسری[۳] بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ دوسروں کے مال کی طرف تکا کرتا ہے خواہ خود غنی ہی کیوں نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے نفس میں ہمیشہ کے لئے فقر کی خصلت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اِس بُری خصلت کی وجہ سے دوسروں سے قلب میں خفیہ طور پر عداوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی راحت اور آرام کی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ بن جاتی ہے۔ اگر کاش مسلمان اس مختصر نصیحت پر عمل کر لے تو اس کی تلخ زندگی بہت آسانی کیساتھ شیریں بن سکتی ہے۔

ان تین مختصر جملوں میں معاش اور معاد کی فلاح کے اسرار کو سمودینا یہ انھیں کی شان تھی جن کو جوامع الکلم مرحمت کئے گئے تھے۔ خدا تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق بخشے۔

(۲)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ ذَکَرَ الصَّلٰوۃَ یَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَیْهَا کَانَتْ لَهٗ نُوْرًا وَّبُرْهَانًا وَنَجَاةً یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمَنْ لَّمْ یُحَافِظْ عَلَیْهَا لَمْ تَکُنْ لَهٗ نُوْرًا وَّلَا بُرْهَانًا وَّلَا نَجَاةً وَّکَانَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَاُبَیِّ بْنِ خَلَفٍ؛

(رواہ احمد والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز کے متعلق تاکید فرمائی تو ارشاد فرمایا جو شخص اپنی نمازوں کی نگرانی کرے گا تو وہ قیامت میں اس کے لئے نور بن جائے گی اور اس کے ایمان کی بڑی پختہ دلیل ہوگی اس کے لئے نجات کا باعث ہوگی اور جس شخص نے اس کا کچھ خیال نہ رکھا تو قیامت کے دن وہ اس کے لئے نہ نور ہوگی، نہ حجت اور نہ اس کی بخشش کا ذریعہ اور وہ قیامت میں قارون وفرعون وہامان و ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

شرح: حدیثوں میں ترکِ صلوٰۃ کے متعلق اتنی شدید وعید آئی ہے کہ تارکِ صلوٰۃ پر کفر تک کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں مزید تہدید یہ ہے کہ تارکِ صلوٰۃ معمولی کافروں کے ساتھ نہیں بلکہ قیامت کے دن ان کافروں کے ساتھ ہوگا جن کا کفر اس امت میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ پہلی امتوں میں فرعون اور اس کے متعلقین کفر میں ضرب المثل ہیں حتیٰ کہ قرآنِ کریم میں اس کے متعلق یہ ارشاد ہے وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ

اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ (یعنی قیامت میں فرعون اور فرعونیوں کے متعلق یہ حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت سے سخت عذاب میں جھونک دو)۔

اسی طرح اس امت میں ابی بن خلف اپنی انتہائی شقاوت میں ضرب المثل ہے۔ یہ شقی جنگِ احد میں بڑی گستاخی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتا ہوا آپؐ کی جانب بڑے ناپاک ارادے سے بڑھا چلا آرہا تھا، آپؐ کے جاں نثار صحابہ رضؓ نے یہ چاہا کہ اس نابکار کے آپ تک پہنچنے سے قبل اس کا کام تمام کردیں لیکن آپؐ نے فرمایا کہ یہ مجھ کو پکار رہا ہے اس لئے اس کو جواب میں خود ہی دوں گا۔ جب یہ شقی آپؐ کے قریب پہنچا تو آپؐ نے نیزہ لے کر اس کی طرف اشارہ فرمایا جس سے اس پر معمولی سی خراش آگئی مگر وہ اس کی تکلیف کی شدت سے چیختے چیختے بیل کی سی آواز نکالتا ہوا جہنّم داصل ہوگیا۔

حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب دو شخصوں کو ہوگا ایک وہ جو نبی کا قاتل ہو اور دوسرا وہ جو کسی نبی کے ہاتھ سے مقتول ہو۔ اس حدیث کے ماتحت اس امت میں ابی بن خلف بھی اشد العذاب میں داخل ہے جیسا کہ آیت مذکورہ میں پہلی امتوں میں سے فرعون کے متعلق تصریح گذر چکی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ان مشاہیر کفار کے ساتھ اسکا حشر ہونے کے بعد کیا وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہے گا یا اگر ایمان کا کوئی ذرہ اس میں بچ رہا ہے اور ترکِ صلوٰۃ کی عادتِ بد نے اس کو بھی ختم نہیں کیا تو اس کے متعلق اس حدیث میں کسی جانب کی صراحت نہیں آئی پھر جب حدیث خود اس کے مستقبل سے ساکت ہے تو ہم کو اس کی تفصیل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ سلف کا طریقہ اس قسم کی احادیث میں جہاں تک مجھ کو خیال ہے مصلحتاً تاویلات کرنے کا نہیں تھا، یہ دوسری بات ہے کہ جب اختلافات اور مذاہب کے بازار گرم ہوئے تو پھر اپنے اپنے ذوق کے موافق مجبوراً تفصیلات کرنی پڑیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت استاذ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو تارک صلوٰۃ ہے اس کے ساتھ مغفرت کا حق سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی عہد نہیں ہے اور اس کے مستقبل کا معاملہ مشیتِ الٰہیہ کے ماتحت رہتا ہے، مگر کھلے کافروں کی طرح اس پر دوزخی ہونے کا حکم بھی نہیں ہے، گویا کفار میں اور اس شخص میں اتنا فرق باقی رہتا ہے کہ جیسا عام کافروں پر دوزخی ہونے کا حکم لگ چکا ہے یہ حکم اس پر نہیں ہے اس لئے علماء نے تارکِ صلوٰۃ کو کھلے کافر کے حکم میں نہیں رکھا۔

(۳)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ فَاَكْثِرُوا الدُّعَاءَ

(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں جہاں پہنچ کر بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوجاتا ہے وہ اس حالت میں ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں پڑا ہوا ہوتا ہے لہٰذا یہاں پہنچ کر دعا مانگنے میں کوئی کسر اٹھا مت رکھو

شرح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات بے نیاز کا قرب تمام تر بندہ کے نیاز پر موقوف ہے اور نماز اگرچہ از اول تا آخر نیاز ہی نیاز ہے مگر جو از سر تا بقدم نیاز مندی نیاز مند ہو اس کے پاس اپنی اظہارِ نیاز مندی کے لئے اس سے زیادہ اور رکھا ہی کیا ہے کہ جو اس کا سب سے زیادہ اشرف عضو ہے وہ اپنے ربِّ بے نیاز کے سامنے خاک پر ڈال دے شاید اسی ادا کی وجہ سے اس بے نیاز کی رحمت اپنے نیاز مندوں کو اپنی بارگاہِ قرب میں داخل ہونے کا موقع دیدیتی ہے۔

بات اس سے کچھ آگے بھی ہے جس کو لکھتے بھی ڈر لگتا ہے اور نہ لکھنے میں بھی بخل معلوم

ہوتا ہے اس لئے اتنا اشارہ کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کا تعارف اپنے ملائکہ کے سامنے کرایا گیا تھا تو اس تعارف کے لئے بھی اسی سجدہ کو مقرر فرمایا تھا اور جب اپنی مخلوق میں سب سے برتر مخلوق یعنی انسان کو اپنی ذات پاک کے تعارف کرانے کی نوبت آئی پھر وہی سجدہ اس کے لئے مقرر ہوا۔

اسی لئے صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں اِذَا قَرَءَ ابْنُ اٰدَمَ السَّجْدَةَ فَسَجَدَ اِعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِيْ يَقُوْلُ يَا وَيْلَتِيْ اُمِرَ ابْنُ اٰدَمَ بِالسُّجُوْدِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ وَاُمِرْتُ بِالسُّجُوْدِ فَاَبَيْتُ فَلِيَ النَّارُ۔ (یعنی ابن آدم جب سجدہ کی آیت تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا اپنا سا منہ لے کر ایک طرف کھڑے ہو کر بڑی حسرت سے کہتا ہے کہ مجھ پر افسوس کہ ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے دوڑ کر سجدہ کر لیا اور مجھ کو سجدہ کا حکم ہوا تو میں نے انکار کر دیا) نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے لئے جنت مقدر ہو گئی اور میرے حصہ میں دوزخ آ گئی۔ اس قسم کی حدیثوں کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ بارگاہِ ربوبیت کے تعارف کے لئے سجدہ یعنی جبین نیاز کو خاک پر ڈال دینے سے بڑھ کر شاید کوئی مقبول انداز نہیں اسی لئے بعض حدیثوں میں تمانہ کی حقیقت کو سجدہ کے لفظ سے ہی تعبیر کیا گیا ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی رضؓ نے ایک خاص موقع پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنی دلی خواہش کا اظہار کر دیا اور وہ یہ کہ یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں اپنے ساتھ رکھئے گا تو کچھ وقفہ کے بعد جب آپؐ نے اس کا اصرار زیادہ دیکھا تو ارشاد فرمایا فَاَعِنِّيْ عَلٰى بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ (یعنی اگر تمہاری تمنا اتنی بلند ہے تو تم بھی سجدہ پر سجدہ کر کے اس کے لئے میری مدد کرو)۔

یہ حدیث اپنی جگہ خود تفصیل طلب ہے اور یہ مسئلہ کہ ارکانِ صلوٰۃ میں قیام افضل ہے یا سجود، یہ بحث بھی اپنے مقام پر موجود ہے۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ افضل کچھ بھی ہو لیکن قرب کہاں جا کر نصیب ہوتا ہے۔ ان مختصر الفاظ سے نہ سجدہ کی حقیقت عیاں ہوتی ہے اور نہ نماز کی اور نہ یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ تعارف کے لئے سجدہ میں خصوصیت کیا ہے لیکن اگر اس حقیقت کو واضح کیا جائے تو اردو خواں ہی نہیں متوسط طبقہ کے فہم سے بھی بالاتر بات ہوگی۔ علماء اگر شوق رکھتے ہوں تو یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ الآیہ کی تفسیر میں جو احادیث مذکور ہیں ان کا مطالعہ فرمالیں۔

ترمذی شریف میں ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ مبارکہ میں ایک یہ بھی مذکور ہے۔ اِنَّ الْبِرَّ لَیُذَرُّ عَلَی الْعَبْدِ مَا دَامَ فِیْ صَلٰوتِہٖ (یعنی جب تک بندہ اپنی نماز میں مشغول رہتا ہے اس پر نیکی اس طرح بکھیری جاتی ہے جیسے دلہن پر پھول) اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے اگرچہ سخت ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عبادات میں نماز کا رتبہ اعظم ترین ہے لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ الآیہ

ان احادیثِ بالا سے کچھ یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ نماز کیا ہے اور خدائے تعالیٰ کی رحمت نمازی پر کس طرح برستی ہے اس کی تفصیل کے لئے دفاتر اور آنکھوں سے دیکھنے کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ اتنی طویل بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک بار نیت باندھ کر بڑی آسانی سے میسر آجایا کرتی تھی۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ اِلَّذِیْ جُعِلَتِ الصَّلٰوۃُ قُرَّۃُ عَیْنِہٖ۔

(۴)

عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا قَالَتْ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاِلْتِفَاتِ فِی الصَّلٰوۃِ فَقَالَ ھُوَ اخْتِلَاسٌ یَخْتَلِسُہُ الشَّیْطَانُ مِنْ صَلَاۃِ الْعَبْدِ (متفق علیہ)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اندر اِدھر اُدھر دیکھنے کے متعلق مسئلہ پوچھا (جائز ہے یا ناجائز) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو یوں سمجھو کہ جیسے کوئی شکاری جانور کسی کا گوشت نوچ کر لے جائے اسی طرح شیطان بھی بندے کی نماز کا کوئی حصہ نوچ کر لے جاتا ہے۔

شرح: حضرت استاد علامہ انور شاہ قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ قیامت میں جب بندہ کی نماز مجسم ہو کر آئے گی تو جہاں نماز میں کسی جانب التفات کیا گیا ہے اتنا حصہ اس کی نماز کی صورت میں سے نچا ہوا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں کسی جانب التفات کرنا صرف کراہت اور دنیوی احکام پر ہی جاکر ختم نہیں ہوتا بلکہ آخرت میں نماز کی صورت پر ایک بڑے بدنما عیب کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور دنیا میں نمازی کی اس گستاخی کا اس طرح ایک اعلان بن جاتا ہے جس کو اگر دنیا میں انسان چھپا بھی دے تو آخرت میں تمام اہلِ محشر کے سامنے چھپا نہیں سکتا اور اس کی عام رسوائی ہو جائے گی۔

(۵)

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا بُنَیَّ اِیَّاكَ وَالْاِلْتِفَاتَ فِی الصَّلٰوۃِ فَاِنَّ الْاِلْتِفَاتَ فِی الصَّلٰوۃِ ھَلَکَۃٌ فَاِنْ کَانَ لَا بُدَّ فَفِی التَّطَوُّعِ لَا فِی الْفَرِیْضَۃِ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار، نماز میں کسی جانب بھی توجہ کرنے سے ڈرنا کیونکہ نماز میں اِدھر اُدھر توجہ کرنی بڑی بربادی اور

تباہی ہے اور اگر کبھی کسی ضرورت سے کرنی ہی پڑ جائے تو خیر نفلوں میں کر لینا اور فرضوں میں تو پھر بھی نہیں۔

(۶)

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِىْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ تَحُجُّ اَغْنِيَاءُ اُمَّتِىْ لِلتَّنَزُّهِ وَاَوْسَاطُهُمْ لِلتِّجَارَةِ وَقُرَّاءُ هُمْ لِلرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ وَفُقَرَاءُ هُمْ لِلْمَسْئَلَةِ (خرجہ ابو الفرج کذا فی ام القری للحافظ محب الطبری)۔

ترجمہ: انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ میری امت کے مالدار لوگ سیر و تفریح کی نیت سے حج کریں گے اور درمیانہ درجہ کے لوگ تجارت کے لئے اور قاری ریا و شہرت کے لئے اور فقیر بھیک مانگنے کے لئے۔

تشریح: مکہ مکرمہ میں اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کا بیت عظمت والا بیت ہے جس کی طرف رُخ کرنے کا تمام عالم مامور ہے اور ارضِ طیبہ یعنی مدینہ منورہ میں سب نبیوں کی مساجد میں سے آخری مسجد ہے اور خود خاتم الرسل صلوات اللہ وسلامہٗ علیہ یہاں آرام فرما ہیں، پھر غنی ہو یا متوسط طبقہ یا امت کے فقراء کسی کو یہ ہمت کیسے ہوتی ہے کہ وہ اس طرف رُخ کر کے اپنے دماغوں میں ادنیٰ سا بھی کوئی دوسرا خیال لا سکے مگر شیطان لعین نہیں مانتا اور جو تجارت سے مستغنی ہیں یعنی اغنیاء ان کی نیتوں میں سیر و تفریح کا طفلانہ تصور اور جو متوسطین ہیں ان کے دلوں میں تجارت کی خفیف ہوس اور جو غرباء ہیں ان کے خیالوں میں سوال اور بھیک کا ذلیل تصور ڈال کر رہتا ہے اور آخر ان مقاماتِ رحمت سے خائب و خاسر واپس کرنے میں اپنی کوشش کا کوئی دقیقہ

اٹھا کر نہیں رکھتا۔

جنھوں نے جہان کے غافلوں کو بیدار کیا وہ شفیقِ اعظم اپنی امت کو کیسے خبردار نہ کرتے اس لئے لازم ہے کہ اغنیاء اور متوسط اور غرباءِ امت اپنے اپنے نصیبوں سے جب اس طرف کا سفر اختیار کریں تو جنابِ قدس میں بڑے الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعائیں مانگیں کہ الٰہی اس سفر میں وہ نیت عطا فرما جو تیرے بیتِ عظیم اور تیرے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی حاضری کے شایانِ شان ہو ؎

از یکے گو وز ہمہ یکسوئے باش
یک دل ویک قبلہ ویک روئے باش

(۷)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا وَّ اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَۃِ وَسَعْیًا عَلٰی اَھْلِہٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰی جَارِہٖ لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَوَجْھُہٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ وَمَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا مُکَاثِرًا مُفَاخِرًا مُرَائِیًا لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی وَھُوَ عَلَیْہِ غَضْبَانُ

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان وابو نعیم فی الحلیۃ)۔

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دنیا طلب کی حلال اور سوال سے بچنے کے لئے اور اپنے بچوں کی مدد کے لئے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ سلوک کرنے کے لئے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملیگا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا۔ مگر جو شخص دنیا طلب کرے، اگرچہ وُہ حلال ہو، مالدار بننے کے لئے، فخر کرنے کے لئے، دکھانے کے لئے، وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا

اس حالت میں کہ اللہ تعالیٰ اس سے سخت ناراض ہوگا۔

شرح: اس حدیث میں ممدوح دنیا اور مذموم دنیا کے حدود پورے پورے طور پر واضح کر دیئے گئے ہیں اب ہر شخص یہ فیصلہ خود کر لے کہ جس دنیا کو وہ طلب کر رہا ہے وہ کس قسم کی دنیا ہے۔

(۸)

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ مِنْ اَحَدٍ یَمْشِیْ عَلَی الْمَاءِ اِلَّا ابْتَلَّتْ قَدَمَاہُ قَالُوْا لَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ کَذٰلِکَ صَاحِبُ الدُّنْیَا لَا یَسْلَمُ مِنَ الذُّنُوْبِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا کوئی ایسا شخص ہوسکتا ہے جو پانی پر چلے پھر اس کے پیر تر ہو کر نہ رہیں صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا تو کوئی شخص بھی نہیں ہوسکتا، فرمایا تو پھر یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ آدمی دنیادار ہو اور پھر گناہوں سے صاف بچ سکے۔

شرح: بات یہ ہے کہ جو دنیا شریعت کی نظر میں قابلِ تعریف ہے اس کی شرائط بالخصوص ہمارے زمانے میں پورے پورے ادا کرنا ٹھیک اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ اس حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور غالباً شاعر نے اسی حدیث کا ترجمہ اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٖ
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

اس کے باوجود شرح السنہ میں سفیان ثوریؒ جیسے زاہد اور محدث شخص اپنے زمانے

کے حالات دیکھ کر اہلِ علم کے لیے بالخصوص یہ نصیحت فرما گئے ہیں عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ قَالَ كَانَ الْمَالُ فِيمَا مَضَى يُكْرَهُ فَأَمَّا الْيَوْمَ فَهُوَ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ وَقَالَ لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ وَقَالَ مَنْ كَانَ فِيْ يَدِهٖ مِنْ هٰذِهٖ شَيْءٌ فَلْيُصْلِحْهُ فَاِنَّهٗ زَمَانٌ اِنِ احْتَاجَ كَانَ اَوَّلَ مَنْ يَبْذُلُ دِيْنَهٗ وَقَالَ الْحَلَالُ لَا يَحْتَمِلُ السَّرَفَ (رواہ فی شرح السنۃ م ص ۴۵۱) (یعنی اگرچہ پہلے زمانے میں جو لوگ مال طلب کرتے تھے وہ بادلِ ناخواستہ اپنی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے طلب کرتے تھے لیکن بات یہ ہے کہ آج جس کے پاس مال ہو وہ اس کو خوب سنبھال کر رکھے ورنہ یہ بادشاہ لوگ ہم کو رومال کی طرح ہاتھ پوچھ کر ایک کونے میں ڈال دیں گے)

حضرت سفیان ثوریؒ کے اس مقولہ میں بھی اس دینی نکتہ کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ مال کی طلب ہمیشہ مذموم نہیں بلکہ دینی حفاظت کے لئے ضروری ہے خواہ وہ خاص اپنے نفس کی حفاظت ہو یا عام طور پر علم کی حفاظت کی خاطر ہو اور حبِّ دنیا میں دینی مصالح کی رعایت شامل ہو جاتی ہے تو پھر وہی دنیا نفرت کے بجائے قابلِ طلب بن جاتی ہے۔

صاحبِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عالم کے لئے خیر خواہی کی بات تھی وہ صاف صاف بتلادی، نفع کی بھی اور نقصان کی بھی، اب آئندہ ہوگا کیا، وہی ہوگا جو تقدیر کا قلم ازل میں لکھ چکا ہے یعنی دنیا پر لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے اور صرف یہی نہیں کہ اپنے پر تر کرلیں بلکہ سرتاپا اس میں ڈوب ڈوب کر اس پر فخر کریں گے۔

(۹)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ بِہٖ إِلَی الْیَمَنِ قَالَ إِیَّاکَ وَالتَّنَعُّمَ فَإِنَّ عِبَادَ اللّٰہِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ (رواہ احمد)۔

ترجمہ : معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف روانہ کیا تو یہ نصیحت فرمائی کہ دیکھنا عیش پرستی سے بچتے رہنا کہ جو اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں وہ عیش پرست نہیں ہوتے ۔

شرح : یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیئے کہ حلال مال طلب کرنا دوسری بات ہے اور عیش پرستی بالکل دوسری بات ہے ۔ بسا اوقات آدمی مفلس ہوتا ہے اور اس میں عیش پرستی کی عادت ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی غنی ہوتا ہے مگر عیش پرست نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں عیش پرستی کے پردے میں بخل سے بچنا بھی لازم ہے یعنی انسان بخل کرتا ہے اور اس حدیث کے تحت میں لانے کے لئے اس کا نام عیش پرستی سے بچنا رکھتا ہے ۔ یہ بھی شیطان کا ایک فریب ہے اس لئے اس سے متنبہ رہنا بھی لازم ہے ؎

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(۱۰)

عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ رَضِیَ مِنَ اللّٰہِ بِالْیَسِیْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِیَ اللّٰہُ مِنْہُ بِالْقَلِیْلِ مِنَ الْعَمَلِ (رواہ احمد ص ۴۴۹)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص تھوڑے سے رزق پر اللہ سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ تھوڑے سے عمل پر اس سے راضی ہو جائے گا۔

(۱۱)

عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِثْنَتَانِ یَکْرَھُھُمَا ابْنُ اٰدَمَ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَیْرٌ لِّلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتْنَۃِ وَیَکْرَہُ قِلَّۃَ الْمَالِ وَقِلَّۃُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ۔

(رواہ احمد ص ۴۴۸)

ترجمہ: حضرت محمود بن لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو باتیں ایسی ہیں جن کو ابن آدم بُرا سمجھتا ہے۔ ایک موت ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتا ہے حالانکہ مومن کے لئے فتنے میں مبتلا ہونے سے موت بہتر ہے۔ دوسری چیز مال کی قلت ہے کہ ابن آدم اس کو بھی پسند نہیں کرتا حالانکہ مال کی قلت اس کے حساب میں سہولت کا سبب ہے۔

شرح: جہاں تک یاد آتا ہے حضرت شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ انسان کو لازم ہے کہ وہ مباحات کے دائرے سے بھی دُور رہے کیونکہ اس کا کم از کم ایک یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ اس کے حساب میں تخفیف رہیگی۔

(۱۲)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

(متفق علیہ، وہذا لفظ مسلم۔ وفی الترغیب والترہیب عن ابی ہریرۃ ج ۴ ص ۱۸۶)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ہمیشہ اپنے سے کم حیثیت والے شخص کو دیکھا کرو اور اپنے سے بڑی حیثیت والے شخص پر کبھی نظر نہ کیا کرو۔ اس طریقے سے تمہارے لئے یہ زیادہ آسان ہو جائے گا کہ جو نعمتیں اللہ کی تمہارے اوپر ہیں تم ان کی تحقیر نہ کر سکو۔ (مسلم شریف)

شرح: مگر انسان نہیں مانتا اور ہمیشہ اپنے سے زیادہ مالدار کو تکا کرتا ہے اور اپنے سے غریب شخص کی حالت پر کبھی نظر نہیں کرتا۔ آخر خدا کی ناشکری میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنا دل مفت جلایا کرتا ہے۔ کاش کہ وہ اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھتا تاکہ جو خدا کی نعمتیں اس پر ہیں اُن پر خدا تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کی توفیق نصیب ہو جاتی۔

ترمذی شریف میں اتنا اور ارشاد ہے کہ دین کے معاملہ میں ہمیشہ اس پر نظر کرنی چاہیے، جو اپنے سے بڑھ کر دیندار ہو تاکہ اس کی حرص میں اپنے دین کے اندر ترقی نصیب ہو اور اپنے سے کم شخص کو کبھی نہ دیکھنا چاہیے تاکہ اپنی عبادت کا گھمنڈ دل میں پیدا نہ ہو۔ لیکن بدنصیب انسان یہاں بھی باز نہیں آتا اور اس کے برعکس ہی عمل کیا کرتا ہے۔ دین و دنیا کی ترقی کے لئے اس سے زیادہ مختصر اور آسان کوئی نسخہ نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اب اپنے اپنے نصیب کی بات ہے جو چاہے فائدہ اٹھالے اور جو چاہے محروم رہے، واللہ الموفق۔

(۱۳)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمَنْکِبَیَّ فَقَالَ: کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ، وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَقُوْلُ اِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَآءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِکَ لِمَرَضِکَ وَمِنْ حَیَاتِکَ لِمَوْتِکَ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا دیکھو دنیا میں اس طرح بسر کرنا گویا کہ ایک مسافر ہو اور مسافر بھی وہ جو راہ طے کر رہا ہو اور ابن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب شام ہو تو صبح کی امید نہ رکھو اور جب صبح ہو جائے تو شام کی امید نہ رکھو اور اپنی تندرستی کے زمانے میں اپنے مرض کے لئے اور اپنی زندگی میں اپنی موت کے لئے اعمالِ صالحہ جمع کیا کرو۔

(۱۴)

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُہٗ اَحَبَّنِیَ اللّٰہُ وَاَحَبَّنِیَ النَّاسُ فَقَالَ: اِزْهَدْ فِی الدُّنْیَا یُحِبَّکَ اللّٰہُ وَازْهَدْ فِیْمَا عِنْدَ النَّاسِ یُحِبُّکَ النَّاسُ (حدیث حسن رواہ ابن ماجہ وغیرہ باسانید حسنۃ کذا فی الترغیب والترہیب وقد حسن بعض مشائخنا اسنادہ، جلد ۴ ص ۱۵۷)

ترجمہ: حضرت ابو العباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو کوئی ایسی بات بتا دیجئے کہ جب میں وہ کر لوں تو خدائے تعالیٰ مجھ سے محبت فرمانے لگے اور سب لوگ بھی مجھ سے محبت رکھنے لگیں۔ آپؐ نے فرمایا دنیا سے تو بے تعلق ہو جا اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے گا اور لوگوں کے مال پر تو نظر نہ کر وہ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔

شرح: سوال کتنا مشکل ہے یعنی خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوق دونوں ہی کی نظروں میں محبوب بن جانا، اور جواب کتنا مختصر اور آسان کہ خدائے تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان اگر حائل ہے تو وہ صرف دنیا کی محبت ہے جہاں یہ حجاب اٹھا بس وہیں حبِ الٰہی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسی طرح مخلوق اور اس کی محبت میں جو بات حائل ہے وہ صرف یہ خطرہ ہے کہ شاید ان کو کوئی مالی نقصان نہ پہنچے جہاں اس کا اطمینان ہوا بس جو ان کے لئے باعثِ عداوت تھا وہ ختم ہو گیا۔

(۱۵)

عَنْ زَيْدِ بْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ سَمِعْتُ مَالِكًا وَسُئِلَ اَيُّ شَيْءٍ اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قَالَ طِيْبُ الْكَسْبِ وَقَصْرُ الْاَمَلِ

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)۔

ترجمہ: زید بن الحسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا دنیا سے بے رغبت ہونے کا کیا مطلب ہے تو میں نے سنا کہ انھوں نے یہ جواب دیا کہ دنیا سے بے رغبت ہونے کا مطلب یہ ہے حلال مال کمانا اور بڑی بڑی امیدیں نہ لگانا۔

حقیقت ہے اس لئے حدیث میں یہاں دو علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

انسان کو دنیا میں دو ہی چیزیں محبوب ہوتی ہیں مال اور جان۔ تو مال کے بارے میں اس کی بے تعلقی کا عالم یہ ہو جائے کہ جو اس کے پاس ہے اور جو نہیں ہے اس کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اگر سلطنت مل جائے تو کوئی مسرت نہ ہو اور اگر کچھ باقی نہ رہے تو اس کا کوئی غم نہ رہے اور جان کے بارے میں اس کی حالت یہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے لطف اندوزی میں صحت اور مرض برابر ہو جائیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں وہ مزہ آنے لگے کہ اگر کچھ زیادہ لطف ہو تو مریض پڑے رہنے میں ہی ہو۔

بزرگوں نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ محبت ذاتیہ کی علامت یہ ہے کہ ایلام انعام سے زیادہ محبوب نظر آئے اور اس سے اونچا مقام یہ ہے کہ دونوں برابر بن جائیں اور یہ فرق ہی نظروں سے اُٹھ جائے۔ پہلے حال کے مناسب کسی نے کہا ہے ؎

کوتاہ دیدگاں ہمہ راحت طلب کنند
عاشق بلا کہ راحت او در بلا دِ تست

اور دوسرے حال کے مناسب یہ ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اَللّٰهُمَّ اَرْضِنَا بِقَضَائِكَ وَقَنِّعْنَا بِعَطَائِكَ

زید بن الحسین روایت فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ زہد اور دنیا سے بے تعلقی کیا ہے؟ انھوں نے اپنے لفظوں میں یہ جواب دیا کہ طیب الکسب و قصر الامل (یعنی حلال مال کمانا اور لمبی لمبی امیدیں نہ باندھنا) اس سے یہ بات

(۱۶)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الزَّھَادَۃُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَۃِ الْمَالِ وَلٰکِنِ الزَّھَادَۃَ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَّا تَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْکَ اَوْثَقَ بِمَا فِیْ یَدَیِ اللّٰہِ وَاَنْ تَکُوْنَ فِیْ ثَوَابِ الْمُصِیْبَۃِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِھَا اَرْغَبَ فِیْھَا لَوْ اَنَّھَا اُبْقِیَتْ لَکَ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ وقال الترمذی ہذا حدیث غریب وعمرو بن واقدی الراوی منکر الحدیث)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ زہد اور دنیا سے بے تعلقی یہ نہیں کہ خدائے تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں سے اس طرح بچنے لگو جیسا حرام سے اور اس کے دیئے ہوئے حلال کو بے جا اڑانا شروع کرو۔ زہد تو یہ ہے کہ جو مال تمہارے قبضے میں موجود ہے اور جو تمہاری ملک میں نہیں اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے اعتماد کے لحاظ سے تمہاری نظروں میں دونوں برابر نظر آئیں۔ اور زہد یہ ہے کہ جب تو کسی مرض میں مبتلا ہو تو اگر تقدیر سے وہ تیرا مرض لمبا ہو جائے تو اس مرض کے ثواب کی لالچ میں مریض پڑا رہنا تجھ کو اپنی تندرستی سے زیادہ پیارا معلوم ہو۔

شرح: یہ حدیث نہ اُن بے علم صوفیوں کے کام کی ہے جو خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کر کے اور تارک الدنیا بن کر زاہدوں کی صف میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور نہ اُن دنیادار بخیلوں کے مطلب کی ہے جو کوڑی کوڑی پر جھپٹ لگا کر اس حدیث کی آڑ لینا چاہتے ہیں بلکہ زہد ایک بہت صاف اور سیدھی حقیقت ہے جس کا ترجمہ دنیا سے بے تعلقی ہے اور یہ بے تعلقی بھی وہ نہیں جو کسی مصیبت یا غم کے نتیجے میں دل میں پیدا ہو، بلکہ یہ بے تعلقی وہ ہے کہ جو تعلق مع اللہ کا ثمرہ ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ مخفی

اور واضح ہوگئی کہ جنھوں نے اپنے آپ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنا اور رزق کی جائز تدابیر ترک کرنے کا نام زہد سمجھا ہے وہ بڑی غلط فہمی میں ہیں اور اسی طرح جو لوگ لمبی لمبی امیدیں لگا کر حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر کمانا ہی ہوشمندی اور دینداری سمجھتے ہیں وہ بھی سخت نادانی کا شکار ہیں۔

(۱۷)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَاَبِیْ خَلَّادٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَیْتُمُ الْعَبْدَ یُعْطٰی زُهْدًا فِی الدُّنْیَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ یُلَقَّی الْحِکْمَةَ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ اور ابوخلادؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی اللہ کے بندہ کو تم دیکھو کہ اس کو دنیا سے بے تعلقی اور کم گوئی کی دولت نصیب ہوگئی ہے تو اس کے پاس جا جا کر بیٹھا کرو کیونکہ اس کے دل میں حق تعالیٰ کی جانب سے حکمت اور دینی فلاح کی باتیں ڈالی جائیں گی (جن سے تمہارے قلوب روشن ہوں گے)۔

شرح: بات یہ ہے کہ دنیا سے بے تعلقی ہی خدائے تعالیٰ سے تعلق کا ثمرہ ہوتی ہے اور کم سخنی آخرت کے غم کا نتیجہ ہوتا ہے پس جس نصیب والے کو یہ دو نعمتیں نصیب ہوجائیں اس کا قلب حکمتوں کا سمندر بن جاتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمَانَ الْحِکْمَةَ اور وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ اور وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا، میں جس حکمت کا ذکر ہے اس میں بمقدار اس کے نصیب کے اس کا حصہ بھی لگ جاتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حسب ذیل حدیث سے اس حدیث کی مراد اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا زَهِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰہُ الْحِکْمَةَ فِیْ قَلْبِهٖ وَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ

وَبَصَّرَہٗ عَیبَ الدُّنْیَا وَدَاءَھَا وَدَوَاءَھَا وَاَخْرَجَہٗ مِنْھَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) (ترجمہ) حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ دنیا سے بے تعلق ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ضرور حکمت کی نعمت ڈال دیتے ہیں اور اس کی زبان سے کلماتِ حکمت نکلنے لگتے ہیں اور دنیا کے سب عیوب اس پر کھول دیتے ہیں اس کا روگ بھی اور اس سے شفا کے طریقے بھی اور دنیا کی مضرت سے اس کو بچا کر سلامتی کے وطن میں (یعنی جنت میں) لے جاتے ہیں۔

(۱۸)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّزْقَ لَیَطْلُبُ الْعَبْدَ مَا یَطْلُبُہٗ اَجَلُہٗ (رواہ ابونعیم فی الحلیۃ)۔

ترجمہ: حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کا رزق اس کے پیچھے پیچھے اس طرح لگا رہتا ہے جیسے اس کی موت اس کے پیچھے لگی رہتی ہے

شرح: تعجب ہے کہ جب یہ دونوں چیزیں اس طرح انسان کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی ہیں تو پھر اس کو اپنی موت کی طرح اپنے رزق کا یقین کیوں نہیں ہوتا۔ کون ہے جو اپنی موت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہو مگر آدمی ہے کہ اپنے رزق کی تلاش میں دَر دَر بھیک مانگتا پھرتا ہے کاش اس کو اس کا یقین ہوجاتا تو وہ اپنے رزق کو بھی اپنی موت کی طرح یقینی سمجھتا، اسباب اختیار کرتا مگر اطمینان کے ساتھ اور اگر کامیاب نہ ہوتا تو انتظار کرتا صبر کے ساتھ۔ مگر یہاں حالت یہ ہے کہ موت سے بھاگتا ہے جو اس کو چھوڑنے والی نہیں اور اپنے مقدر سے زیادہ رزق کا طالب ہے جو اس کے ہاتھ آنے والا نہیں۔

(۱۹)

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَیُنْسَأَ لَہٗ فِیْ اَثَرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَہٗ

(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق میں وسعت ہو اور عمر میں برکت، اس کو چاہیے کہ اپنے قرابتداروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

(۲۰)

عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یُّشَارَ اِلَیْہِ بِالْاَصَابِعِ فِیْ دِیْنٍ اَوْ دُنْیَا اِلَّا مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے فتنے میں پڑنے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اس کی طرف لوگوں کی انگلیاں اٹھنے لگیں اس کی دنیا کے متعلق ہو یا اس کے دین کے، مگر وہ شخص جس کو اللہ ہی بچالے۔

شرح: حدیث مذکور یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی اس اعتدال کے ساتھ گذارنی چاہیئے کہ بے سبب نہ غریب مشہور ہو نہ امیر، اسی طرح نہ بخیل کہلائے اور نہ مسرف اور یہی طریقہ دین میں اختیار کرنا لازم ہے کہ جہاں تک ہو سکے یہ سعی کرے کہ نہ فاسق مشہور ہو اور نہ بزرگ۔ اگر یہ کرے گا تو دنیا سے اپنے دین اور آبرو کو بچا کر لے جائے گا ورنہ حاسدوں کے حسد اور شیاطین کے فتنہ میں پھنس کر رہے گا۔

ہاں! یہ بات دوسری ہے کہ اگر مشیّتِ الٰہیہ پردۂ گمنامی سے خود کسی کو نکال کر مقامِ شہرت پر کھڑا کر دے تو پھر وہی اس کی محافظ بھی ہوگی، مگر انسان کے اپنے فرض کی بات یہ ہے کہ وہ تا امکان اسبابِ شہرت سے احتراز کرے اور زاویۂ گمنامی میں پڑ کر زندگی گزار دے۔ رہا یہ فیصلہ کہ یہ شہرت اپنی سعی کا نتیجہ ہے یا قبولیتِ ربّانی کا تو اگر پہلو میں دل ہے تو انسان خود ہی اس کا فیصلہ کر لے گا ورنہ فردائے محشر ہے کس لئے یعنی اس لئے کہ جو یہاں آج تاریکی میں ہے وہ کل روشنی میں نظر آجائے۔

(۲۱)

عَنْ عَائِشَۃَ رضؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا عَائِشَۃُ اِیَّاکِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَہَا مِنَ اللّٰہِ طَالِبًا (رواہ ابن ماجۃ والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ رضؓ دیکھو معمولی معمولی گناہوں سے بہت خبردار رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے ان پر بھی باز پرس کرنے والا مقرر ہے۔

(۲۲)

عَنْ اَنَسٍ رضؓ قَالَ اِنَّکُمْ لَتَعْمَلُوْنَ اَعْمَالًا ھِیَ اَدَقُّ فِیْ اَعْیُنِکُمْ مِنَ الشَّعْرِ وَکُنَّا نَعُدُّھَا عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ یَعْنِی الْمُھْلِکَاتِ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم لوگ ایسے کام کرتے ہو کہ تمہاری نظروں میں تو وہ بال سے زیادہ باریک ہوتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم اُن کو

اپنی تباہی کے اعمال سمجھا کرتے تھے۔

(۲۳)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِیْہِمَا کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّۃُ وَالْفَرَاغُ۔

(رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جس سے اکثر لوگ ٹوٹے میں رہتے ہیں ایک تندرستی اور دوسری فرصت (روایت کیا اس کو بخاری نے)۔

(۲۴)

عَنِ الْعُرْسِ بْنِ عُمَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عُمِلَتِ الْخَطِیْئَۃُ فِی الْاَرْضِ مَنْ شَہِدَھَا فَکَرِھَھَا کَانَ کَمَنْ غَابَ عَنْھَا وَمَنْ غَابَ عَنْھَا فَرَضِیَھَا کَانَ کَمَنْ شَہِدَھَا۔

(رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: عرس بن عمیرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی گناہ کی بات جب زمین کے کسی حصہ پر کی جاتی ہے تو جو شخص وہاں موجود ہو اگر وہ اس کو دل سے برا سمجھتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو وہاں موجود نہیں اور اگر وہ اس کو دل سے پسند کرتا ہے تو وہ شخص اس کے برابر ہے جو اس میں شریک ہے اگرچہ وہاں موجود نہ ہو۔

(۲۵)

عَنْ مُعَاوِیَۃَ اِلٰی عَائِشَۃَ اَنِ اکْتُبِیْ اِلَیَّ کِتَابًا تُوْصِیْنِیْ فِیْہِ

وَلَا تُکْثِرِیْ فَکَتَبَتْ سَلَامٌ عَلَیْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنِ الْتَمَسَ رِضَی اللّٰہِ بِسَخَطِ النَّاسِ کَفَاہُ اللّٰہُ مُؤْنَۃَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَی النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰہِ وَکَلَہُ اللّٰہُ اِلَی النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ آپ مجھ کو کوئی نصیحت لکھ کر بھیجدیں جو مختصر ہو اور زیادہ طویل نہ ہو۔ انھوں نے سلام مسنون کے بعد یہ کلمات لکھ کر بھیج دیئے: "حمد و صلوٰۃ کے بعد میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش میں لوگوں کی ناراضگی سے بے غم ہو کر لگا رہا اللہ تعالیٰ لوگوں کی خوشنودی کی فکر سے اس کو بے غم فرمادے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ناخوشی سے بے فکر ہو کر لوگوں کی خوشی میں پڑا رہا اللہ تعالےٰ اس کو لوگوں کے حوالہ کر دے گا اور پھر وہ اس سے کبھی خوش نہ ہوں گے۔ والسلام"

شرح: اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ان دو کلموں کو لکھ کر وہ سب کچھ لکھ دیا جو کسی حاکم کے لئے بڑے بڑے دفتروں میں لکھا جا سکتا تھا اور ایسی بیش بہا نصیحت کا انتخاب فرمایا جو صرف حاکموں کے لئے نہیں محکوموں کے لئے بھی ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اگر ایک حاکم اس پر عمل کرے تو اس کی سب رعایا اس پر جان قربان کرنے لگے، اگر ایک دکان کا مالک اس کو یاد رکھے تو اس کے سب ملازم اس سے خوش رہیں اور اگر ایک گھر کا مالک اس کو یاد رکھے تو اس کے سارے گھر والے اس سے راضی رہیں۔

یہاں گُر کی بات یہ ہے کہ جب رب راضی ہو جائے تو سب جہان راضی ہو جاتا ہے اور اگر العیاذ باللہ وہ ناراض ہو جائے تو انسانوں سے لے کر حیوانات تک کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے امیر معاویہؓ کو اس

حَتّٰى اجْتَازَ الْوَادِيَ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر سے گزرے تو ارشاد فرمایا کہ ظالموں کی اس بستی سے اس طرح گزرو کہ خوف کے مارے تمہاری آنکھیں آنسو بہا رہی ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو عذاب ان کو پہونچ رہا ہے اس کی لپیٹ میں تم بھی آجاؤ، یہ فرما کر اپنا سر مبارک ڈھانکا اور جھکایا اور تیزی کے ساتھ اس وادی سے نکل گئے۔

شرح: حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ جو مقاماتِ عذاب ہوں جیسے مقابرِ کفار اور ان کی عبادت گاہیں، ان میں داخل ہونے سے تا امکان پرہیز کرنا چاہیئے اور اگر بمجبوری کبھی داخل ہونا پڑے تو ہمہ تن خوف و خشیت بن کر جلد سے جلد وہاں سے نکل آنا چاہیئے، ہنسنا اور باتیں بنانا تو مقابرِ مسلمین میں بھی مسلمان کا کام نہیں، جو جگہ عبرت کی ہو وہاں غفلت بڑی بدنصیبی ہے۔

(۲۷)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُّنْجِیَاتٌ وَّ ثَلٰثٌ مُّهْلِکَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَی اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضَا وَ السَّخَطِ وَالْقَصْدُ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ وَالْمُهْلِکَاتُ فَهَوًی مُّتَّبَعٌ وَّ شُحٌّ مُّطَاعٌ وَّاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِیَ اَشَدُّهُنَّ۔

(روی البیہقی الاحادیث الخمسۃ فی شعب الایمان)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین باتیں ایسی ہیں جو آدمی کو نجات دلانے والی ہیں اور تین باتیں ایسی ہیں جو ہلاک کر ڈالنے والی ہیں۔ جو چیزیں نجات دینے والی ہیں وہ کھلے اور چھپے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور سچی بات کہنا خوشی کی حالت میں بھی اور غصہ کی

اہم نکتہ کی طرف متوجہ فرمایا تھا کہ حاکم کبھی کبھی اپنی رعایا کی رضا کی خاطر خود اپنے حاکم کی رضا کو فراموش کر دیتا ہے اور ایسے فیصلے کر گزرتا ہے جس میں اپنے مولائے حقیقی کی رضا مندی کا خیال عمداً یا خطاءً نہیں رہتا۔

کسی اور انسان کا تو ذکر کیا ہے حق تعالیٰ نے جب حضرت داؤد علیٰ نبینا و علیہ الصلاۃ والسلام کو تاجِ خلافت بخشا تو اس کے ساتھ ساتھ اسی عظیم خطرے سے ان کو بھی خبردار فرمایا یَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (یعنی اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں خلیفہ بنایا سو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کرنا اور اپنی خواہش پر نہ چلنا کہیں وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دے)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہشاتِ نفسانی کی اتباع کرنے کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہدایت کے صحیح راستے سے بھٹکا کر رہتی ہے اور جب ہدایت کا صحیح راستہ گم ہو جائے تو حاکم ہو یا محکوم بڑا ہو یا چھوٹا اس کا ٹھکانا کہاں۔ اس لئے صرف حاکموں کے لئے نہیں بلکہ ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ہر ہر معاملہ میں رضائے الٰہی کا خیال مقدم رکھے دنیا اُس سے خواہ راضی ہو یا ناراض ؎

یا الٰہی تو نہ چھوٹے تیرا چھٹنا ہے غضب
یہ مجھے منظور ہے سارا زمانہ چھوڑ دے

(۲۶)

عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا مَرَّ بِالْحِجْرِ قَالَ لَا تَدْخُلُوْا مَسَاكِنَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مَا اَصَابَهُمْ ثُمَّ قَنَّعَ رَاْسَهٗ وَاَسْرَعَ السَّيْرَ

کی حالت میں بھی اور میانہ روی، فراغت میں بھی اور تنگ دستی میں بھی۔ جو چیزیں ہلاک کرنیوالی ہیں وہ ہیں خواہشاتِ نفسانی جن کے پیچھے لگا رہے اور ایسا بخل جس کے تقاضوں پر چلتا رہے اور آدمی کی اپنے نفس میں خود بینی۔ اور یہ تیسری چیز آدمی کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہے۔

(۲۸)

عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَا اَيُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِيْ نَفْسِهٖ صَغِيْرٌ وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ عَظِيْمٌ وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيْرٌ وَفِيْ نَفْسِهٖ كَبِيْرٌ حَتّٰى لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِيْرٍ۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا کہ لوگو! تواضع کی عادت ڈالو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سُنا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو معزز بنا دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی نظروں میں تو چھوٹا رہے گا لیکن لوگوں کی نظروں میں بڑا شمار ہوگا اور جو شخص بڑا بنے گا اور تکبر اختیار کرے گا اللہ تعالےٰ اس کو ذلیل کر دے گا پھر وہ اپنے خیال میں تو بڑا ہوگا مگر لوگوں کی نظروں میں ذلیل رہے گا اور ایسا ذلیل رہے گا کہ ان کے نزدیک وہ کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوگا۔

(۲۹)

عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ

ترجمہ: بہز بن حکیم روایت کرتے ہیں اپنے باپ سے، وہ روایت کرتے ہیں اپنے دادا سے اور اُن کے دادا روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ غصہ ایمان کا مزا اس طرح بگاڑ دیتا ہے جیسے ایلوا (ایک سخت کڑوی دوا ہے) شہد کا۔

شرح: شہد کی مٹھاس دنیا جانتی ہے لیکن یہ بات صرف انبیاء علیہم السلام بتاتے ہیں کہ ایمان بھی مٹھاس رکھتا ہے اور شہد سے کہیں زیادہ مٹھاس رکھتا ہے شہد کھانے والے شہد چھوڑ سکتے ہیں لیکن جو ایمان کا مزہ چکھ لیتا ہے وہ ایمان کو کسی قیمت پر چھوڑ نہیں سکتا بلکہ اس کا چھوڑنا اس کے نزدیک جل کر خاک ہو جانے سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ اب سوچئے کہ اس کو کون جان سکتا ہے کہ جو چیز اتنی میٹھی ہو اس کا مزہ خراب بھی ہو سکتا ہے اور جس چیز سے خراب ہو جاتا ہے وہ چیز کیا ہے یہ بات صرف انبیاء علیہم السلام بتاتے ہیں کہ ایمان کی مٹھاس ذرا سی بات سے خراب بھی ہو جاتی ہے یعنی غصہ سے۔

عام آدمی صرف غصہ کی کڑواہٹ سے واقف ہے اسی لئے جو آدمی زیادہ غصہ والا ہوتا ہے اس کو کڑوے مزاج کا آدمی کہتے ہیں۔ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ غصہ صرف زبان کو کڑوا نہیں کرتا بلکہ ایمان کو بھی کڑوا کر دیتا ہے۔ یہاں غصہ سے مراد وہ غصہ ہے جو اپنی خواہشِ نفس کے لئے ہو، رہا وہ غصہ جو دین اور شریعت کی خاطر ہو وہ حلاوتِ ایمانی کا تقاضا ہے اور اس کی حلاوت کو اور دونا اور زیادہ کرتا ہے۔

عالم میں آج الحمد للہ کہ مومنوں کی تعداد بہت ہے لیکن وہ کم ہیں جنھوں نے اپنے ایمان کی مٹھاس بھی چکھی ہو جس کا تذکرہ اس حدیث میں ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اس مٹھاس کو چکھ لیا ہو اور پھر اس کو غصہ کی تلخی سے بچائے رکھا ہو اُن کی تعداد اور بھی کم ہے ؎

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں آتی ہو لذت ۔ اور یوں تو آپ کی شمشیر کے گھائل بہت ہیں

(۳۰)

عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَیَاءَ وَ الْاِیْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُھُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ وَفِیْ رِوَایَۃِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُھُمَا تَبِعَہُ الْاٰخَرُ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور ایمان دو رفیقوں کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں، جب ان میں سے ایک اُٹھا لیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ دوسرا بھی خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔

(۳۱)

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَؓ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَ الْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نیکی اور گناہ کی تعریف کیا ہے، ارشاد فرمایا، نیکی یہ ہے کہ اخلاق عمدہ ہوں اور گناہ کی بات یہ ہے کہ جو تیرے دل میں خود بخود کھٹکے اور تجھ کو یہ پسند نہ ہو کہ لوگوں کو اسکی خبر ہو (رواہ مسلم)

(۳۲)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰى اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ (رواہ البخاری)۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو باتیں لوگوں کو پہلی نبوتوں کے بقیہ میں سے مل گئی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ جب تم میں غیرت نہ رہے تو جو دل چاہے کرو۔

(۳۳)

عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِقْتِصَادُ فِی النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَالتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ وَحُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ (رواہ البیہقی الاحادیث الاربعۃ فی شعب الایمان)۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنا یہ آدھی معیشت ہے اور لوگوں کے ساتھ محبت سے رہنا یہ نصف ہوشیاری ہے اور سلیقہ کا سوال کرنا، یہ نصف علم ہے۔

(۳۴)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا ذَرٍّ لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ وَلَا وَرَعَ كَالْكَفِّ وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوذرؓ انجام بینی اور حسنِ تدبیر سے زیادہ عقل کی کوئی بات نہیں اور گناہوں سے بچنے سے بڑھ کر کوئی تقویٰ نہیں

اور حسنِ اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز شرافت کی نہیں۔

(۳۵)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاحَلِیْمَ اِلَّا ذُوْعَثْرَۃٍ وَلَاحَکِیْمَ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَۃٍ (رواہ احمد والترمذی وقال ہذا حدیث حسن غریب)۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جب تک خود لغزش میں مبتلا نہیں ہوتا حلیم نہیں بنتا اور جب تک تجربہ نہ ہو اس وقت تک حکیم نہیں بنتا۔

(۳۶)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَرَّتَیْنِ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دو مرتبہ کاٹا نہیں جاتا۔

(۳۷)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَۃِ الصِّیَامِ وَالصَّدَقَۃِ وَالصَّلٰوۃِ قَالَ قُلْنَا بَلٰی قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ ھِیَ الْحَالِقَۃُ (رواہ ابوداؤد والترمذی، وقال ہذا حدیث صحیح)

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتا دوں جو نماز، روزے اور صدقے سے بھی زیادہ بہتر ہو۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور فرمائیے آپؐ نے فرمایا کہ باہمی صلح کرانی اور باہمی لڑائی کرانی تو دین کو مونڈ دینے والی ہے۔

(۳۸ الف)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ (رواہ احمد وابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ بات کرنا بند کر دے اگر کسی نے ایسا کیا اور اتفاقاً موت آگئی، تو دوزخ میں جائے گا۔

(۳۸ ب)

عَنْ عَائِشَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّهْجُرَ مُسْلِمًا فَوْقَ ثَلٰثَةٍ فَاِذَا لَقِیَهٗ سَلَّمَ عَلَیْهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ کُلَّ ذٰلِكَ لَا یَرُدُّ عَلَیْهِ فَقَدْ بَاءَ بِاِثْمِهٖ (رواہ ابوداؤد)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو کسی مسلمان کے ساتھ تین دن سے زیادہ بات چیت بند کرنا درست نہیں ہے اس کو چاہیے کہ جب اس سے ملاقات کرے تو اس کو خود سلام کرے تین مرتبہ اگر وہ ہر مرتبہ اس کے سلام کا جواب نہ دے تو پھر اس کا گناہ اس کے سر رہے گا۔

(۳۹)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلًا شَکَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِہٖ قَالَ امْسَحْ رَاْسَ الْیَتِیْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ (رواہ احمد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دل کے سختی کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا کہ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو (دل نرم ہوجائے گا) اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کرو۔

(۴۰)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ الْحَدِیْثَ بِطُوْلِہٖ اِلٰی اَنْ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَوْصِنِیْ قَالَ اُوْصِیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ اَزْیَنُ لِاَمْرِکَ کُلِّہٖ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَیْکَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ وَذِکْرِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّہٗ ذِکْرٌ لَّکَ فِی السَّمَاءِ وَنُوْرٌ لَّکَ فِی الْاَرْضِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَیْکَ الصَّمْتَ فَاِنَّہٗ مَطْرَدَةٌ لِلشَّیْطَانِ وَعَوْنٌ لَّکَ عَلٰی اَمْرِ دِیْنِکَ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ اِیَّاکَ وَکَثْرَةَ الضِّحْکِ فَاِنَّہٗ یُمِیْتُ الْقَلْبَ وَیَذْھَبُ بِنُوْرِ الْوَجْہِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لَا تَخَفْ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لِیَحْجُزْکَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُ مِنْ نَفْسِکَ۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا پھر ایک طویل حدیث ذکر کرتے ہوئے اس گفتگو تک پہنچے کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے، آپؐ نے فرمایا میں تم کو خدا سے ڈرتے رہنے کی نصیحت کرتا ہوں،

یہ تمہارے دین کی زینت ہو گا۔

میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اور بھی ارشاد ہو آپؐ نے فرمایا کہ تلاوتِ قرآنِ پاک اور ذکر اللہ ہمیشہ کرتے رہنا، اس عادت سے تمہارا ذکر آسمان پر رہے گا اور زمین پر تمہارے لئے نور ہو گا۔

میں نے کچھ اور نصیحت فرمانے کی عرضداشت پیش کی تو فرمایا خاموش رہنے کی عادت ڈال لو تاکہ شیطان تمہارے پاس پھٹک ہی نہ سکے اور تمہارے تمام دینی معاملات میں مدد اور سہولت کا سبب ہو۔

میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی سیری نہیں ہوئی، فرمایا قہقہہ لگانے سے دور رہنا کیونکہ اس عادتِ بد سے دل مردہ ہو جاتا ہے اور چہرہ کا نور جاتا رہتا ہے۔

میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اور ارشاد ہو ابھی دل نہیں بھرا، فرمایا حق بات کہنا خواہ کتنی ہی تلخ ہو۔

میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اور عطا فرمایئے، فرمایا دین کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کرنا۔

میں نے عرض کی ابھی حرص باقی ہے فرمایا اچھا تو جو عیب اپنے نفس میں دیکھو لوگوں پر اس کی وجہ سے نکتہ چینی نہ کرنا۔

شرح: یہاں سائل کی حرص کی حد نہیں مگر آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی کی بھی کوئی نہایت نہ رہی۔ سوالات و جوابات کا یہ سلسلہ جاری رہا آخرکار سائل ہی تھک کر شرما گیا اور سب سے مشفق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا دریا اور دونا جوش مارتا رہا ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی!

سائل تھا کہ ذرا سا کلمہ کہہ کر خاموش ہوجاتا تھا اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ دُرِ بے بہا لٹائے جارہے تھے۔ ہر جواب ایسا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ ساری عمر بسر کرنے کے لیے یہی کافی ہے لیکن اللہ رے علم کی حرص کہ سائل پھر پیاسا کا پیاسا نظر آتا تھا، ادھر جوابات کی یہ جامعیت و رفعت کہ ایک ایک جواب لعل وجواہرات کو شرمندہ کرے اور اپنی جامعیت میں گویا کمال وتکمیل کا ضامن نظر آتا تھا مگر جب دہنِ مبارک سے دوسری پُرحکمت نصیحت نکلتی تھی تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ دونوں میں اعلیٰ وارفع کونسی ہے۔

علم کا یہ بے پناہ تموج اور حِکَم واسرار کے یہ بے کراں خزائن دیکھ کر سائل متحیر بھی تھا اور کوشش کرتا تھا کہ بس کرے مگر بے اختیار سوال پر سوال کرنے پر مجبور رہتا تھا آخر ادب واحترام نے روک دیا اور دل میں نہ معلوم کتنے سوالات کی حسرت وارمان لے کر یہ زاہدِ اُمت خاموش ہوگیا۔ اب اُمت کے سامنے صرف ایک صفحہ میں اور ایک ہی جگہ قیمتی سے قیمتی موتی بکھرے پڑے ہیں۔ ہے کوئی نصیب والا جو بے مشقت ان کو لُوٹ لے، اگر حدیث میں مذکورہ سوالات وجوابات کی تشریح کی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے اس لئے عنانِ قلم کو اس سے روک لینا ہی مناسب ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ. وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ه وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ه

فہرست مضامین جواہر الحکم حصہ دوم

جواہر الحکم حصہ دوم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا

شرعی منظر میں دنیا کا رشتۂ حیات عنقریب ٹوٹنے والا ہے اس لئے عملی سرگرمی اور جدوجہد کا قدم تیز سے تیز کر دینا چاہیئے

(۱) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ ھٰذِہٖ الدُّنْیَا مَثَلُ ثَوْبٍ شُقَّ مِنْ اَوَّلِہٖ اِلٰی اٰخِرِہٖ فَبَقِیَ مُتَعَلِّقًا بِخَیْطٍ فِیْ اٰخِرِہٖ فَیُوْشِکُ ذٰلِکَ الْخَیْطُ اَنْ یَّنْقَطِعَ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۴۰)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بقیہ دنیا کی عمر کی مثال اب ایسی ہے جیسی اس کپڑے کی جو اوّل سے آخر تک پھاڑ دیا گیا ہو اور صرف اس کا ذرا سا تار لگا رہ جائے جو اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا۔

شرح: یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا ایک نظام کے تحت بنی تھی اور ایک نظام کے تحت ہی ختم ہو گی، اس کی فطرت میں تدریج لکھی گئی تھی، وہ پیدا ہوئی تو فوراً جوان نہ تھی پھر جب جوان ہوئی تو فوراً اس کو بڑھاپا نہیں آیا اور جب اس کو بڑھاپا آیا تو اسی تدریج کے ساتھ اس کو موت آئے گی۔ جو دنیا کے دورِ طفولیت میں تھے ان کو دنیا کے عالمِ شباب کی رعنائیوں کی کیا خبر تھی اور جو آج اس کی ترقیات کی سرعت دیکھ کر اس کی سدابہار امید لگائے بیٹھے ہیں وہ کیا جانیں کہ بہار کہاں، اب اس کی خزاں کا وقت بہت نزدیک آچکا ہے۔

نافہم اس کی موت میں خواہ کتنی ہی تاخیر سمجھیں لیکن جس کے دربار میں دنیا کے ہزار سال ایک دن کے برابر ہوں وہ اپنے رسولِ پاکؐ صدوق وامین کی زبان سے یہ اعلان کرا چکا ہے کہ دنیا اب پیری سے گذر کر موت کے قریب آ لگی ہے: وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ

كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ط۔ (اور ایک دن تیرے رب کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے) (پارہ ۱۷، رکوع ۱۳) اور جب کہ دنیا ہی کا وقت ختم ہو چکا ہو تو پھر اب سلسلۂ پیغمبری باقی رہے تو کس کے لئے باقی رہے، اس لئے آپؐ نے اپنی نبوت اور دنیا دونوں کی خاتمیت کا اعلان ساتھ ہی فرما دیا ہے جو فلسفۂ ارتقاء کے قائل ہیں وہ اس کی درازی کے جتنے چاہے خواب دیکھیں لیکن جو نظامِ حیات کے ماہر ہیں وہ خوب جان رہے ہیں کہ آج دنیا پر جوانی چڑھ رہی ہے یا اس پر موت کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اس لئے فرصت کو غنیمت جانئے اور کاہلی چھوڑ کر اپنے دین اور اپنی دنیا کے لئے جو کرنا ہے وہ کل کے بجائے آج ہی کر ڈالئے ؎

من نمی گویم زیاں کش یا بہ بندِ ہوش باش
اے زفرصت بے خبر در آنچہ باشی زود باش

گذشتہ مخلصین اور باقی ماندہ لوگوں کی مثال شرعی منظر میں

(۲) عَنْ مِرْدَاسٍ الْاَسْلَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْهَبُ الصَّالِحُوْنَ الْاَوَّلُ فَالْاَوَّلُ وَتَبْقَى حُفَالَةٌ كَحُفَالَةِ الشَّعِيْرِ اَوِ التَّمْرِ لَا يُبَالِيْهِمُ اللّٰهُ بَالَةً۔ (رواہ البخاری مشکوٰۃ ص ۴۵۸)

ترجمہ: مرداس اسلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیک لوگ ایک ایک کرکے اٹھتے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ ایسے لوگ باقی رہ جائیں گے جو ان کی نسبت سے ایسے ہوں گے جیسے جَو کی بھوسی یا ردّی کھجوروں کے چھلکے، جن کی اللہ کی ذات پاک کو کوئی پروا نہ ہو گی۔

تشریح: ۔ جب کہ تنزّل کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہو تو اندازہ فرمالیجئے کہ ان گذشتہ اور باقی ماندہ لوگوں کی ایسی نسبت کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ سوچیں کہ آج تیرہ سو سال کے بعد ہماری نسبت صحابۂ کرامؓ کے ساتھ کیا ہو گی تو کوئی ہے جو اس کا اندازہ لگا سکے؟ مجھ کو اپنے بعض

اکابر کا مقولہ پہنچا ہے کہ وہ فرماتے تھے اگر سلف آج موجود ہوتے تو وہ ہم کو کافر اور ہم ان کو مذہبی دیوانہ سمجھتے۔ دنیوی ترقیات کی سرعت کا اندازہ تو صرف اس ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جو سفرِ حج پہلے مہینوں میں طے ہوتا تھا وہ ترقی کرتے کرتے آج چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے یعنی ایسے ہوائی جہاز عام طور پر استعمال میں آرہے ہیں جو آواز کی رفتار سے تیز ہیں لیکن کوئی ایسا بھی ہے جو دینی تنزل کی سرعت کا کسی گوشہ میں بیٹھ کر اندازہ لگا سکا ہو کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں۔ حاکم سے محکوم اور محکوموں میں بھی ہمارا درجہ کیا ہے؟ صرف یہ بحث نہیں ہے بلکہ غور یہ کرنا ہے کہ ہمارا اسلام پہلے کیا تھا اور آج ہمارے پاس اسلام کا کتنا حصہ باقی ہے۔

آیئے اس کا جواب خود ایک صحابیؓ کی زبانی آپ کو سنا دوں، جس کے بعد آپ خود اس کا اندازہ فرما سکیں گے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ ایک دن غصہ میں بھرے ہوئے اپنے گھر تشریف لائے تو ان کی اہلیہ نے پوچھا آج آپ کے اتنے غصہ کا سبب کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا خدا کی قسم میں عہدِ نبوت کی کوئی بات اب نہیں دیکھتا سوائے اس کے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر نماز پڑھ لیتے ہیں اور بس بقیہ امور میں بہت کچھ تغیر و تبدل محسوس کرتا ہوں (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۹۰) حضرت ابوالدرداءؓ کے ان کلمات کو سمجھنے کے لئے وہی دینی منظر چاہیئے جو ان کو عطا ہوئی تھی۔

یہ بیان اس دور کا ہے جس میں صحابۂ کرامؓ موجود تھے، اب اس سے اندازہ فرمالیجئے کہ ہمارے دور میں اگر ابوالدرداءؓ موجود ہوتے تو ہماری حالت پر وہ کیا تبصرہ فرماتے۔ ہم میں کتنے ہیں جو نمازی ہیں اور جو نمازی ہیں وہ کس طرح نماز ادا کرتے ہیں، وقت، سنن و آداب اور جماعت کا ان کو کتنا خیال ہے، پھر یہ بھی صرف عادتاً ہے یا عبادتِ الٰہی کی نیت سے، اس میں خشوع و خضوع اور اخلاص کی کتنی روح ہے؟ یہ سوالات ایک طرف ہیں اس کے بعد اب دین کے دوسرے شعبوں پر نظر ڈالئے تو زبان سے بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

نکلے گا۔

ان سب سوالات سے پہلے سوال ایمان و ایقان کا ہے یعنی ہمارے دل میں خدا کی وحدانیت اور اس کے رسولوں کی رسالت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت، حشر و نشر، عذاب قبر اور حساب و کتاب کی کتنی اہمیت باقی رہ گئی ہے اور ان پر یقین کا عالم ہے کیا، صرف اتنا ہی نہیں کہ ان قطعیات پر یقین صرف خیالات کے درجہ میں باقی رہ گیا ہے بلکہ ان کی تاویلات اور اس سے بڑھ کر ان کا تمسخر اڑانا کیا یہ ہماری محفلوں کا ایک عام مشغلہ بنا ہوا نہیں ہے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔

حقیقت یہ ہے کہ جتنی سرعت سے ان میدانوں میں ہم نے ترقی کی تھی ضرور تھا کہ ہمارے تنزل کی رفتار بھی اتنی ہی تیز ہوتی کیونکہ جو جتنی بلندی سے گرتا ہے وہ اتنے ہی نیچے دور تیزی سے گرتا ہے۔ سُوْرَۂ وَالتِّیْن میں پہلے بہت تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا تھا لیکن وہ اپنے اعمال کی بدولت جب گرا تو اسفل السافلین میں جا پہنچا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (مگر جو یقین لاتے اور عمل کئے اچھے) (سورۂ والتین پارہ ۳۰) یعنی جو اس سے بچے وہ لوگ وہی تھے جو ایمان پر قائم رہ کر نیک عمل کرتے رہے اگرچہ ان دونوں صفتوں میں بھی اول امت سے ہم کو کیا مناسبت؟ تاہم ان کی بدولت طبقۂ اسفل السافلین میں پہنچنے سے ان صفات کے حاملین اب بھی بچے ہوتے ہیں۔

ہر چیز کی بقاء اس کی روح پر موقوف ہے

(۳) وَعَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی لَا یُقَالُ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

(رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ شریف ۴۸۰)

ترجمہ: انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت

اس وقت نہیں آسکتی جب تک کہ دنیا میں ایک شخص بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی ہے۔

تشریح: جس طرح انسان کی حیات اور بقاء اس کی روح پر موقوف ہے ادھر اس کے قالب سے روح نے پرواز کی ادھر انسان ختم ہوا۔ اسی طرح اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم کی روح اللہ اللہ کا اسم پاک ہے، جب تک یہ نام پاک باقی ہے دنیا باقی ہے یہ نام دنیا سے ختم ہوا بس سمجھو کہ اسی دن عالم بھی ختم ہوا۔ اسی کا نام قیامت ہے مگر مشہور ہے:۔

"چوں قضا آید طبیب ابلہ شود"

اس لئے اب الٹا لوگوں کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ جب تک دنیا میں یہ اللہ اللہ کہنے والے باقی ہیں اسوقت تک ہم ترقی سے محروم ہیں اس لئے ان ہی کو ایک ایک کرکے ختم کرنا چاہیئے تاکہ ہم ترقی کرسکیں بیشک جب قیامت آنی یقینی ہے تو قلوب میں ان جذبات کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے۔

سخت افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ حدیث تو اللہ تعالےٰ کے صرف اسم پاک کو بقائے عالم کا باعث قرار دیتی ہے اور ادھر کچھ نافہم لوگ ایسے بھی ہیں جن کو صرف اسم پاک کے ذکر کے ثبوت ہی سے انکار ہے وہ صحیح مسلم کی اس حدیث کو سامنے رکھیں اور دوسری حدیث:۔ "وَلَا یُوْزَنُ مَعَ اسْمِ اللّٰہِ شَیْءٌ" پر بھی غور کریں جب شیطان کسی کو عمل خیر سے محروم کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں اسی قسم کے واہیات وساوس پیدا کرتا ہے۔ پھر وہ خود بھی عمل خیر سے محروم رہتا ہے اور دوسروں کو بھی محروم کرنے کی سعی کرتا ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا اور ہے انسان سب چیزوں سے زیادہ جھگڑالو (پارہ ۱۵ رکوع ۲۰) لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف اللہ اللہ کا ذکر ہونا بھی حدیث سے ثابت ہے۔

سلف کی نظروں میں خیر القرون کی قدر و منزلت، ترقی کرنے کے لئے تقدم کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تأخر کی بھی ضرورت ہے

(۴) وَعَنِ ابْنِ الْمُسَيَّبِؓ قَالَ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الْاُوْلٰى يَعْنِىْ مَقْتَلَ عُثْمَانَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ بَدْرٍ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّانِيَةُ يَعْنِى الْحَرَّةَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ الْحُدَيْبِيَةِ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّالِثَةُ فَلَمْ تَرْتَفِعْ وَبِالنَّاسِ طَبَاخٌ (رواہ البخاری مشکوٰۃ ص ۴۶۵)

ترجمہ: ابن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں پہلا فتنہ پیش آیا یعنی حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدری صحابہؓ میں سے کوئی نہ بچا، اس کے بعد دوسرا فتنہ پیش آیا یعنی جنگ حرہ تو اصحاب حدیبیہ میں سے کوئی شخص باقی نہ رہا، اس کے بعد تیسرا فتنہ پیش آیا تو پھر وہ ختم ہونے نہ پایا کہ اس نے لوگوں میں کچھ بھی جان باقی چھوڑی (یعنی قرن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ختم ہو گیا)

تشریح: سبحان اللہ اس امت کے فضل و کمال کا کیا پوچھنا جس میں افراد نہیں جماعتیں ایسی گذریں جن کی مدح و ثناء خدا نے قرآن پاک میں فرمائی ہے، جو قیامت تک تلاوت کی جاتی رہے گی، لیکن یہ کرشمۂ قدرت ہے کہ سوائے اس کی ذات پاک کے کسی کمال کو بقاء نہیں، آخر کار دنیا کی نظر ان کو لگی اور ایک ایک کو چن کر کھا گئی، یہاں راوی بڑی حسرت کے انداز میں فرماتے ہیں کہ اصحاب بدر کے فضل و کمال کا امت میں بڑا شہرہ ہے لیکن شدہ شدہ وہ بھی گم ہوتے رہے، اور جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حادثہ پیش آیا تو وہ سب کے سب ایسے گم ہوئے کہ ان میں کا ایک متنفس بھی باقی نہ رہا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

ان کے بعد اہل حدیبیہ کا نمبر تھا جو اپنے صبر و تحمل اور بے شمار قربانیوں میں ضرب المثل تھے، پسماندگان کی آنکھیں انہی کو دیکھ دیکھ کر کچھ ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھیں، لیکن مصیبت

پر مصیبت یہ کہ جب جنگ حرہ کا حادثہ پیش آیا تو اس مقدس جماعت کا بھی ایک ایک فرد خاک کے نیچے پہنچ کر ہمیشہ کے لئے سوگیا، اب بھی خیر القرون کے متفرق افراد کہیں کہیں نظر پڑ جاتے تھے لیکن اس کے بعد تیسرا فتنہ سامنے آیا تو صحابہؓ میں سے ایک ایک فرد کو بہا کر لے گیا۔ اور اب دنیا ان نفوس کو دیکھنے سے ہمیشہ کے لئے ترستی رہ گئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ یہ تیسرا کونسا فتنہ تھا اس میں شارحین کو اختلاف ہے۔ بیشک یہ امت خیر امت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ فتنے بھی اس کے نصیب میں آئے ہیں سچ ہے ع

"جن کے رُتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"

صحابہ کرام کی ایک ایک کر کے اس طرح گم شدگی، کوئی ایسا غم نہ تھا جس کو قیامت تک کبھی فراموش کیا جاسکتا، ان مبارک نفوس کی قدر جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لسان فیض ترجمان سے سن لیجئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ غزوہ کا ارادہ کریں گے اور آنکھیں یہ تلاش کریں گی کہ کیا ہے کوئی ایسا شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود دیکھا ہو، تو کہا جائے گا کہ فلاں شخص ہے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو فتح دے گا۔ اس کے بعد پھر ایک زمانہ میں ایک جماعت کا غزوہ کرنے کا ارادہ ہوگا کہ ہے کوئی ایسا شخص کہ جس نے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود نہ دیکھا ہو تو کم از کم آپؐ کے کسی صحابیؓ کو دیکھا ہو تو لوگ کہیں گے کہ فلاں شخص ہے تو اس کی برکت سے فتح نصیب ہوگی۔ اس کے بعد پھر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ غزوہ کرنے کا قصد کریں گے تو یہ تلاش ہوگی کہ ہے کوئی ایسا شخص کہ جس نے اگر کسی صحابی کو نہ دیکھا ہو تو صحابی کے دیکھنے والے ہی کو دیکھا ہو تو خبر ملے گی کہ فلاں شخص ہے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ فتح نصیب کرے گا۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۵۵۳)

حدیث بالا سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرون ثلاثہ کیسے بابرکت قرون تھے کہ

ان میں کا ایک ایک فرد فتح و نصرت کا باعث بن جاتا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرون ثلاثہ کی برکات بعد میں اب کہاں نظر آسکتی تھیں؟ لیکن چونکہ یہ امت خیر امت ہے اور یہ کہ اس امت میں اصحاب خیر کا باقی رہنا ضروری تھا، اس لئے اس کے بعد بھی اُفق عالم پر ایسے ایسے علم و معرفت کے آفتاب چمکے جن کے نور نے دنیا کو جگمگا دیا اور بالخصوص ہر صدی کے گذرنے پر ایک نہ ایک عالِم یا کوئی جماعت ایسی ظاہر ہوتی رہی جس نے مرجھائے ہوئے دین کو پھر سیراب کر کے سرسبز کر دیا، لیکن دنیا اسی طرح چھان چھان کر جو بیش قیمت آٹا تھا وہ نیچے گراتی رہی اور جو ان کی نسبت سے بھوسہ تھا وہ باقی چھوڑتی رہی۔ انحطاط کی یہ رفتار گو کتنی ہی تیز رہی اور حوادث کی ستم ظریفی نے، گو بڑے بڑے علماء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر کسی دور میں بھی یہ خیرِ اُمت اصحاب خیر سے نہ کبھی پہلے خالی رہی اور نہ انشاء اللہ العزیز آئندہ خالی رہے گی۔ گو باقی ماندہ کی نسبت مجموعی لحاظ سے گذشتہ جماعتوں کے سامنے وہی ہو جو آٹے اور بھوسی کی ہوتی ہے۔

لیکن اب رونا اس کا ہے کہ دنیا میں یہ شناخت بھی باقی نہ رہی کہ آٹا کیا ہے اور بھوسی کیا، اس لئے ہمارا دور اس لحاظ سے بہت ناکام دَور ہے کہ جس میں ہماری نظریں آٹے کو بھوسی اور بھوسی کو آٹا دیکھ رہی ہیں یعنی صالحین جتنی تیز رفتاری سے گذر رہے ہیں ہم اتنا ہی خوش ہوتے ہیں کہ ہماری ترقی کا میدان اور صاف ہوتا جا رہا ہے اور آنکھیں نہیں دیکھتیں کہ ترقی کی ہوس کرنے والے کبھی اپنے قلب پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ اس میں خدا کا خوف اور ایمان و یقین کا کتنا نور باقی رہ گیا ہے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اچھی طرح یاد رکھیئے کہ آپ کا ترقی کا خواب اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ تا آخر کرتے کرتے ان ہی نفوسِ قدسیہ کے قدم بقدم نہ چلیں

جو ہم سے تیرہ سو سال پہلے گذر چکے ہیں، یہی وہ شہسوار تھے جنھوں نے طاغوتی طاقتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا، یہی تو تھے جنھوں نے کفر کے بادل افق عالم سے چھانٹ کر رکھ دیئے اور اس پر پرچم اسلام لہرا دیا، اگر آپ تقدم تقدم کا نعرہ لگا کر ان انقلابی ہستیوں سے آگے تقدم چاہتے ہیں تو معاف کیجیے یہ آپ کی ناکامی کا سب سے خطرناک قدم ہوگا۔

اللہ تعالےٰ کے خاص بندوں کی علامت

(مسلمانوں کی مضرت رسانی شرعی نظر میں بدترین جرم ہے)

(۵) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ وَّ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ وَشِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الْمَشَّاءُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ الْبَاغُوْنَ الْبُرَآءَ الْعَنَتَ

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۱۵ وروی ابن ماجۃ الجزء الاول کما فی مشکوٰۃ ص ۴۲۷)

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن غنمؓ و اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے خاص نیک بندے وہ لوگ ہیں، جن پر نظر پڑے تو فوراً خدا یاد آجائے اور بندوں میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور مخلص دوستوں کے درمیان تفرقہ ڈالتے ہیں اور بے گناہوں کو مصیبت میں پھنساتے رہتے ہیں۔

شرح: جب مومن کے قلب میں تکرار کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے تو اس کے چہرے پر نظر پڑ جانے سے اگر اللہ ہی یاد نہ آئے تو اور کیا ہو، شیخ محدث عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں ایک ایسے شیخ کا تذکرہ کیا ہے جس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے لَآ اِلٰهَ

اِلَّا اللّٰہُ نکل جاتا تھا۔ خود اس حقیر نے بھی اس صفت کے ایک صاحب کو دیکھا ہے وَالحَمدُ اللّٰہِ عَلیٰ ذٰلِکَ

حضراتِ علماء اسی کے ساتھ صحیح بخاری کی حدیث لَا یَزَالُ العَبدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ کو اخیر تک پڑھ کر جتنی چاہے اس کی شرح کر لیں اور لطف اندوز ہوں عوام کے فہم سے بالاتر ہونے کی وجہ سے اس معمہ کی شرح کرنا نامناسب ہے۔ صرف اس حقیقت کا اصل جلوہ آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں نظر آتا تھا کتنے ہی لوگ ایسے گذرے ہیں جو آپؐ کو دیکھنا تو درکنار صرف آپ کی صفات سن کر آپ کا کلمہ پڑھنے لگے اور بعضوں نے آپؐ کو ایمان کے ساتھ ایک نظر دیکھ لیا ان کا کیا کہنا وہ تو اسی آن میں صحابیت کے مدارج سے مشرف ہو گئے۔

خوشا نصیب اس امت کے جس کو اس بحرِ ذخار کا اتنا سا قطرہ آج بھی نصیب ہے کہ کسی گفت و شنید کے بغیر جہاں ان کے چہرے پر نظر پڑی۔۔ اسی وقت دل میں یادِ الٰہی کی بجلی کوند گئی۔ سبحان اللہ یہ امت بھی کیا اشرف امت ہے۔ بقیہ جملے بھی اگرچہ شرح طلب ہیں مگر یہاں اس کو اختصاراً ترک کیا جاتا ہے۔ لوگ صرف ترجمہ پر غور کر کے اس وبالِ عظیم سے بچیں تاکہ شرار عباد اللہ میں داخل نہ ہوں۔

اخلاقی لحاظ سے غیبت کرنا مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے بجائے پراگندگی کا باعث ہے اور شرعی نظر میں ایک اعتبار سے زنا سے بھی بدتر فعل ہے

(۶) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَّجَابِرٍؓ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ الْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَزْنِیْ فَیَتُوْبُ فَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَیَتُوْبُ فَیَغْفِرُ اللّٰہُ لَہٗ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِیْبَۃِ لَا یُغْفَرُ لَہٗ حَتّٰی یَغْفِرَ ھَالَہٗ صَاحِبُہٗ۔ (رواہ البیہقی

فی شعب الایمان (مشکوٰۃ ص ۴۱۵)

ترجمہ: حضرت ابوسعید اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت چیز ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ کیسے؟ آپؐ نے فرمایا آدمی سے اگر زنا سرزد ہو جائے اور اس کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے (اور اس کا گناہ یوں معاف ہو سکتا ہے) لیکن غیبت کرنے والا اس وقت تک بخشا نہیں جا سکتا جب تک کہ وہ شخص ہی جس کی غیبت کی ہے خود معاف نہ کر دے۔

شرح: حدیث مذکور میں غیبت کی مذمت پر تنبیہ کرنی منظور ہے یہاں زنا کی حیثیت بتانی منظور نہیں، اس لئے یہاں صرف وہ پہلو بیان کیا گیا ہے جس کے لحاظ سے غیبت کی اہمیت زنا سے بھی زیادہ نمایاں ہو جائے، دوسری احادیث میں جہاں زنا کی مذمت بیان کی گئی ہے، اس کا اندازہ صرف حدیث کے اس ایک کلمہ سے ہو سکتا ہے " لَایَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ" یعنی مومن جب زنا کرتا ہے تو اس حالت میں اس کا ایمان اس کے اندر نہیں رہتا بلکہ باہر آ کر علیحدہ سائبان کی طرح بن جاتا ہے مختصراً مطلب یہ ہے کہ زنا اور ایمان بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے۔ اب اس سے زنا کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود پھر ایسے مؤمن کی مغفرت رحمتِ الٰہی کے سوا کسی اور کو تکنے کی محتاج نہیں لیکن غیبت کیونکہ حقوق العباد میں سے ہے اس لئے جب تک صاحبِ حق ہی اس کو معاف نہ کر دے، مولائے حقیقی اس کی مغفرت کی کوئی ضمانت نہیں دیتا۔

غیبت سننے والے کا فرض ہے کہ وہ صرف خاموش ہی نہ رہے بلکہ اپنے بھائی کی خیر خواہی میں اس کی طرف سے جواب دہی بھی کرے

(۷) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ یَزِیْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيْهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّعْتِقَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے بھائی کی طرف سے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی جانب سے جواب دہی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور دوزخ کے عذاب سے نجات دے گا۔ (بیہقی مشکوٰۃ ص ۴۲۴)

شرح: شریعت کی نظر میں کسی کی غیبت سننا غیبت کرنے سے کم نہیں ہے اس لئے غیبت سننے والے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ غیبت سن کر صرف سکوت ہی نہ کرے بلکہ جہاں تک ہو سکے اپنے مسلمان بھائی کی جانب سے جواب دہی کی سعی کرے اور اگر یہ لوجہ اللہ ہو تو اس غیاب میں اپنے دینی بھائی کی دینی مدد کرنے کا صلہ ان بڑے الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ پر یہ حق ہے (جس پر کسی کا کوئی حق نہیں آتا) کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ سے نجات عطا فرمائے۔ اگر یہ ایک حدیث ہی ہمارے سامنے ہو تو اندازہ فرما لیجئے کہ ہماری بگڑی ہوئی معاشرت کا انداز کتنا بلند ہو سکتا ہے۔

یتیموں کے ساتھ ہمدردی اور باعزت سلوک کرنے کی اہمیت اور اس کے بلند ثمرات شرعی نظر میں

(۸) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلًا شَكٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ قَالَ امْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ۔ (رواہ احمد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ میرا دل بہت سخت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یتیموں کے سروں پر شفقت کے ساتھ ہاتھ پھیرا کرو اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کرو (دل نرم ہو جائے گا) (مشکوٰۃ ص ۴۲۵)

تشریح : کسی انسان کا دل کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو لیکن ایک سلیم الفطرت انسان کا دل کسی یتیم کو دیکھ کر بھر آتا ہے جب وہ یہ سوچتا ہے کہ جس طرح میں اپنی اولاد کا ایک مشفق اور مُربّی باپ ہوں اس کا بھی اسی طرح کوئی مشفق اور مُربّی باپ ہوگا جس کی شفقت سے آج یہ محروم ہے اور اگر اس نیت سے وہ کسی یتیم کے ساتھ رحم و کرم کا برتاؤ کرنے لگتا ہے تو قدرت آہستہ آہستہ اس کی قلبی سختی کو نرمی سے بدل دیتی ہے۔ اس حدیث میں ایک طرف یتیم پر شفقت کی تعلیم ہے اور دوسری طرف اس شفقت کرنے والے کا ذاتی نفع بھی بیان کیا گیا ہے مگر آہ! افسوس کہ آج ہمارے مسلمان بھائیوں کے یتیم بچے ایک طرف اگر قسمت سے اپنے والد کی شفقت سے محروم ہوتے ہیں تو دوسری طرف عام مسلمانوں کی شفقت سے صرف محروم ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کی بے رحمی کے شکار ہوتے ہیں، اسلام نے بیواؤں، یتیموں اور مساکین کی طرف اتنی توجہ کی ہے کہ قرآن میں کئی مقامات پر خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس قوم میں بیکسوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اپنا اولین فرض سمجھا جانے لگے اس کے ذلیل افراد بھی عزیز بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہاں دل میں ایک خیال یہ بھی گذرتا ہے کہ جن کی شان رحمۃ للعلمین تھی ان کے بیشمار صفاتِ حمیدہ میں سے ایک ممتاز صفت یتیموں کے ساتھ غمخواری تھی چنانچہ شاعروں نے قصائدِ نعتیہ میں بھی آپؐ کی اس ممتاز صفت کا ذکر کیا ہے اس لئے اگر کوئی مسلمان یتیموں پر رحم کھا کھا کر ان کے سروں پر دستِ شفقت پھیرتا ہے اور اس طرح رحمۃ للعلمین کی اس امتیازی صفت میں ظاہری طور پر کسی ادنیٰ درجہ میں بھی صوری مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دل یہ کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ارحم الراحمین کی رحمت سے اس کو آپ کے ساتھ صفتِ رحمت میں معنوی مناسبت کا بھی کوئی نہ کوئی حصہ نصیب ہو کر رہے گا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین چونکہ سایہ کی طرح ہمہ وقت آپ کے ساتھ ساتھ لگے رہا کرتے تھے اس لئے ان میں بھی آپؐ کی صفتِ رحمت کے ایسے آثار

نمایاں ہوگئے تھے کہ قرآن کریم نے ان کی امتیازی صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی ہے: رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (نرم دل ہیں آپس میں) (سورۂ فتح پارہ ۲۶ رکوع ۱۲)

ڈاکٹروں نے ہر بیماری کے لئے الٹے سیدھے علاج گھڑ رکھے ہیں مگر کیا کوئی ایسا بھی ہے جس کو قلبی قساوت کا (یعنی دل کی سختی کا) علاج معلوم ہو؟ یہ صرف رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ہے کہ انھوں نے اس لاعلاج مرض کی دوا تجویز کی اور وہ بھی ایسی کہ جو ایک طرف تو مفت اور بے خطا ہے اور دوسری طرف یتیموں کی شیرازہ بندی اور پرورش کا ایک باعزت اور مضبوط نظام ہے، باعزت اس لئے کہ اس نظریہ میں یتیم سے زیادہ خود اس کا فائدہ ہے۔

حقوقِ عامہ تلف کرنے کے نتائج کتنے تباہ کن ہوتے ہیں

(۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ مَاظَهَرَ الْغُلُوْلُ فِیْ قَوْمٍ اِلَّا اَلْقَی اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَلَا فَشَا الزِّنَا فِیْ قَوْمٍ اِلَّا کَثُرَ فِیْهِمُ الْمَوْتُ وَلَا نَقَصَ قَوْمٌ اِنِ الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِلَّا قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ وَلَاحَکَمَ قَوْمٌ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا فَشَا فِیْهِمُ الدَّمُ وَلَاخَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلَّا سُلِّطَ عَلَیْهِمُ الْعَدُوُّ

(رواہ مالک مشکوٰۃ ص ۴۵۹)

ترجمہ: ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب کوئی قوم کھلم کھلا خیانت کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں خوف و ہراس ڈال دیتا ہے اور جب کسی قوم میں عام طور پر زنا کی عادت پڑ جائے تو وہ کثرت کے ساتھ موت کا شکار رہتی ہے اور جب کوئی قوم ناپ تول میں گڑبڑ شروع کرتی ہے تو رزق سے محروم کر دی جاتی ہے اور جب کوئی قوم ناحق فیصلوں کی عادی ہو جاتی ہے تو اس میں باہمی خونریزی کی وبا پھیل جاتی ہے اور جب کسی قوم کو غداری اور بدعہدی کی عادت پڑ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دشمنوں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔

تشریح :۔ مذکورہ بالا حدیث میں خاص خاص معاصی کے خصائص یعنی ان کے خاص خاص اثرات بیان کئے گئے ہیں یا یوں کہیئے کہ خاص خاص بلاؤں کے معنوی خصائص و اسباب ذکر کئے گئے ہیں یہاں جو مناسبت سطحی طور پر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ خیانت کرنے والا جب خیانت کرتا ہے پہلے پہل اپنی حرکت سے وہ خود اپنے دل میں خوفزدہ ہوتا ہے پھر جب اس کو عادت پڑجاتی ہے تو گو اس کو اس خوف کا احساس نہ رہے مگر رفتہ رفتہ اس کے دل کو یہ روگ لگ ہی جاتا ہے۔ رہا زنا کا ثمرہ موت ہونا تو وہ ظاہر ہے کہ شریعت نے بقاءِ نسل انسانی کا ذریعہ نکاح مقرر فرمایا ہے اب جو شخص اس مشروع راستہ کو چھوڑتا ہے اور دوسرا قبیح اور فحش بقاءِ نسل کا راستہ اختیار کرتا ہے تو شریعت بجائے حیات کے اس کا نتیجہ موت کی شکل میں ظاہر فرماتی ہے، اب وہ جس راستہ اور جس نوعیت سے بھی آئے اور جس وقت بھی اس کا ظہور ہو کیونکہ اس دنیا میں جزا و سزا کا دستور دست بدست نہیں بلکہ یہاں اِمہال کا بھی ایک قانون ہے اور جب اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تو پھر اصل قانون کا نفاذ ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ تجارت رزقِ انسانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن جب اس قدرتی ذریعہ میں بے ایمانی سے کام لیا جاتا ہے تو اس کی جزا یہی ہونی چاہیئے کہ ان سے رزق قطع کر لیا جائے، اب وہ خواہ کسی شکل میں بھی نمودار ہو، بیماریوں میں روپیہ برباد ہو گرانی ہو جائے یا مقدمات میں گرفتار ہو جائے، قدرت کے یہاں اس کے لئے بہت سے دروازے ہیں وہ جس راستے سے چاہے رزق قطع کر سکتی ہے۔

اور اسی طرح شریعت نے عدل و انصاف کا حکم اس لئے دیا ہے کہ لوگوں میں فتنہ و فساد اور قتل و غارت کی بری عادت پیدا نہ ہو لیکن جب حکام اس راستہ کو چھوڑ کر ظلم و ناانصافی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں تو اب اگر اس کے نتیجہ میں فتنہ و فساد اور خونریزی نمودار ہو تو یہ بالکل ٹھیک اور برجا ہے۔

حدیث کا آخری جملہ بہت زیادہ عمیق اور گہرا ہے کیونکہ یہ اس پر مبنی ہے کہ عہد کی

حقیقت اور اس کی اہمیت پہچانی جائے اس کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ صریح نقصان پر پر وفائے عہد کرنے والے کے دل میں کتنی قوت اور دشمن کے دل پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑتا ہے، لیکن جب صورتِ حال بدل جاتی ہے اور ایک بلند نظر انسان اپنے عہد کی خود پاسداری نہیں کرتا تو وہ اپنی نظر میں تو ذلیل اور خفیف ہوتا ہی ہے لیکن دشمن کی نظروں میں بھی دن بدن خفیف ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب دشمن کی نظروں میں اپنے مقابل کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے تو اس کی جرأت اور دلیری اسی قدر ترقی کرتی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہو کر رہتا ہے کہ جو غالب ہے وہ مغلوب ہو جائے اور جو مغلوب ہے وہ غالب بن جائے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مذکورہ بالا قوانین کا تعلق سب ہی کے ساتھ ہے لیکن مسلمان قوم خواہ وہ عملاً کتنی ہی پیچھے ہو لیکن شریعت پر یقین و ایمان رکھنا اس کا ایسا فرض ہے جس کے بغیر وہ مسلمان کہلا ہی نہیں سکتی اس لئے ان رسومِ بد کے اثرات جتنے جلد مسلمانوں میں نمودار ہو جاتے ہیں کافروں میں نمودار نہیں ہوتے یہاں افسوس صرف اس کا نہیں کہ ہم ان تباہ کاریوں سے احتراز نہیں کرتے بلکہ زیادہ افسوس و حسرت اس کی ہے کہ جب ان کے اثرات و نتائج ہماری زندگیوں میں ظاہر ہونے لگتے ہیں تو ہم اس پر اس اسلامی نظریہ کے بجائے کافروں کے نظریات کے موافق عذر کرنے لگتے ہیں، یہ سب کچھ ہماری بے علمی اور اسلامی زندگی سے بد ذوقی اور کفر کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے لازمی نتائج ہیں، کافروں کے ایک فرقہ کے نزدیک چھوت کا مسئلہ صرف اسی نکتہ پر مبنی ہے کہ جس قوم کو وہ اپنی نظروں میں قابلِ نفرت سمجھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ اس طرح ان کے متعدی اثرات سے اپنے نفوس کو محفوظ رکھے ۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی اصلاح کی توفیق بخشے۔

معاشرتی زندگی پر شرعی نظر میں شراب نوشی، بے حجابی اور افراطِ زر کے مضر اثرات

(۱۰) عَنْ حُذَیْفَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِہٖ اَلْخَمْرُ[۱] جِمَاعُ الْاِثْمِ وَالنِّسَآءُ حَبَائِلُ الشَّیْطَانِ وَحُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ

(رواہ رزین وروی البیہقی عنہ فی شعب الایمان عن الحسن مرسلاً حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ) مشکوٰۃ ص ۴۴۴

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وعظ میں فرمایا کہ شراب خوری تمام گناہوں کا مجموعہ ہے اور عورتیں مردوں کو پھنسانے کے لئے شیطانوں کا بہترین جال ہیں اور دنیا کی محبت تو ہر گناہ کی جڑ ہے۔

شرح: اس حدیث کے ایک ایک جملہ کی شرح کے لئے ایک ایک رسالہ درکار ہے یہاں صرف چند اشارات ذکر کئے جاتے ہیں، شراب کا نمازوں کی بربادی کے ساتھ گہرا تعلق ہے، جو دین کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو ایک مرتبہ شراب پئے گا اس کی چالیس دن تک کی نمازیں قبول نہ ہوں گی اور چوتھی مرتبہ کے بعد اس کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۳۱۷) دوسری حدیث میں ہے کہ جو دنیا میں شراب پئے گا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہو جائے گی تو اس کو آخرت کی شراب نصیب نہ ہوگی۔ (مشکوٰۃ ص ۳۱۷) قرآن پاک میں اس کی مذمت میں بڑی تفصیل فرمائی گئی ہے۔

عورتوں کی بے پردگی کے نتائج اور ان کے ذریعہ سے سلطنتوں کی بربادی آج بھی دنیا میں اور تاریخ میں موجود ہے۔

---

[۱] کذا ضبطہ فی الصراح کما فی الھامش

تیسرا جملہ قدرے تفصیل طلب ہے۔ دنیا کی محبت کے لحاظ سے انسانوں کے چار طبقات ہیں :۔

۱۔ ایک وہ کہ جن کے پاس نہ دنیا ہے اور نہ اپنی بے شعوری کی وجہ سے ان کے قلب میں دنیا سے محبت ہے یہ محروم القسمت ہیں مگر حُبِ دنیا کی اخروی مضرتوں سے محفوظ ہیں۔

۲۔ جن کے پاس دنیا بھی ہے اور وہ دنیا کی محبّت میں مخمور ہیں اور یہ بدترین قسم ہے ان کی دنیا حُبِّ دنیا کی وجہ سے نہ ان کے کام آتی ہے اور نہ دوسروں کے لئے کارآمد ہے

۳۔ جن کے پاس دنیا تو نہیں مگر وہ دنیا کی محبت میں دیوانے ہیں۔ یہ سب سے بدترین فرقہ ہے جن کے ہاتھ بھی دنیا سے خالی ہیں اور دنیا کی محبّت میں دیوانگی کی وجہ سے آخرت کے بھی مفلس ہیں۔

۴۔ جن کے پاس دنیا ہے مگر فطری طور پر ان کے قلب میں دنیا سے محبّت نہیں، یہ لوگ قلیل ہیں اور قدرت کے اس لطف وکرم کی وجہ سے حُبِ دنیا کی مضرتوں سے محفوظ ہیں لیکن اس طبقہ کی ایک قسم وہ ہے جو حُبِ خداوندی کی وجہ سے دنیا و مافیہا کو فراموش کر چکی ہے، یہ لوگ "کبریت احمر" ہیں اور "اقل قلیل" ہیں یہ وہ حضرات ہیں کہ اگر ان کی ملک میں تمام دنیا بھی آجائے تو ان کی مسرت میں ایک ذرّہ اضافہ نہیں ہوتا اور اگر ان کی ملکیت کا ذرّہ ذرّہ ان سے چھین لیا جائے تو اس کا غم بھی ان کو ذرّہ برابر نہیں ہوتا گویا کہ دنیا کا وجود و عدم ان کی منظر دل میں برابر ہوتا ہے اور وہ ان دونوں کو خدا کی نعمتیں تصور کرتے ہیں، دولت کا جمع کرنا ان کے لئے ایک پہاڑ ہوتا ہے اور خدا کی راہ میں اس کو لٹا دینا ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ میں اس کی مثالیں اتنی ہیں کہ تاریخ ان سے بھری پڑی ہے،

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو جب حضرت امیر معاویہؓ نے دیکھا کہ جو بھی مال ان کو دیا جائے وہ اس کو خرچ کر ڈالتے ہیں تو عاجز آکر یہ جملہ تحریر فرمایا (لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ)

یعنی اسراف کی حد تک خرچ کرنا کوئی بھلائی نہیں، امام موصوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا (لَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ) یعنی اسراف بیشک بری چیز ہے مگر راہِ خدا میں جتنا بھی خرچ کر دیا جائے وہ اسراف نہیں کہلاتا، اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دیگر امہات المومنین کے حالات منقول ہیں اور بہت سے صحابہؓ سے منقول ہے کہ وہ اپنے گھر میں مال دیکھ دیکھ کر غم کے آنسو بہاتے تھے اور اس کے بعد اولیاء کرام میں بھی اس اسوۂ حسنہ کی اتنی مثالیں ملتی ہیں جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ بھی اُمت کے کچھ چیدہ افراد کا ایک مذاق تھا اور اس مذاق کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور وہی اس کی قدر و قیمت کو شناخت کرتے ہیں۔

لیکن یہاں آمد و خرچ کا جو عام ضابطہ شریعت نے تعلیم کیا ہے اس میں عام افراد کی رعایت کر کے ایک درمیانی راستہ ایسا تعلیم فرمایا ہے جس پر ہر کس و ناکس کو عمل کرنا ممکن ہو یعنی دولت کو نہ تو اتنا جمع کیا جائے کہ قلب میں اس کی محبت اتنی سما جائے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا نہ ہوسکیں یا اگر ادا ہوں تو ان کے ادا کرنے میں دل میں تنگی محسوس ہو اور نہ اُس کو اس طرح لے جا لٹایا جائے کہ کل مفلس ہو کر بے صبری کے ساتھ دوسروں کا محتاج ہونا پڑے اور دستِ سوال دراز کر کے ذلیل بننا پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی بخشیدہ دولت میں سے اس کے عائد کردہ حقوق فراخ دلی سے ادا کرتا ہے تو وہی دنیا پھر مسلمان کے دین کے لئے ایک بہترین رفیق کا کام دیتی ہے اور اس میں اس کی محبت کے لئے وہ کشش ہی باقی نہیں رہتی جس کی محبت اس کے اور رب کے درمیان حجاب بن جائے اس لئے حدیثوں میں ایسی پاک دنیا کی تعریف بھی آئی ہے اور اسی نکتہ کی وجہ سے حدیث مذکور میں دنیا کی مذمت نہیں بلکہ اس کی محبت کی مذمت کی گئی ہے۔ اسلام میں محبوب دنیا کی مثالیں بھی سلف سے لے کر خلف تک ملتی ہیں، ہمارے زمانہ میں پاک دنیا کی یعنی کسبِ حلال کی بڑی اہمیت ہے کہ اپنا دین بھی عزت کے ساتھ محفوظ

رکھے اور دوسروں کی بھی مدد کا باعث ہو۔

تنبیہ: حنفی فقہ کی کتابوں میں ترتیب صفوف کی دلیلوں میں ایک حدیث مذکور ہوتی ہے اَخِّرُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰهُ یہ حدیث مشکوٰۃ شریف کتاب الرقاق میں مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں مذکور ہے اس لئے تنبیہاً یہ اطلاع دی جاتی ہے، کیونکہ (بہت بے محل اور) غیر باب میں مذکور ہوئی۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۴۴۴)

نغمہ وسرود قلب میں نفاق کا روگ پیدا کر دیتا ہے

(۱۱) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغِنَاءُ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الزَّرْعَ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ ص ۴۱۱)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گانا دل میں اس طرح نفاق کو اگاتا ہے جیسے پانی کھیتی کو۔

تشریح: گانا براہ راست ہو یا بواسطہ ریڈیو کے، اپنی مضرت رسانی میں یکساں ہے بلکہ بعض لحاظ سے ریڈیو کی مضرت زیادہ ہے، کیونکہ جتنی وسعت اور سہولت اور وقت ومقام کی پابندی کی آزادی یہاں حاصل ہے وہ پہلی صورت میں نہیں، یہی وجہ ہے کہ جن گھروں میں ریڈیو داخل ہو چکا ہے اس میں بہت سے معصوم لوگ بھی بے ارادہ اس گناہ میں ملوث ہو گئے ہیں اور اگر خدانخواستہ ریڈیو کے ساتھ صورت بھی اپنے حرکات وسکنات کے ساتھ آنے کا رواج اسی طرح عام ہو گیا (یعنی ٹیلی ویژن کا) تو معلوم نہیں کہ بہت سے معصوم گھرانوں میں کتنے فتنے اور اٹھ کھڑے ہوں گے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک بار کہیں تشریف لئے جا رہے تھے اور ان کے شاگرد نافع بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے کہ اچانک حضرت ابن عمرؓ کے کانوں میں کہیں سے بانسری کی آواز آئی۔ اسی وقت انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے شاگرد سے پوچھتے

رہے کہ آواز آتی ہے، آواز آتی ہے، جب انھوں نے کہہ دیا کہ نہیں تو کانوں سے اپنی انگلیاں نکال لیں اب ایک طرف سلف کا یہ مذاق دیکھئے اور دوسری طرف نغمہ وساز کے ساتھ اپنی دلچسپی سامنے رکھیئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایمان وعمل میں وہ کہاں تھے اور ہم کہاں ہیں، گانے سے تنفر کا ان کا کیا عالم تھا اور ہمارا حال یہ ہے کہ کہیں سے نغمہ وساز کی آواز کانوں میں آجاتے تو بس دیکھیں ہم ہمہ تن گوش بن کر قدم جما لیتے ہیں اور جب تک وہ آواز ختم نہ ہو وہاں سے قدم نہیں ہلاتے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے قلوب میں نفاق کی کھیتی سرسبز ہوتی چلی جاتی ہے اور ایمان کی کھیتی سوخت ہوتی جا رہی ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تنبیہ: حدیثوں کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے اصولی طور پر یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ جو حدیث ارشاد ہوئی ہے وہ کس وقت اور کس ماحول میں ارشاد ہوئی ہے، اس طریقہ سے اس کی صحیح مراد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، یہ سب جانتے ہیں کہ اسلام کے ظہور سے قبل عرب میں گانے بجانے کا خاص اہتمام تھا اور اس کام کے لئے گانے والی عورتیں مقرر ہوا کرتی تھیں جن سے ہر ذی حیثیت شخص اپنے مہمان کی ضیافت کیا کرتا تھا ان کو قینات اور مغنیات کہتے تھے اور کفار کی مخالطت سے ہندوستان میں بھی شادیوں کے موقع پر رنڈیوں اور بھانڈوں کا عام رواج رہا ہے۔

گانا الگ چیز ہے اور خوش الحانی بالکل علیحدہ چیز ہے۔ اگر کسی خاص موقع پر جیسا عید اور شادی میں کسی ایسے خاندان کے افراد کے بچے مل کر کچھ اشعار پڑھ لیں جن کے رسم ورواج میں بطور خوشی منانے کے یہ داخل ہو تو اگر وہ گانے کی تعریف میں نہیں آتے تو شرعی حدود کے اندر رہ کر وہ قابلِ اغماض وچشم پوشی ہیں ان کو گانے والی عورتیں اور رنڈیوں کے ساتھ شامل کر کے باضابطہ گانے بجانے کا جواز ثابت کرنا صرف ایک خبط ہے پھر شعر اور شعر میں بھی فرق ہے، ایک شعر وہ ہے جو مقدس مضامین اور خدا تعالیٰ کی صفات اور اس کے رسولِ

پاک کی عظمت پر مشتمل ہے اور ایک شعر دہ جو ناپاک اور عاشقانہ جذبات کے بھڑکانے والے مضامین پر مشتمل ہے ان دونوں میں بھی کچھ فرق کرنا چاہیئے۔ اب خوش الحانی کو گانے سے جا ملانا اور اتفاق اور عادت کو ایک بنا دینا اور اشعار کی نوعیت میں کچھ فرق نہ کرنا اور اس پر طرّہ یہ کہ طبلہ اور سارنگی بھی اس میں شامل کر دینا اور اسی پر بس نہیں بلکہ ایک طبقہ کا تو ان تمام خرافات کو مقاماتِ تصوف طے کرنے کا ذریعہ بنا دینا یہ ظلم عظیم ہے جس کا جواب محشر میں دینا ہوگا اور جب دل اس جسارت پہ دلیر ہو چکا ہے تو کیجئے آج پوچھنے والا کون ہے لیکن خدارا شریعتِ مطہرہ کے سر تو نہ رکھئے۔

اس بے علمی کا رونا کس سے رو دیا جائے کہ یہاں ہر بے بال و پر آیات و احادیث میں رائے زنی کے لئے موجود ہے اگر کچھ علم ہوتا جب بھی ایک بات تھی مگر آج علم بھی نہیں اور فہم سلیم کا قحط ہے۔ حالانکہ مثل مشہور ہے کہ:۔

"یک من علم را دہ من عقل باید"

جب تک فہم سلیم نہ ہو علم بھی کیا کام دیتا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو) (پارہ ۱۔ رکوع ۳)

ظلم کے نتائج صرف شخصی نہیں بلکہ عالمگیر ہوتے ہیں

(۱۲) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ رَجُلًا يَّقُوْلُ اِنَّ الظَّالِمَ لَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ فَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ بَلٰى وَاللهِ حَتّٰى الْحُبَارٰى لَتَمُوْتُ فِىْ وَكْرِهَا هُزْلًا بِظُلْمِ الظَّالِمِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ ص ۴۳۶)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا کہ ظالم شخص کسی پر ظلم کر کے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ خود اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اس پر ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہیں خدا کی قسم ظالم کے ظلم سے حباری (یعنی ایک پرندہ ہے) بھی اپنے گھونسلے میں سوکھ کر مر جاتا ہے۔

تشریح:۔ یعنی ظلم کا نقصان خود ظالم کے نفس تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر حیوانات پر بھی پڑتا ہے جیسا کہ آج کل لوگوں کے خیال کے مطابق متعدی مرض کا نقصان دوسرے تندرست انسانوں کو بھی ہوتا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اشرف ہونے کا یہ بھی ایک تقاضا ہے کہ اس کے بگڑنے سے تمام جہان بگڑ جاتا ہے جیسا کہ انسان میں "دل" سب سے اشرف عضو ہے اگر وہ بیمار ہو جائے تو تمام اعضاء بیکار ہو جاتے ہیں اسی طرح انسان کو سمجھو کہ اس کے ظلم کی نحوست سے قسم قسم کے مصائب نازل ہوتے ہیں، قحط پڑتے ہیں اور بارانِ رحمت بند ہو جاتا ہے تو غریب پرندوں کو بھی جنگل میں کہیں دانہ نصیب نہیں ہوتا اور بالآخر وہ بھوک سے اپنے گھونسلوں میں مر جاتے ہیں، اس لئے ظلم کا اثر ظالم پر تو پڑتا ہی ہے لیکن دوسری مخلوق بھی اس کی وجہ سے بلاؤں میں پھنس جاتی ہے۔

سفرِ آخرت سہولت اور جلدی کے ساتھ طے کرنے کا مختصر نسخہ

(۱۳) عَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ يَسَّرَ اللّٰهُ حَتْفَهٗ وَاَدْخَلَهٗ جَنَّتَهٗ رِفْقٌ بِالضَّعِيْفِ وَشَفَقَةٌ عَلَى الْوَالِدَيْنِ وَاِحْسَانٌ اِلَى الْمَمْلُوْكِ

(رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب۔ مشکوٰۃ ص ۴۲۹)

ترجمہ:۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تین باتیں ایسی ہیں کہ جو شخص ان کا خوگر ہوگا اس کی موت کے وقت اس کی جان بڑی سہولت سے نکلے گی، کمزوروں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا اور اپنے والدین پر شفقت کرنا اور اپنے غلاموں پر احسان کرنا۔

تشریح: ان تینوں باتوں میں جو بات مرکزی نقطہ ہے وہ صرف ایک ہی ہے یعنی "نرمی وشفقت" لیکن اس کو اتنی اہمیت اس لئے دی گئی ہے کہ نرمی کرنا گو کوئی اہم بات نہیں لیکن کمزوروں کے ساتھ نرمی کرنا یہ ذرا مشکل ہے اسی طرح والدین پر شفقت یہ اگرچہ بسا اوقات طبعی ہوتی ہے اس لئے اس کی بھی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رہتی لہذا ضروری ہوا کہ اس کی اہمیت کی تاکید کی جائے تاکہ والدین کے ساتھ جتنی بھی شفقت کا برتاؤ کیا جائے وہ اپنی نظروں میں کم معلوم ہونے لگے، اسی طرح ہر شریف انسان کی طبیعت میں احسان کرنے کا مادہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہے، لیکن اپنے مملوک غلام کے ساتھ احسان کرنا نہ اس کی نظروں میں کچھ اہمیت ہوتی ہے اور نہ غلام کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کے استحقاق کا خیال دل میں گذرتا ہے۔

اِس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کو چاہیئے کہ وہ رفق ونرمی کا اس درجہ عادی ہو جائے کہ جتنا زیادہ نرمی کا مستحق ہو اس کے ساتھ اس کی نرمی اتنی ہی زیادہ بڑھتی رہے، اگر یہ طریقہ ایسے وقت میں قائم رکھے گا جبکہ وہ اپنے اختیار وبس میں ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ ایسے وقت میں فرمائے گا جبکہ وہ بے اختیار اور بے بس ہوگا، نہ ہوش باقی رہیں گے اور نہ حواس کام کریں گے اور نقشہ یہ ہوگا کہ ؎

اک طرف کچھ دیکھ کر چپ ہو رہے تیمار دار
اک طرف بیمارِ غم کچھ کہہ کے چپکا ہو گیا

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شرعی نظر میں نرم خوئی کتنی اہمیت رکھتی ہے جس کو ہم آج بالکل کھو بیٹھے ہیں۔ اس کے برخلاف کمزوروں پر ظلم کرنا اور والدین کے ساتھ بے اعتنائی کا برتاؤ کرنا ہماری نظروں میں کوئی بات ہی نہ رہی۔

اسی مضمون کے مناسب جامع ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کرنا ایسی نعمت ہے کہ خدا تعالیٰ کے

غضب کو بھی ٹھنڈا کر دیتی ہے اور بری موت سے آدمی کو بچا لیتی ہے۔(مشکوٰۃ ص ۱۶۸)
دنیا میں خدا کے وجود سے اختلاف رکھنے والے موجود ہیں لیکن موت کے بارے میں کسی کو اختلاف نہیں اس لئے اس کٹھن اور متفق علیہ سفر کے لئے مذکورہ بالا حدیث کو بہت اہتمام کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے۔

بدقسمتی سے اگر ظالم حاکم مسلّط ہوجائے تو اس وقت رعایا کا پہلا فرض کیا ہے؟

(۴۱) عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا مَالِكُ الْمُلُوْكِ[1] قُلُوْبُ الْمُلُوْكِ فِيْ يَدِيْ وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا اَطَاعُوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَالرَّاْفَةِ وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا عَصَوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَهُمْ بِالسَّخْطَةِ وَالنِّقْمَةِ فَسَامُوْهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ فَلَا تَشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَاءِ عَلَى الْمُلُوْكِ وَلٰكِنِ اشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ كَيْ اَكْفِيَكُمْ۔

(رواہ ابونعیم فی الحلیۃ)

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خبردار کرتا ہے کہ میں خدا ہوں۔ میرے سوا خدا اور کوئی نہیں، بادشاہوں کا مالک ہوں اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ بھی ہوں، دنیوی سب بادشاہوں کے دل میرے قبضے میں ہیں تو یاد رکھو کہ جب میرے بندے میری فرماں برداری کرتے ہیں تو میں بادشاہوں کے دل ان کی محبت و شفقت سے بھر دیتا ہوں (تو وہ اپنی رعایا سے محبت کرنے لگتے ہیں) اور جب میرے بندے میری نافرمانی پر کمربستہ ہوجاتے ہیں تو میں ان کے دلوں کو پھیر کر ان کے دلوں میں

[1] وَمَلِكُ الْمُلُوْكِ

غصہ اور ناراضگی اور سختی ڈال دیتا ہوں، تو پھر وہ بادشاہ ان کو بڑی بڑی مصیبتوں میں مبتلا کرتے ہیں لہٰذا تم اپنے بادشاہوں پہ بد دعاؤں کے بیکار مشغلے میں نہ لگے رہو بلکہ سب سے پہلے اپنی اصلاحِ حال کی طرف توجہ کرو تاکہ ان کی ظالمانہ حرکات سے میں خود تمہارے لئے کافی ہو جاؤں۔ (مشکوٰۃ ص ۳۲۳)

شرح: انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ ظالم ہی کی طرف منظر کرتا ہے اور چونکہ ظاہر میں اپنے نفس کو وہ اسی کے ظلم کا شکار دیکھتا ہے اس لئے ہمہ تن بد دعا کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنے حال کی طرف اس کی توجہ نہیں رہتی، سلبی نقطۂ نظر سے اس کے اس عمل سے عقیدۂ توحید پر بڑی زد پڑتی ہے اس لئے کہ اسلام چاہتا ہے کہ ایک موحد مسلمان کی نظر اتنی اونچی اور بلند ہو کہ ہر خیر و شر میں اپنے خالق کی طرف متوجہ رہے اور اپنے دل میں یہ یقین رکھے کہ ظاہری اسباب مشیتِ الٰہیہ کا صرف ایک عکس ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس عکس سے ہٹ کر خود اصل کی طرف توجہ کیوں نہ کی جائے اور مفت میں کیوں ایک مخلوق اپنی جیسی ایک مخلوق کا منہ تکے۔ اس لئے اس کی بلند منظری اس میں ہے کہ وہ پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو تاکہ جو فاعلِ حقیقی ہے یعنی اللہ تعالیٰ، وہ خود ظالموں کی گردنیں توڑ کر ان کے سامنے جھکا دے۔

اس لئے اس حدیث سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں ظالم بادشاہوں کے لئے بد دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ ایک ایسے اہم گوشے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کی طرف وحیِ الٰہی کی تنبیہ کے بغیر مظلوم کی نظر جا ہی نہیں سکتی اور اس لئے ظالموں کے پنجے سے اس کو رستگاری نصیب ہی نہیں ہو سکتی، آج جیسا کہ دنیا کے حالات پر نظر ڈالنے سے اس مضمون کی تصدیق روزِ روشن کی طرح ہو جاتی ہے یعنی رعایا کی توجہ صرف اپنے حاکموں کی مخالفت پہ لگی رہتی ہے اور ان کے مظالم میں تخفیف کے بجائے اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ اگر کاش ہم اپنے حالات کی طرف بھی توجہ کریں اور ان کی اصلاح کر لیں تو یقیناً ان مظالم کا

کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

موجودہ حکومتوں کا دستور بھی یہی ہے کہ جب کسی جگہ پر عوام سرکشی اور حکومت کے خلاف باغیانہ حرکات شروع کرتے ہیں تو دنیوی حکومتیں بھی ان پر ایسا سخت حاکم مقرر کرتی ہیں جو ان کی کافی سرکوبی کر کے ان کو حکومت کی فرمانبرداری پر مجبور کر دے، پھر اس سلسلہ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ حاکم اتنی سختی کر گذرتا ہے جو حکومت کے منشائے کے بھی خلاف ہوتی ہے اور اس طرح دنیوی حکومتوں میں تزلزل پیدا ہوتا رہتا ہے لیکن قدرتِ کاملہ کے ملک میں یہ صورت نہیں کیونکہ حکم صرف اس کا چلتا ہے وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِهٖ (اور اللہ غالب رہتا ہے اپنے کام میں) (پارہ ۲۰ رکوع ۱۲) اور کسی باغی کی بغاوت اس کا مچھر کے پَر کے برابر بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتی بلکہ دنیا اپنے فسادات کا خمیازہ خود ہی بھگتا کرتی ہے اس لئے مسلمانوں کو اس زمانہ میں خاص کر اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرنے کی اشد ضرورت ہے اور جب وہ یہ کریں گے تو ان کی دعائیں اور بد دعائیں بھی سب قبول ہوں گی اور ذلت و نکبت کے سب بادل ان کے اوپر سے چھٹ جائیں گے۔

اس تحریر کا مقصد کوئی نافہم یہ نہ سمجھے کہ یہاں دنیوی اصلاحات کا قدم اٹھانے سے روکنا مقصود ہے بلکہ جس اصل کے بغیر سیاسی اصول کی صحیح اور اصلاحی قدم کا کام نہیں ہو سکتا اس پر تنبیہ کرنی مقصود ہے۔ یہاں شریعت کا ایک یہ زرین اصول یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں شریعت بین الفریقین کوئی نظام قائم کرنا چاہتی ہے وہاں جانبین کو علیحدہ علیحدہ اس طرح سمجھاتی ہے کہ ہر ایک کو یہ توہم ہونے لگتا ہے کہ شاید اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے، حاکم و محکوم کا معاملہ بھی اسی قسم میں داخل ہے یہاں جو حدیثیں رعایا کے متعلق ارشاد ہوئی ہیں اگر صرف ان ہی کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کا کوئی حق نہیں ہے لیکن جب ان حدیثوں پر نظر ڈالی جاتی ہے جو حکام کی تفہیم کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمامتر ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے اور رعایا سے گویا کوئی باز پرس ہی نہیں اس لئے تیسرے شخص کے لئے

لازم ہے کہ وہ طرفین کی حدیثیں سامنے رکھ کر نتیجہ نکالے، صرف یکطرفہ حدیثوں پہ نظر ڈال کر کوئی رائے قائم کر لینی ایک ناقص اور ادھوری نظر کا کام ہے اور درحقیقت کسی صحیح اور محکم نظام کے قائم کرنے کے لئے یہی سب سے بہتر صورت ہے کہ علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو صرف اس کے حق کی تفہیم کی جائے تاکہ جدل و بحث کا میدان ہی تنگ ہو جائے۔

جو حدیثیں حکام کے متعلق تشدید کی آئی ہیں ان کا یہاں ذکر کرنا مقصود نہیں اس کا اندازہ صرف ذیل کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ان کو قاضی بنانے کی خواہش کی، انہوں نے عرض کیا کہ آپ مجھے اس منصب سے معاف فرمادیں تو بہتر ہے۔ عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ تم قاضی بننے سے کیوں انکار کرتے ہو؟ جبکہ تمہارے والد بھی قاضی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ قاضی اگر منصف بھی ہو اور اگر برابر سرابر چھوٹ جائے تو بھی غنیمت ہے۔ اس پہ حضرت عثمانؓ نے سکوت فرمایا اور ان سے اصرار نہیں کیا۔ (ترمذی)

اس ضمن میں رزین کی روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو اللہ کا نام لے کر پناہ چاہے تو اس کو ضرور پناہ دے دو کیونکہ اس نے بہت بڑی ذات پاک کی پناہ لی اور میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ آپ مجھے قاضی بنائیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ان کو معافی دے دی اور فرمایا مگر اس بات کی کسی کو خبر نہ کرنا کیونکہ قاضی بنانا ضروری ہے پھر اگر ہر شخص اسی طرح خدا تعالیٰ کی پناہ لے لے کر ہٹتا رہے گا تو یہ کام کیسے چلے گا۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۲۵)

اس مختصر رسالہ میں حکام کے متعلق حدیثیں اس لئے نقل نہیں کی گئیں کہ ایک اردو رسالہ کے پڑھنے والے محکوم طبقہ میں بھی وہی لوگ ہوں گے جو کچھ دیندار ہوں گے اور رہے حکام تو ان سے کیا توقع کہ وہ اس کو دیکھیں گے اور اگر دیکھیں تو اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ظالم حاکم کا ظلم اگر حد سے تجاوز کر جائے تو اس کا فوری اور وقتی دانشمندانہ مقابلہ صرف صبر سے کرنا چاہیئے

(۱۵) عَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَدِيٍّ قَالَ أَتَيْنَا أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ فَشَكَوْنَا إِلَيْهِ مَا نَلْقَى مِنَ الْحَجَّاجِ فَقَالَ اصْبِرُوا فَإِنَّهُ لَا يَأْتِي عَلَيْكُمْ زَمَانٌ إِلَّا الَّذِي بَعْدَهُ أَشَرُّ مِنْهُ حَتَّى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ سَمِعْتُهُ مِنْ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ　　(رواہ البخاری ص ۴۶۲)

ترجمہ: زبیر بن عدیؓ سے روایت ہے کہ ہم انس بن مالکؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حجاج کے شدید مظالم کی شکایت کرنے لگے۔ اس پر انھوں نے فرمایا صبر کرو کیونکہ میں نے تمہارے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ ہر زمانہ جو بعد میں آنے والا ہے وہ پہلے زمانہ سے بدتر ہوگا۔

شرح: حجاج کی خونریزی اور اس کی تلوار امت میں ضرب المثل ہے حتیٰ کہ ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ خیر القرون کے نفوس قدسیہ میں سے اس ظالم سفاک نے زبردستی پکڑ پکڑ جن کو قتل کیا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک ہے۔ (دیکھو مشکوٰۃ شریف ص ۵۵۱)

اس میں شبہ نہیں کہ جس ظلم کو تاریخ نہیں بھلا سکی اس کے دیکھنے والے کو اس کو کیسا ہلکا سمجھ سکتے تھے لیکن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ان مظلومین کو صبر دلانے کے لئے اس کے سوا اور چارۂ کار کیا تھا کہ امت میں جو مظالم آئندہ پیش آنے والے تھے ان کی یاد دہانی کر کے تھوڑی دیر کے لئے ان کی اشک شوئی کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ جو آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دور ہوتا رہا ہے وہ بلحاظ ظاہری مظالم کے گو مختلف رہا ہے لیکن دینی لحاظ سے اس کے انحطاط کا نقشہ ٹھیک وہی ہے جو حضرت انسؓ نے بیان فرمایا تھا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہمیشہ مصائب کی چکی میں پستی رہی ہے اس لئے ان کی نظروں میں اہمیت جتنی دینی مصائب کی تھی اتنی جسمانی مصائب کی نہ تھی۔ حجاج کے زمانہ

میں جو مظالم ہوئے وہ کتنے ہی ہولناک اور دردناک ہوں لیکن اس دور میں اور اس کے بعد خیر القرون کے افراد کچھ نہ کچھ منظر آتے رہے اور انھیں دیکھ کر ایمان کی کھیتیاں کسی حد تک سیراب ہوتی رہیں لیکن عہد نبوت سے جتنا بُعد ہوتا رہا مجموعی لحاظ سے مسلمانوں کے قلوب قوتِ ایمانی میں دن بدن ضعیف و کمزور ہوتے رہے، اس ضعفِ ایمانی کے ساتھ بعد کے ادوار میں بھی جسمانی مصائب کی کچھ کمی نہ رہی۔ ادھر ضعفِ ایمانی ادھر مصائب جسمانی، ان دونوں نے مل کر امتِ مسلمہ کو پیس ڈالا اور وہ دین اسلام جو کبھی شرق اور غرب میں پھیل کر کفر و طغیان کی طاقتوں کو مرعوب کر چکا تھا اب رفتہ رفتہ اس کی طاقت گھٹنی شروع ہوئی اور چاروں طرف سے اس کی شوکت کم ہوتے ہوتے اس نوبت پر پہنچ گئی کہ ہم مسلمان ہی دنیا میں سب سے ضعیف اور ناتواں قوم سمجھے جانے لگے اور آج مسلمان بحیثیت قوم کے جس حد پر پہنچ چکے ہیں اسی پستی و نکبت کا سماں آپ کی آنکھیں بھی مشاہدہ کر رہی ہیں۔ اسی انحطاط کی طرف حضرت انسؓ نے اشارہ فرمایا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ ہر دور میں افراد و شخصیات کہیں کہیں کم و بیش ایسی موجود رہی ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی موجود رہیں گی جن کو دیکھ کر اسلام کی صداقت کا کچھ نقشہ سامنے آتا رہا ہے اور آتا رہے گا لیکن کہاں وہ جماعتی شوکت اور کہاں یہ چند افراد کی موجودگی۔

اس کے علاوہ یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ جس ظالم نے صرف بے گناہوں کو تہ تیغ کرنے کی مثال قائم کرنے کی ٹھان لی ہو اس کو حضرت انسؓ جا کر سمجھاتے بھی تو کیا سمجھاتے اس لئے مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ کسی صورت سے ان مظلومین ہی کو صبر کی تلقین پر کفایت کی جائے تاکہ جو افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے وہ تو جا ہی چکے اب جو بقیہ رہ گئے ہیں کم از کم وہی اس کی تیغِ جفا سے محفوظ رہ جائیں۔

عُذر خواہ کو دل سے معاف کر دینا اسلامی اخوت و معاشرت کا ایک اہم رکن ہے

(۱۶) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰى اَخِيْهِ فَلَمْ يَعْذِرْهُ اَوْلَمْ يَقْبَلْ عُذْرَهٗ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ خَطِيْئَةِ صَاحِبِ مَكْسٍ ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان وَقَالَ الْمَكَّاسُ الْعَشَّارُ (مشکوٰۃ ص ۴۲۹)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے بھائی سے معذرت خواہ ہو لیکن اس پر بھی وہ اس کا عذر قبول نہ کرے تو اس کو وہ گناہ ہوگا جو ظالمانہ ٹیکس وصول کرنے والے شخص کو ہوگا۔

فائدہ: اسلامی معاشرت کی روح اخوت اور للّٰہیت پر مبنی ہے اس لئے وہ اس کو برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ دو مسلمانوں میں باہم عداوت کا سلسلہ قائم رہے۔ اگر بشریت کی بنا پر جب کسی سے کوئی نازیبا غلطی اپنے بھائی کے حق میں سرزد ہو جاتی ہے اور وہ اس پر ناراض ہو جاتا ہے تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی طلب کرنے میں خود سبقت کریں پھر جب اتنا کٹھن قدم اپنی طبیعت کے خلاف ہم نے اٹھا دیا تو شریعت یہ تاکید کرتی ہے کہ دوسرے شخص کا فرض اب یہ ہے کہ وہ اس کے ایثار کی قدر شناسی کرے اور اس کو لوجہ اللہ معاف کر دے اگرچہ اس کا دل ہزار بار بھی اس کے لئے آمادہ نہ ہو اور یہ تنبیہ کرتی ہے کہ پہلی غلطی تو اس کی تھی لیکن اب اگر اس نے اس کو معافی نہ دی تو یہ غلطی اس کی ہوگی اور پہلے شخص کی غلطی سے شدید تر ہوگی، اگر ہم اس پر عمل کریں تو ہماری تلخ زندگی کتنی شیریں بن سکتی ہے۔

کسی سے غیبت سرزد ہو جائے یا والدین ناراضگی کی حالت میں فوت ہو جائیں تو اس کی شرعی اور اخلاقی مکافات

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ کَفَّارَۃِ الْغِیْبَۃِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَہٗ تَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَہٗ

(رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر وقال فی ہذا الاسناد ضعف مشکوٰۃ ص ۴۱۵)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی سے غیبت سرزد ہو جائے (اور صاحب غیبت سے معافی مانگنے کی کوئی صورت نہ رہے) تو پھر اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے دل میں اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگا کرے اور یوں کہے الٰہی تو ہم کو اور اس شخص کو بخش دے (یہ حدیث ضعیف ہے)

شرح: حدیث مذکور اگرچہ ضعیف ہے مگر مثل مشہور ہے کہ "ڈوبتا تنکے کا سہارا تکتا ہے" اس لئے جس گناہ کی معافی کی کوئی صورت نہ رہے اس کی بخشش کا کچھ سہارا اگر کسی ضعیف حدیث سے بھی ملتا ہے تو آپ اس سے فائدہ اٹھا لیجئے اور شریعت کی اس خیرات کو معمولی نہ سمجھیے۔ کچھ عجب نہیں کہ آپ کے دعاءِ مغفرت کرنے سے قیامت میں صاحب حق کو آپ کے اوپر ترس آجائے اور وہ اپنے حق کا آپ سے مطالبہ کرنے سے شرما جائے۔

(۱۸) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَمُوْتُ وَالِدَاہُ اَوْ اَحَدُھُمَا وَاِنَّہٗ لَھُمَا لَعَاقٌّ فَلَا یَزَالُ یَدْعُوْلَھُمَا وَیَسْتَغْفِرُ لَھُمَا حَتّٰی یَکْتُبَہُ اللّٰہُ بَارًّا۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۲۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ بندہ اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کا نافرمان ہوتا ہے اور اس کے والدین کا اسی حالت میں انتقال ہو جاتا ہے اور بات ہاتھ سے نکل جاتی ہے اب اگر وہ برابر ان کے لئے استغفار

سے غفلت کر جاتے ہیں کہ جو کلمہ ان کی زبان سے ادا ہو رہا ہے کیا ٹھیک ٹھیک وہی ان کے دل میں بھی ہے۔ ایک بزرگ کی زبان سے بار بار میں نے یہ الفاظ سنے تھے مگر کبھی اس کی اتنی اہمیت دل میں نہ آئی جب یہ حدیث سامنے آئی تو اب اندازہ ہوا کہ: ع
"قلندر آنچہ گوید دیدہ گوید" بزرگوں کے معمولی نصائح کو ہرگز معمولی نہ سمجھنا چاہیئے۔

اسلام میں مجالس کے حقوق کی تعلیم، امانت کی اہمیت و ہمہ گیری اور اس کی باریکیاں

(۲۰) عَنْ سُفْيَانَ بْنِ أُسَيْدٍ الْحَضْرَمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كَبُرَتْ خِيَانَةً أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَّأَنْتَ بِهٖ كَاذِبٌ۔ (رواہ ابو داؤد مشکوٰۃ ص ۴۱۲)

ترجمہ: حضرت سفیان بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے میں نے خود سنا ہے کہ یہ کتنی بڑی خیانت کی بات ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تم کو بالکل سچا سمجھتا رہے اور تم یہ غضب کرو کہ اس سے جھوٹ بولتے رہو۔

شرح: اس حدیث سے اندازہ لگانا چاہیئے کہ خیانت کا دائرہ کتنا وسیع ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خیانت کا تعلق صرف مال سے ہے مگر اسلام یہ بتاتا ہے کہ خیانت انسانی زندگی کے ایک ایک شعبہ سے متعلق ہے حتّٰی کہ اگر آنکھ کہیں خفیہ طور پر بے محل اٹھی تو یہ آنکھ کی خیانت ہے، اسی کی طرف قرآن میں اشارہ ہے یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ (وہ جانتا ہے چوری کی نگاہ) (پارہ ۲۴ رکوع ۷) وہ چوری سے خیانت کرنے والی آنکھوں کو خوب جانتا ہے یعنی جو آنکھیں بے محل اٹھتی ہیں اور نظر حرام کی مرتکب ہوتی ہیں۔

(۲۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيْثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد۔ مشکوٰۃ ص ۴۳۰)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی سے کوئی بات کہے، اس کے بعد ذرا ادھر اُدھر دیکھے تو سمجھ لو کہ بس یہ بات امانت ہے۔

شرح: عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امانت اور خیانت کا تعلق صرف مال کے ساتھ ہے لیکن حدیث بالا سے، آپ اس کی وسعت اور باریکی دونوں کا اندازہ فرماسکتے ہیں یعنی یہ کہ اس کا دائرہ مالیات سے متجاوز اور بہت زیادہ وسیع ہے اور اس میں نزاکت اور باریکی کا لحاظ رکھنا، یہ بھی امانت کی حفاظت کے اندر داخل ہے۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۳۰ میں اس حدیث کے مضمون میں تین قسم کی محفلوں کا استثناء بھی آیا ہے۔ اِلَّا ثَلٰثَةُ مَجَالِسَ سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ اَوِ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی ایک یہ کہ اس میں کسی کے قتل کے متعلق ذکر ہو جس کا قتل کرنا شریعت کے نزدیک حرام ہو یا زنا کے متعلق کوئی مشورہ ہو یا کسی مال کے ناحق لوٹنے کا ذکر ہو (خواہ یہ مال کا لوٹنا چوری کے طریقہ پر ہو یا کسی تجارتی دھوکہ دہی کے طریقہ پر) کیونکہ اس قسم کی باتوں کا اخفا امانت نہیں بلکہ خیانت ہے۔ حدیث مذکور میں یہ تین چیزیں صرف مثال کے طور پر ذکر کی گئی ہیں، ورنہ ہر وہ چیز جو دوسرے مسلمان بھائی کے لئے نقصان دہ ہو اس کا بھی اظہار کر دینا واجب ہے۔

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ امانت کا دائرہ بہت وسیع ہے انسان کی ایک ایک عبادت اور ہر ہر عضو کی حفاظت امانت میں داخل ہے اور اعضائے انسانی میں سے سب سے بڑی خیانت آنکھ اور دل کی ہوتی ہے اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (وہ جانتا ہے چوری کی نگاہ اور جو کچھ چھپا ہوا ہے سینوں میں) (پارہ ۲۴ رکوع ۷)، اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے نزدیک بدترین خیانت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ سے متعلق ہو۔ اسلامی امانت کی اس وسعت کی تفصیل کے لئے ایک رسالہ درکار ہے۔

اسلام میں معاشرت کی بلندی کا معیار یہ ہے کہ خیر خواہی میں اپنے نفس اور اپنے بھائی کے درمیان سرمو فرق باقی نہ رکھا جائے

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَایُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۲ وَعَنِ ابْنِ عَسَاکِرَ بِلَفْظِ لَمْ یَبْلُغْ عَبْدٌ حَقِیْقَۃَ الْاِیْمَانِ۔ کما فی المشکوٰۃ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک کہ اس میں یہ صفت پیدا نہ ہو جائے کہ جو بات وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرنے لگے۔

شرح: اصل بات یہ ہے کہ ایمان کا درخت امانت کی زمین میں لگتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ زمین جتنی بہتر ہو درخت اتنا ہی سرسبز و شاداب ہوتا ہے اسی طرح یہ صفت جتنی اسکے قلب میں موجود ہوگی اتنا ہی اس کا ایمان کامل ہوگا اسلام کی نظر میں۔ دل کے کسی گوشے میں اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان فرق کرنا اخوت اور امانت دونوں کے خلاف ہے اس لئے ہم کو چاہیئے کہ حتی الوسع اس کی کوشش کریں کہ یہ صفت ہم میں پیدا ہو تاکہ حقیقتِ ایمان تک رسائی ہو جائے۔

اب آپ اس حدیث کی کسوٹی پر اپنے ایمان کو پرکھیے اور یہ فیصلہ خود کر لیجئے کہ آپ کے ایمان میں کتنا کھوٹ ہے اور اگر خدانہ کردہ قلبی جذبات یہاں تک تجاوز کر گئے ہوں کہ اگر اپنے مسلمان بھائی کو کوئی خیر نصیب ہو جائے تو دل کو اس پر ناگواری ہونے لگے تو اس کو تو کفر کا ایک شعبہ سمجھنا چاہیئے، قرآن کریم میں ارشاد ہے مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔

(دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو کافر ہیں اہلِ کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو کہ اُترے تم پر کوئی نیک بات تمہارے رب کی طرف سے) (پارہ ارکوع ۱۳)

اس حدیث سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں صفتِ امانت کی کتنی اہمیت ہے اور دوسری جہت سے اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اسلامی معاشرت کتنی بلند معاشرت ہے اگر آج صرف یہی ایک شعبہ ہماری معاشرت میں داخل ہوجائے تو ہمارے تمام نزاعات ایک ہی آن میں ختم ہوجائیں اور عالم کی نظروں میں ہمارا مقام کچھ دوسرا ہی نظر آئے۔ حدیثِ مذکورہ بالا گو بہت مختصر ہے مگر جتنی مختصر ہے اتنی اہم بھی ہے، اس کو بار بار پڑھنا چاہیئے اور عمل کے لئے تا بحدِ امکان قدم اٹھانا چاہیئے۔

حق تعالیٰ نے جب عالم کو پیدا فرمایا تھا تو بارِ امانت اٹھانے کے لئے سب سے پہلے اپنی مخلوقات میں سے سب سے مضبوط مخلوق کو خطاب فرمایا یعنی زمین و آسمان و پہاڑ۔ لیکن صرف یہ دیکھ کر کہ یہ امانت کیا ہے اور اس کی وسعت اور اہمیت کیا ہے اور اس میں کیسی کیسی باریکیاں ہیں اس کے اٹھانے سے سب نے انکار کیا اور سہم کر رہ گئے، اور انسان کے مقدر میں چونکہ خلافت کا تاج لکھا ہوا تھا اس لئے اس نے بے دھڑک اقرار کرلیا اسی طرح آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو) (پارہ ۲۲ رکوع ۶) میں اشارہ ہے اس کی تفصیل کے لئے بھی ایک رسالہ درکار ہے۔

اپنی بداعمالیوں کا خود افشاء کرنا بے غیرتی کے علاوہ اسلامی معاشرت کی جڑیں ہلا دیتا ہے

(۲۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًى اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمَجَانَةِ اَنْ یَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّیْلِ عَمَلًا ثُمَّ یُصْبِحُ وَقَدْ

سَتَرَهُ اللّٰهُ فَيَقُوْلُ يَا فُلَانُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ۔

(متفق علیہ مشکوٰۃ ص ۴۱۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری ساری امت کے لئے معافی ہے مگر وہ لوگ جو علی الاعلان بری باتوں کو اچھالتے پھرتے ہیں، یہ کتنی بڑی بے حیائی کی بات ہے کہ رات کی تاریکی میں بندہ کوئی برا کام کرے اور جب صبح ہو تو اللہ تعالیٰ اس پہ پردہ ڈال دے لیکن یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی اس نعمت کی ناقدری کر کے یہ کہتا پھرتا ہے کہ اے دوست آج رات تو میں نے یہ یہ برے کام کئے ہیں اور اس طرح خدا تعالیٰ نے اس کی بدفعلی پر جو پردہ ڈالا تھا، اس کی وہ پردہ دری کرتا پھرتا ہے۔

شرح: یہ ظاہر ہے کہ کسی بدکاری کا بلاوجہ اس طرح اعلان کرنا خود ایک بے انتہا بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے لیکن چونکہ اس کا اثر انسانی معاشرت اور اس کی سوسائٹی پر پڑنا لازم ہے اس لئے شریعت نے اور زیادہ اس کو اہمیت دی تاکہ ایک انفرادی گناہ کہیں متعدی ہو کر جماعتی بربادی کا باعث نہ بنے اس قسم کی حدیثوں سے اس بات کا اندازہ کر لینا چاہیئے کہ اسلام کی نظر میں معاشرتی اصلاح کی کس قدر اہمیت ہے، گناہ کی حیثیت اور اس کا عذاب یہ اپنی جگہ ایک مستقل مسئلہ ہے، لیکن لوگوں میں اس کو گاتے پھرنا، اس کا تعلق معاشرت کے فساد سے بھی ہے۔

بچوں کی اسلامی تربیت کرنا اسلامی معاشرت کا بنیادی پتھر ہے

(۲۴) عَنْ اَيُّوْبَ بْنِ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ۔ (رواہ الترمذی والبیہقی فی شعب الایمان وقال الترمذی وہذا عندی حدیث مرسل مشکوٰۃ ۴۲۳)

ترجمہ: ایوب بن موسیٰ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی والد نے اپنے لوزِ نظر (یعنی لڑکے) کو اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دیا کہ اس کو (اسلام کے بہترین) آداب سکھائے۔

شرح: افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے عمومی لحاظ سے مسلمانوں کے دو طبقے ہیں' ایک تو وہ جن کے بچے یتیموں کی طرح کسی تربیت کے بغیر یونہی خودرو پودوں کی طرح پل رہے ہیں۔ جس سانچے میں وہ چاہیں ڈھل جاتے ہیں' دوسرے وہ جن کی پرورش اگر غور دپرداخت کے ساتھ ہوتی ہے تو ان میں کوٹ کوٹ کر کفر کے آداب بھرے جاتے ہیں یہی راز ہے کہ آج آفاقِ عالم میں جدھر نظر اٹھائیے فاتح مسلمان ہر جگہ مفتوح نظر آتے ہیں حتیٰ کہ اس وقت خیالی دنیا سے ہٹ کر اگر خارجی دنیا پر نظر ڈالی جائے تو پھر مسلمان اور کافروں کے درمیان کسی شخص کو ترقی یافتہ بلاد میں اکثر تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؏

مَردے از غیب برون آید وکارے بکند

خوب یاد رکھیئے کہ کسی معاشرہ کی تبدیلی کی بنیاد اگر ڈالی جاسکتی ہے تو اس کا زمانہ بھی عہدِ طفولیت ہے' اس کے بعد بچوں میں جو معاشرت پیدا ہو جاتی ہے اس کا انقلاب بہت مشکل ہے اور اس کی تمام ذمہ داری عقلاً و شرعاً بچوں کے والدین پر عائد ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ قدرت تو ہر بچہ کو دین فطرت ہی پر پیدا فرماتی ہے لیکن اس کے والدین ہی اس کی فطرت کو مسخ کر کے اس کو یہودی' نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ آپ یہاں جھگڑیئے مت' بلکہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیجئے کہ کیا ہماری معاشرت کا انقلاب ہمارے بچوں سے شروع نہیں ہوا اور کیا اس کی بنیاد خود ان کے والدین کے سوا باہر سے کوئی اور شخص ڈالنے آتا ہے۔ کتنی غیرت کا مقام ہے کہ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جہاں کفار ہمارا اپنے ساتھ رہنا سہنا بھی پسند نہیں کرتے اور مکھی کی

طرح ذلیل سمجھ کر ہم کو اپنے درمیان سے نکال کر علیحدہ پھینک دینا چاہتے ہیں۔ پھر ہماری غیرت کیسے گوارا کرتی ہے کہ ہم اپنی معاشرت چھوڑ کر ان دشمنوں کی معاشرت کو اختیار کریں بلکہ اس کو اپنا فخر سمجھیں۔ یاد رکھیئے کہ یہ قدم ترقی کی بجائے آپ کو ہلاکت کی طرف لئے جا رہے ہیں۔

اسلام کی نظر میں عقل انسانی کا وہ مقام ہے کہ عبادت کے ثواب کی تقسیم اسی جوہر کے مراتب پر ہے، (بے عقل شریعت کا مخاطب ہی نہیں)

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَکُوْنُ مِنْ اَھْلِ الصَّلٰوۃِ وَالصَّوْمِ وَالزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَالْعُمْرَۃِ حَتّٰی ذَکَرَ سِھَامَ الْخَیْرِ کُلَّھَا وَمَا یُجْزٰی یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِلَّا بِقَدْرِ عَقْلِہٖ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی دیتا ہے اور حج و عمرہ بھی کرتا ہے یہاں تک کہ جتنے خیر کے اعمال تھے آپؐ نے سب ہی ذکر فرمائے لیکن آخرت میں جو ثواب اس کو ملتا ہے وہ صرف اس کے علم و عقل کے مطابق ملتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

شرح: دنیا میں آج بھی یہی دستور ہے کہ کسی انسان کی ظاہری مشقت و محنت پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ اس کی عقل و فہم پر نظر کی جاتی ہے اسی لئے چھوٹے درجہ کے ملازمین کو دیکھیئے کہ وہ کتنی مشقت اٹھاتے ہیں اور اس کے بدلہ میں تنخواہ کتنی کم ملتی ہے اور اونچے ملازمین کتنی راحت سے ایر کنڈیشن کمروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور ان کو تھوڑے وقت میں تنخواہ کتنی بڑی ملتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریعتِ مطہرہ میں عقل انسانی کو کتنی اہمیت دی گئی ہے یہاں کام کی کثرت پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ ضبط و آئین یعنی بر وقت ادائیگی، کیفیت اور اس

قسم کے امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے کا ثواب صحابہ کرامؓ کے مٹھی بھر جَو کے صدقہ کے ثواب کے مقابلہ میں کم ہے۔ تو جو شریعت عقل کا اتنا لحاظ رکھتی ہو بلکہ بے عقل سے خطاب ہی نہ کرتی ہو جیسے بچہ، مجنون وغیرہ، ایسی شریعت کے متعلق یہ غلط فہمی کہ اس کے احکام پر عمل کرنا صرف بے عقلوں اور بے وقوفوں کا حصہ ہے کتنی بے عقلی ہے، ایک پی۔ انے، ایم۔ اے یا ایک کروڑ پتی تاجر دنیا کے دائرہ میں کتنا ہی عقلمند سمجھا جائے لیکن شریعت کی نظر میں اس کا نام بے وقوفوں کی فہرست میں ہے اگر وہ خدا کی عطا کردہ فہم وبصیرت کو اس کے صحیح محل میں صرف نہ کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا افسر غیر متعلق شعبوں میں اپنے وقت اور تجربہ کا بہترین حصہ صرف کرے اور اپنے متعلقہ شعبے کو معطل کردے تو حکومت کی نظر میں اس کی لیاقت کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

میرے ان متفرق کلمات پر اگر آپ غور کریں گے تو شریعت مطہرہ کے متعلق آپ کے دل سے بہت سی بدگمانیاں دور ہوجائیں گی اور یہ یقین ہوجائے گا کہ دین کا میدان بے عقلوں کے حوالے کرنے کا نہیں تھا اس میں اہلِ عقل کو آنا چاہیئے مگر حسرت ہے کہ معاملہ برعکس ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل باید"

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند

کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شد

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (اسی میں عبرت ہے دیکھنے والوں کو) (پارہ ۳ رکوع ۱۰)

اسلامی معاشرتی زندگی کے چند اہم ارکان

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا ذَرٍّ لَا عَقْلَ کَالتَّدْبِیْرِ وَلَا وَرَعَ کَالْکَفِّ وَلَا حَسَبَ

كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۳۰)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر: سوچ سمجھ کر کام کرنے سے بڑھ کر دانشمندی کی بات کوئی اور نہیں ہے اور جن باتوں سے شریعت نے روکا ہے، اس سے باز رہنا اس سے بڑھ کر کوئی تقویٰ نہیں اور اخلاق اچھے ہوں اس سے زیادہ اور کوئی شرف کی بات نہیں۔

شرح: حدیث کے ان تین مختصر جملوں میں معاش اور معاد کے سب اصول جمع کر دیئے گئے ہیں بشرطیکہ عقل سلیم اور نور بصیرت کے ساتھ، آپ ان کو غور کے ساتھ پڑھیں اور ان کا مطلب سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں، یہاں صرف ایک مختصر جملہ یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوام نہیں بلکہ بعض مرتبہ خواص بھی عبادت کی کثرت پر نظر کرکے اسی کو معراجِ تقویٰ تصور کر لیتے ہیں، حالانکہ بعض مرتبہ ان عبادات کے ساتھ شیطانی اغواء سے ایسی ایسی لغزشیں ہو جاتی ہیں جو ان تمام عبادات کے ثواب کو برباد کر دیتی ہیں

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا، جانتے ہو مفلس کون ہے؟ انھوں نے وہی جواب دیا جو سب کو معلوم ہے، یعنی یہ کہ مفلس وہ ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں بلکہ مفلس وہ ہے جو قیامت میں ہر قسم کی عبادتیں لے کر حاضر ہوگا، لیکن اس کی یہ تمام عبادتیں دوسروں کے حقوق کے عوض میں تقسیم کر دی جائیں گی اور وہ خالی کھڑا رہ جائے گا یہ ہے درحقیقت مفلس، جس کے پاس سب کچھ ہو لیکن بوقت ضرورت کچھ نہ رہے۔

اس لئے حدیث میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ تقویٰ کا معیار یہ ہے کہ تمام منہیاتِ شرعیہ سے پرہیز کرے، محرمات تو درکنار مشتبہ کاموں کے پاس بھی نہ بھٹکے، اس کے بعد اگر عبادتیں بھی نصیب ہو جائیں تو یہ سونے پر سہاگہ ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ اگر خطرناک مریض دوا کے ساتھ پرہیز نہیں کرتا تو اس کے لئے شفا کی امید رکھنا بیکار ہے وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ

اسلام میں زندگی کی عام خوشحالی کے لئے چیدہ چیدہ نکتے

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَالتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ وَحُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۳۰)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو میانہ روی کے ساتھ خرچ کرنا آگیا اس کو عمدہ زندگی بسر کرنے کا نصف طریقہ ہاتھ آگیا اور جس کو لوگوں میں اُنس ومحبت کے ساتھ رہنا آگیا اس کو نصف عقلمندی کی بات آگئی اور جس کو فہم وسلیقے سے سوال کرنا آگیا اس کو نصف علم نصیب ہوگیا۔

تشریح: آمد وخرچ کے توازن کا لحاظ رکھنا موجودہ فنِ اقتصادیات کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے اور لوگوں سے اُنس ومحبت کے ساتھ رہنا، اسی میں تمام حسنِ معیشت کا راز مضمر ہے اور سلیقے سے سوال کرنا نصف علم اس لئے ہے کہ بے علم کا سوال ہمیشہ بے معنیٰ ہوتا ہے اور اس کے جواب سے بہتر سکوت کرنا ہوتا ہے اور بامعنیٰ سوال بعض اوقات جواب دینے والے کے لئے ایک نئے علم کا باب کھول دیتا ہے، حدیثوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ کسی شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھا سوال کیا تو اس کے جواب میں وحی ربانی نازل ہوگئی اور آپؐ نے ایسے سائل کی تعریف کی۔

عبادتِ الٰہی اور اس میں غیر اللہ کا تصور اسلام میں ناقابل برداشت ہے (غیر اختیاری طور پر کسی کی عبادت ظاہر ہوجائے تو ریا میں شامل نہیں)

(۲۸) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَيُحِبُّهُ النَّاسُ عَلَيْهِ قَالَ تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ۔

(رواہ مسلم ،مشکوٰۃ ص ۴۵۴)

ترجمہ: حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اگر ایک شخص کوئی نیک عمل کرے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کریں اور اس سے محبت رکھیں تو یہ ریاء میں تو داخل نہیں؟ آپؐ نے جواب دیا یہ تو مسلمان کے لئے دنیا ہی میں نقد بشارت ہے۔ (آخرت کا اجر محفوظ ہے)

شرح: بنیادی لحاظ سے کسی عبادت کے اخلاص سے یا ریاکاری کے لئے ہونے کا دار ومدار اس عمل کے شروع کرنے کے وقت اس کی نیت پر ہے، اگر عبادت شروع کرنے کے وقت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے تھی اور اتفاقاً اس کی اس مخلصانہ عبادت کو کسی نے دیکھ لیا تو اس کی عبادت میں کوئی نقص تو پیدا کیا ہوتا بلکہ اس کے لئے یہ باعثِ بشارت ہے کہ قدرت نے غیب سے اس کی نیکی پر ایک گواہ پیدا فرمادیا، اس لئے اگر خدا تعالیٰ کے اس انعام پر وہ خوش ہو تو اس کو خوش ہونا چاہیئے کیونکہ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ خدانہ کرے کسی بُرے عمل میں مبتلا ہوتا اور کسی شخص کے بے خبری میں آجانے سے اس کا راز افشا ہوجاتا، اب اس کی بجائے اگر کچھ ظاہر ہوا تو اس کا عملِ خیر ظاہر ہوا جس میں اس کا کوئی اختیار نہ تھا۔

(۲۹) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللهِ بَیْنَا اَنَا فِیْ بَیْتِیْ فِیْ مُصَلَّایَ اِذْ دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ فَاَعْجَبَنِی الْحَالُ الَّتِیْ رَاٰنِیْ عَلَیْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَكَ اللهُ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ لَكَ اَجْرَانِ اَجْرُ السِّرِّ وَ اَجْرُ الْعَلَانِیَةِ۔ رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب مشکوٰۃ ص ۴۵۴)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں اپنے گھر کے اندر اپنی جائے نماز پر نماز پڑھ رہا ہوں اور دفعۃً کوئی شخص گھر کے اندر آجائے تو مجھ کو اس بات پر خوشی ہو کہ اس نے مجھ کو حالتِ نماز میں دیکھا تو

کیا یہ ریاء میں شامل ہے، آپؐ نے فرمایا ابوہریرہ خدا تجھ پر رحم فرمائے، یہ ریاء کیوں ہوگی تجھ کو تو دو اجر ملے، ایک خفیہ عبادت کرنے کا کہ تو گھر کے اندر نماز پڑھ رہا تھا اور دوسرا کھلم کھلا عبادت کرنے کا۔

خدائے قدوس کی بارگاہ میں حکمت آمیز باتوں والے شخص کے کلام کی بھی کوئی اہمیت نہیں وہاں صرف نیت وارادہ دیکھا جاتا ہے

(۳۰) وَعَنِ الْمُهَاجِرِ بْنِ حَبِيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِنِّيْ لَسْتُ كُلَّ كَلَامِ الْحَكِيْمِ أَتَقَبَّلُ وَلٰكِنِّيْ أَتَقَبَّلُ هَمَّهُ وَهَوَاهُ فَإِنْ كَانَ هَمُّهُ وَهَوَاهُ فِيْ طَاعَتِيْ جَعَلْتُ صَمْتَهُ حَمْدًا لِّيْ وَوَقَارًا وَإِنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ۔ (رواہ الدارمی، مشکوٰۃ ص ۴۵۶)

ترجمہ: حضرت مہاجر بن حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں میں ہر حکمت آمیز باتوں والے شخص کے کلام کی کچھ قدر نہیں کرتا، میں تو اس کے ارادہ اور اس کی نیت کو دیکھتا ہوں اور اسی کو قبول کرتا ہوں، اگر اس کی نیت میری فرمانبرداری کی ہوتی ہے تو میں اس کی خاموشی کو بھی اپنی تعریف اور اس کے لئے باعثِ وقار بنا دیتا ہوں، اگرچہ وہ اپنی زبان سے ایک حرف بھی نہ بولے۔

یہ قدرت کا قانون ہے کہ وہ ہر خفیہ سے خفیہ نیک و بد عمل کو ظاہر کر کے رہتی ہے اس لئے جرم کا اخفاء اور عملِ خیر میں ریاء دونوں عبث ہیں۔

(۳۱) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ أَنَّ رَجُلًا عَمِلَ عَمَلًا فِيْ صَخْرَةٍ لَّا بَابَ لَهَا وَلَا كُوَّةَ خَرَجَ عَمَلُهُ إِلَى النَّاسِ كَائِنًا مَّا كَانَ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۵۶)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اگر کوئی شخص ایسے پتھر کے اندر بیٹھ کر جس میں کوئی دروازہ اور کوئی سوراخ نہ ہو نہ چھوٹا نہ بڑا، کوئی بھی عمل کریگا تو وہ لوگوں پر ظاہر ہو کر رہے گا، خواہ وہ عمل اچھا ہو یا بُرا۔

شرح: ان مختصر الفاظ میں بہت عجیب انداز پر یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ جب ہزار اخفاء کے باوجود قدرت کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ہر قسم کے عمل کو خود ظاہر کر کے رہے گی تو پھر کسی عبادت گذار کو ریار کاری کی نیت کر کے اپنا عمل برباد کرنے سے فائدہ کیا اور کسی بدکار کا اپنی بدکاری کے اخفاء کا نتیجہ کیا۔ دونوں کی شہرت قدرتاً ہو کر رہے گی اور اس پر اپنے اپنے عمل کے نتائج دونوں جہان میں مرتب ہو کر رہیں گے۔

خیر و شر کے اثرات جب ترقی کرتے ہیں تو دنیا میں انسانی اعضاء پر بھی نمودار ہوتے ہیں

(۳۲) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ سَرِيْرَةٌ صَالِحَةٌ اَوْ سَيِّئَةٌ اَظْهَرَ اللّٰهُ مِنْهَا رِدَاءً يُعْرَفُ بِهٖ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۵۶)

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بھی کوئی خفیہ عمل کرے گا خواہ وہ نیک ہو یا کہ بد، اللہ تعالیٰ اس کے آثار اس کے چہرہ پر ظاہر کر کے رہے گا، جس کی وجہ سے وہ عوام و خواص میں شناخت کر لیا جائے گا کہ وہ نیک شخص ہے یا بد۔

شرح: حقیقت یہ ہے کہ اعمال انسانی اعضاء انسانی میں اپنے اثرات چھوڑ دیتے ہیں اور جیسا کہ ظاہر بین سمجھتے ہیں وہ موجود ہو کر فنا نہیں ہو جاتے اور رفتہ رفتہ یہ اثرات اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ انسانی چہرے پر بھی چمکنے لگتے ہیں، جن کو دنیا میں بھی قیافہ شناس پہچان لیتے ہیں۔ ایک مؤمن کے ایمان کا نور اور ایک فاسق کے فسق کی ظلمت کو ہر ذی فہم کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہے۔ جب دنیا میں یہ حال ہے تو اگر آخرت میں ہمارے اعضاء اپنی زبان

قال سے اپنے اعمال کی شہادت دیں تو یہ کوئی تعجب کی جگہ نہیں اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے ان کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے) (پارہ ۲۳ رکوع ۳)

خلاصہ یہ ہے کہ کفار قیامت میں جب اپنی بداعمالیوں سے انکار کریں گے تو اُن کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور خود ان کے اعضا ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

انسانی خوف سے یا خوشامد میں اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کہنا یا کرنا انتہائی پستی واحساس کمتری کی دلیل ہے

(۳۳) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَكُوْنُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ اَقْوَامٌ اِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ اَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ قَالَ ذٰلِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰى بَعْضٍ وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ۔

(رواہ احمد۔ مشکوٰۃ ص ۴۵۵)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ظاہر پرست اور صرف نمائش کے بندے ہوں گے اور اصلاح باطن کے دشمن ہوں گے، اس پر کسی سائل نے عرض کیا کہ ایسی غلط باتیں کیونکر ہوں گی۔ آپ نے فرمایا کسی کی خوشامد کے لئے اور کسی کے ڈر کے مارے (یعنی خدا کی رضا جوئی اور اس کے خوف کا خیال کسی کے دل میں نہ ہوگا)۔

خاکساری اور تکبر کے دنیوی ثمرات شرعی نظر میں

(۳۴) عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَقُوْلُ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِيْ نَفْسِهٖ صَغِيْرٌ وَّ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ عَظِيْمٌ وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيْرٌ وَّ فِيْ نَفْسِهٖ كَبِيْرٌ حَتّٰى لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِّنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِيْرٍ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۳۴)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر تشریف لا کر لوگوں سے خطاب کیا کہ دیکھو باہم ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو بلند فرمائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص اپنی نظروں میں تو حقیر لیکن دوسروں کی نظروں میں معزز ہوگا اور جس شخص نے تکبر اور بڑائی کی خصلت اختیار کی تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا نیچا دکھلائے گا کہ وہ صرف اپنی ہی نظروں میں بڑا ہوگا لیکن لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار ہوگا، یہاں تک کہ کتے اور سور سے بھی بدتر۔

اسلام میں ہر جگہ زبان سنبھال کر بولنے کی تاکید ہے، پھکڑ بازی تو نہایت مذموم صفت ہے اور وقار کے بھی خلاف ہے

(۳۵) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِّضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَّرْفَعُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَاتٍ وَّاِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا يَهْوِيْ بِهَا فِيْ جَهَنَّمَ۔ رواہ البخاری و فی روایۃ لهما يهوى بها فى النار ابعد ما بين المشرق والمغرب۔

(مشکوٰۃ ص ۴۱۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنی زبان سے مذاق میں ایک ایسا کلمہ اپنے منہ سے نکال دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا سبب بن جاتا ہے بس اس ایک کلمہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے

درجے بلند فرما دیتا ہے۔ اور اسی طرح بندہ صرف مذاق میں کبھی اپنے منہ سے ایک ایسا کلمہ نکال دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ دوزخ کے اندر جا پڑتا ہے۔

(مشکوٰۃ ص ۴۱۱)

تشریح: اس حدیث میں ایک طالب آخرت کے لئے یہ اہم سبق ہے کہ مسلمانوں کے لئے عام گفتگو میں بھی اپنی زبان کو آزاد رکھنا مناسب نہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آدمی بعض مرتبہ صرف احباب کی دلچسپی اور ہنسی و مذاق کے اندر کوئی کلمہ اپنے منہ سے نکال بیٹھتا ہے اور اس کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس کا نتیجہ کیا نکل کر رہے گا اب آپ حدیث کی اس احتیاط کو دیکھئے اور دوسری طرف ہماری بدلگامی کا نظارہ کیجئے تو آپ کو اسلامی وقار و متانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کسی غیر مستحق کی مبالغہ آمیز تعریف کرنی خدائی غصہ کا سبب ہے اور نظامِ دنیا میں بھی خلل اندازی کا موجب ہے

(۳۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَ اھْتَزَّ لَہُ الْعَرْشُ

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۴۱۴)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی فاسق آدمی کی تعریفیں کی جاتی ہیں تو پروردگارِ عالم کو اتنا غصہ آتا ہے کہ عرشِ عظیم اس کی وجہ سے کانپ اٹھتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۴۱۴)

تشریح: فاسق جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تذلیل کا مستحق ہے اس کی مدح سرائی کرنا کیا رب العزت کا صریح مقابلہ نہیں اور کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں کہ دنیا میں فسق اور ترقی کرتا جائے۔ اس لئے کسی فاسق کی تعریف میں احتیاط رکھنی بہت لازم ہے اور اگر دفع ضرر کے لئے کہیں کچھ کہنا پڑ جائے تو اس کو بھی بقدرِ ضرورت ہی کہنا چاہیئے، زیادہ مبالغہ کی نہ تو ضرورت ہے

اور نہ اس کا فائدہ ہے، آخر انسان کو خود بھی اپنی شخصیت کا کچھ احترام ملحوظ رکھنا اس کے شرف کا تقاضا ہے یا نہیں۔

اسلام میں محبت کرنے کی بڑی اہمیت ہے اور اس کا معیار بہت بلند ہے

(۳۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان وقال الترمذی ھذا حدیث حسن وقال النووی اسنادہ صحیح۔ (مشکوٰۃ ص ۴۲۶)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا درکھو آدمی کا دین وہی ہوجاتا ہے جو اس کے خاص دوست کا دین ہوتا ہے، اس لئے جب کسی سے دوستی کرنا تو خوب دیکھ بھال کر کرنا کہ کیسے شخص سے دوستی کر رہے ہو۔

اس حدیث کے ساتھ حضرت ابو درداءؓ والی روایت ملا لینے سے اس کا مطلب خوب واضح ہوجاتا ہے۔

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ (رواہ ابوداؤد مشکوٰۃ ص۴۱۹)

ترجمہ:۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ محبت بھی عجیب بلا ہے، آدمی کو اندھا، بہرا بنا دیتی ہے۔

شرح: انسان کی یہ فطرت دین و دنیا میں برابر ہے، اگر محبت دنیا کیلئے ہو تو وہ اس کی محبت میں اندھا ہوجاتا ہے اور اگر محبت اللہ اور رسولؐ کی ہو تو یہاں بھی اس کی حالت یہی ہو جاتی ہے اور اس کو دلیل و بحث کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، وہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرمان پر اندھا اور بہرا ہو کر اس کی اتباع کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔

اس حدیث سے حدیث نمبر ۳۷ کی شرح خود بخود واضح ہوجاتی ہے یعنی دوستی کا نتیجہ

جب یہ ہو کہ آدمی کی نظر میں عیب و ہنر کا فرق نہ رہے بلکہ اپنا دین بھی وہی بن جائے جو اپنے دوست کا دین ہو تو پھر دوستی کرنے میں کتنی احتیاط لازم ہے۔

اب اس پر غور کر لیجئے کہ کافروں کے ساتھ دوستی کرنا اسلامی نظر میں کس درجہ خطرناک ہے، اسلام میں کافروں کے ساتھ معاملہ کرنے اور عام انسانی حقوق کی ادائیگی کی ممانعت نہیں، بلکہ جس چیز کی ممانعت ہے وہ دلی محبت ہے کیونکہ اس کا نتیجہ دینی تبدیلی بھی ہو سکتا ہے اس لئے ہوشیار رہیئے خدانہ کردہ ایسا نہ ہو جائے کہ ؎

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

اسلام میں مساوات اور فرقِ مراتب کی رعایت دونوں معاشرت کے قیام کے لئے ضروری ہیں

(۳۸) عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔ رواہ ابو داؤد (مشکوٰۃ ص ۴۲۴)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں سے ان کی حیثیت اور رتبہ کے موافق معاملہ کیا کرو۔

شرح: ادنیٰ شخص خاطر مدارات کو جب جانتا ہی نہیں تو اس سے خوش کیا ہو سکتا ہے، لیکن اچھی حیثیت کا آدمی اس کو خوب سمجھتا ہے، اس لئے اس سے خوش بھی ہوتا ہے، اور اس کے لئے باعثِ محبت بھی ہوتا ہے۔ شریعت کا مقصد نہ یہ ہے کہ کسی کی ادنیٰ سی توہین کی جائے اور نہ یہ ہے کہ کسی کی صرف دنیوی لحاظ سے ادنیٰ سی خوشامد کی جائے، بلکہ مقصد ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ اس کی فہم و فطرت کے مطابق ایسا برتاؤ سکھانا ہے جو عام طور پر مسلمانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ انس و محبت کی زیادتی کا باعث بنے، اور یہ جو کچھ بھی ہو صرف اخلاص سے اور لوجہ اللہ ہو۔ کیا اس حدیث میں اعلیٰ سے اعلیٰ معاشرت کی تعلیم نہیں، اس روایت کی تفصیل ابو داؤد میں موجود ہے۔

اسلام اخوت و مساوات اور فرق مراتب دونوں کی تعلیم دیتا ہے ان دونوں کو جمع کرنا اہلِ فہم کے نزدیک کوئی مشکل بات نہیں، جن امور میں مساوات ضروری ہے وہ اسلام کے عام حقوق ہیں اور جن میں فرقِ مراتب رکھا گیا وہ آدمیوں کے طبقات کے لحاظ سے ان کی تہذیب وتمدن کے مراتب ہیں۔

بدعت کی ایجاد کا ایک اندرونی راز اور اس سے احتراز کرنے کی اہمیت

(۳۹) رُوِیَ عَنْ اَبِیْ بَکْرِنِ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اِبْلِیْسَ قَالَ اَھْلَکْتُھُمْ بِالذُّنُوْبِ فَاَھْلَکُوْنِیْ بِالْاِسْتِغْفَارِ فَلَمَّا رَاَیْتُ ذٰلِکَ اَھْلَکْتُھُمْ بِالْاَھْوَاءِ فَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ فَلَا یَسْتَغْفِرُوْنَ۔ رواہ

ابن عاصم وغیرہ۔ (الترغیب والترہیب جلد ۱ ص ۸۷)

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابلیس نے کہا۔ گناہ کراتے کراتے آدمیوں کی کمریں میں نے توڑ دیں اور توبہ کر کر کے انھوں نے میری کمر توڑ دی، جب میں نے یہ مصیبت دیکھی تو میں نے ان کو بدعتوں میں پھنسا دیا تاکہ وہ یہی سمجھتے رہیں کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں، اس لئے توبہ ہی نہ کرنے پائیں۔

تشریح: اس حدیث سے بدعت کی ایجاد کا راز کھل گیا اور جن حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدعتی کی توبہ قبول نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اپنی بدعت سے توبہ نہ کرے، اس کی ایک توجیہ بھی نکل آئی کہ بدعتی جب اپنی بدعت کو سنت اور حسنہ سمجھتا ہے تو اس سے توبہ ہی نہیں کرتا۔ اگر توبہ کرتا تو قبول ہوتی۔

اسلام میں خدا اور رسول کی محبت کا معیار خالی جذبات نہیں بلکہ عملی قربانیاں بھی ہیں اور یہی کٹھن ہے

(۴۰) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ قُرَادٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

تَوَضَّأَ یَوْمًا فَجَعَلَ اَصْحَابُهٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا یَحْمِلُکُمْ عَلٰی هٰذَا قَالُوْا حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْ یُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَالْیُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا اُؤْتُمِنَ وَلْیُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۔ (مشکوٰۃ ص ۴۲۴)

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن قراد بیان کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کے وضو کے پانی پہ ٹوٹ پڑے اور اس کو لے کر اپنے جسموں پر تبرکاً ملنے لگے، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم یہ کام کیوں کر رہے ہو، انھوں نے عرض کیا کہ صرف خدائے تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی محبت کے جذبہ ہیں، اس پر آپؐ نے فرمایا اچھا تو جس کو یہ بات اچھی معلوم ہو کہ وہ ٹھیک ٹھیک خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ خود اس سے محبت کرنے لگیں تو اسے چاہیئے کہ جب بات کرے تو سچی بات کیا کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس کو پورا پورا ادا کیا کرے اور جو شخص بھی اس کا پڑوس اختیار کرے یہ اس کے ساتھ اچھا ہی معاملہ کرے۔

شرح: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جاں نثار صحابہؓ جب جذباتِ محبت سے آپؐ کے وضو کے پانی پر اس طرح بیتابانہ ٹوٹ پڑے تھے تو ان کا سب سے بڑا قدرداں ان کو خوب سمجھ رہا تھا، لیکن آپؐ کو ان کی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی اس لئے ان کی ہمت افزائی فرما کر شریعت کے ان چیدہ چیدہ اعمال کی ترغیب دی جن پر عمل کرنے سے محبت کی جڑیں ان کے دلوں میں زیادہ گہری ہو جائیں یعنی یہ کہ محبت میں صرف وقتی جذبات ہی کو معیار نہ بنا لینا چاہیئے۔

وضو کے پانی پر اس طرح دیوانہ وار ٹوٹ پڑنا بیشک بڑی محبت ہے مگر پھر بھی یہ

ایک وقتی جذبہ ہی ہے، بات تو یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں اس کی مخلوق کے ساتھ ایسے محبت کے اعمال کرنے کا خوگر ہو جن میں ایک محبت کے پھندے میں پھنسا ہوا شخص بھی وقت پر کوئی نہ کوئی حیلہ تراش لیتا ہے، مثلاً یہ کہ کسی موقعہ پر سچ بولنے میں نقصان ہوتا ہو تو سچ ہی بولا جائے، اور اگر کسی کی امانت ادا کرنے میں طبیعت کو کتنا ہی بخل محسوس ہو تو اس کو خوش دلی سے پورا پورا ادا کیا جائے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی سلوک کرے جس کی داد خود اس کے منہ سے بھی نکل جائے، یہ ہے خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت۔

دعوئے محبت اسی وقت سچا ثابت ہوگا جب اپنے نفع ونقصان سے بے نیاز ہو کر دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرے جو محبوب کی نظر میں محبوب ہو۔ شیطان خدائے تعالیٰ کو سجدہ کرنے سے کبھی انکاری نہیں ہوا لیکن آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا جب حکم ہوا تو یہاں آکر وہ صرف ناکام ہی نہیں رہا بلکہ ابدی ملعون ٹھہر گیا۔ مدعیانِ محبت اس حدیث کو غور کے ساتھ پڑھیں اور یہ خوب سوچیں کہ صرف ایک نعت پر رقص کرنے سے کیا وہ اپنی محبت کے دعوے میں خدا اور اس کے رسولؐ کی نظروں میں سچے ثابت ہو سکتے ہیں، محبت دیوانگی کا نام ہے اور اس کا امتحان بھی ہوتا ہے، جو امتحان میں کامیاب ہوا وہ خوش نصیب ہے اور جو ناکام رہا اس سے بڑھ کر بدنصیب کوئی نہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے) (پارہ ۲۰ رکوع ۱۳)

مطلب یہ ہے کہ لوگ کیا صرف زبانی ایمان کا دعویٰ کر کے چھوٹ جائیں گے اور ان کا کوئی امتحان نہ لیا جائے گا، نہیں نہیں ضرور لیا جائے گا حتیٰ کہ امت میں جو سب سے

افضل تھے ان کا امتحان بھی لیا گیا اور وہ سب سے سخت لیا گیا، وہ امتحان بھوک کا امتحان ہی نہ تھا بلکہ جان و مال لٹا دینے کا امتحان تھا اور وہ بھی منہ بنا کر نہیں بلکہ ہنس ہنس کر۔

دی کس خوشی سے جان تہِ تیغ داغ نے
لب پہ تبسم اور نظر یار کی طرف

خدائے تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو اپنے اور اپنے سب سے افضلِ رُسل سیّدِ کل حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سچی اور پکی محبت بخش دے اور اتباعِ سنت کا وہ ذوق بخشے کہ بال برابر اس سے ہٹنا پہاڑ نظر آنے لگے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۚ

فہرست مضامین جواہرالحکم حصّہ سوم

جواہر الحکم حصّۂ سوم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا

انسان بڑی مشکل سے کامل انسان بنتا ہے اس کو ضائع کر دینا صرف اپنی قوم کا نقصان نہیں، بلکہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا النَّاسُ کَالْاِبِلِ الْمِائَۃِ لَا تَکَادُ تَجِدُ فِیْہَا رَاحِلَۃً (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۴۵۸)

ترجمہ:۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے سو اونٹ کہ ان میں سواری کے لیے سانڈنی بمشکل ایک ملتی ہے (بقیہ سب لدّو ہوتے ہیں یعنی بوجھ اٹھانے کے کام کے)

شرح:۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اسلام سے قبل انسان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ جنگ و جدل، آبروریزی و خونریزی یہی ان کے قابلِ فخر اور مایۂ ناز کارنامے تھے ان کے نزدیک کسی قابلِ قدر انسان کو ذرا سی بات پر قتل کر ڈالنا ہی اس کی بڑی قدردانی تھی، چنانچہ خوشی اور میلوں میں جب کبھی وہ اپنے فخریہ کارنامے بیان کرتے تو انہی انسانیت سوز حرکات کا تذکرہ کیا کرتے تھے، رہ گئی غریب عورت تو اس کا تو وجود ہی ان کے عقیدہ میں باعثِ ننگ و عار تھا، حتیٰ کہ ایک مشفق باپ اپنی لختِ جگر لڑکی کو اپنے ہاتھوں اسی لیے جب تک زندہ درگور نہ کر لیتا اس وقت تک اطمینان کے سانس نہ لیتا تھا لیکن جب اسلام آیا تو اس نے انسان کو انسان کی قیمت سے پہلی بار روشناس کرایا۔

اب ذرا سوچیے کہ ماحول کیا ہے اور مسئلہ کتنا کٹھن ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ تفہیم کتنا مؤثر اور دلوں میں اتر جانے والا تھا یعنی یہ کہ تم اونٹ کی قیمت تو جانتے ہی ہو۔ اس پر کبھی کبھی ذراسی دیر میں قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے ہیں پھر ان میں سانڈنی کی قیمت جاننے والا تم سے بڑھ کر اور کون ہوگا۔ سن لو کہ عام انسان عام اونٹوں سے کم نہیں، اور جو اُن میں لائق افراد ہیں وہ ایک سانڈنی کی قیمت سے کم نہیں، جس طرح ایک سانڈنی سینکڑوں اونٹوں میں بمشکل دستیاب ہوتی ہے، اسی طرح ایک لائق انسان کہیں مدتوں میں جاکر لائق بنتا ہے، اس کی قدر دانی ہی انسانیت کا شرف ہے اور ذراسی بات پر اس کو قتل کر ڈالنا یہ شرف نہیں انسانیت پر بڑا داغ ہے۔

ایک مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر انسان کون ہے، آپؐ نے جو جواب اس کا ارشاد فرمایا وہ گو بہت سادہ تھا مگر بڑا فلسفیانہ بھی تھا۔ مختصر الفاظ میں آپؐ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ انسانوں کی مثال ایسی ہے جیسے سونے چاندی کی کانوں کی، عمدہ کان سے جو سونا برآمد ہوتا ہے صاف ہونے کے بعد وہی بڑھیا کہلاتا ہے۔ اور اسی طرح اس کا برعکس، تم اسی پر انسانوں کو قیاس کر لو کہ اسلام میں سب سے زیادہ بہتر وہی ہے جو زمانۂ کفر میں تم میں سب سے بہتر شمار ہوتا تھا، اسی لیے آپؐ کی دعا یہ تھی کہ الٰہی اسلام کو عزت دے یا عمر کو اسلام کی توفیق بخش کر، یا ابوجہل کو، اب آگے یہ کام قدرت کا تھا کہ وہ اس سعادت کے لیے کس کا انتخاب کرتی ہے۔

پھر اس کے بعد عنقریب ہی وہ دعا حضرت عمرؓ کے لیے مستجاب ہوئی اور سب کو معلوم ہے کہ اس کے بعد فوراً اسلام کے ضعف و ناتوانی کا نقشہ کتنی جلد قوت و شوکت کی صورت میں بدل گیا، عمر فاروقؓ کو دنیا جانتی ہے لیکن ان کے علاوہ اسلام کے میدان میں دوسرے شہسواروں کی بھی کچھ کمی نہ تھی، خالد بن ولیدؓ، ابوسفیانؓ، ثمامہؓ اور اُن

جیسے اور بڑے مشاہیر بھی موجود تھے جن سے ابتدا میں اسلام کو سخت سے سخت نقصانات پہنچے، لیکن کبھی آپؐ نے اس کا خیال بھی نہیں کیا کہ ان کے قتل کے متعلق کوئی حیلہ و تدبیر کی جائے، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سب قیمتی افراد ایک دن اسلام کے لیے انتہائی قابل فخر ثابت ہوئے اور بڑی بڑی فتوحات کے مالک بنے۔

اس جگہ اس تاریخ کو دہرانا منظور نہیں لیکن حضرت وحشیؓ کا قصہ ذکر کیے بغیر قلم نہیں رک سکتا جنھوں نے زمانۂ کفر میں سیدنا حمزہؓ جیسی قیمتی شخصیت کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا، لیکن اپنے اس محبوب چچا کے انتقام لینے کے لیے بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی ارادہ نہیں فرمایا، حتیٰ کہ وہ مشرف باسلام ہوئے اور آپ کے دامنِ عفو میں ان کو بھی پناہ مل گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہی تھے جنھوں نے مسیلمہ کذاب مدعیٔ نبوت کو قتل کیا اور وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح زمانۂ کفر میں مَیں نے بہترین شخصیت کو قتل کیا تھا اسی طرح اسلام لانے کے بعد بھی میں نے ایک بدترین شخص کو قتل کرکے اس کی کچھ نہ کچھ تلافی کردی ہے۔

افراد کا تو ذکر کیا ہے، فتح مکہ کے دن آپؐ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ جس فیاضانہ طریقہ پر عفوِ عام کا اعلان کیا اس طرح کی مثال ملنی مشکل ہے۔ خود آپؐ کے بیان کے بموجب جو سب سے تنگ وقت آپؐ کی زندگی میں آپؐ کے اوپر گذرا ہے وہ طائف کا دن تھا جبکہ آپؐ نے اہلِ مکہ سے مایوس ہوکر طائف کا اس امید پر رخ کیا کہ شاید وہ آپ کی دعوت کو قبول کرلیں، لیکن انھوں نے جس بے رحمانہ انداز میں آپؐ کو جواب دیا اس کی امید بھلا کس کو ہوسکتی تھی، اس مایوسی پر مایوسی اور ناکامی پر ناکامی سے جو کوہِ غم آپؐ پر ٹوٹا اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ آپؐ کی اس شکستہ دلی کا سماں دیکھ کر عالمِ بالا سے اس فرشتے کے نام جو پہاڑوں کے نظام کے لیے مقرر ہے، یہ پیغام پہنچا کہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر جو آپؐ کا حکم ہو اس کی تعمیل کرے، چنانچہ وہ فرشتہ حاضر ہوا اور آدابِ نبوت بجالا کر اس نے یہ عرض کی کہ حکم ہو تو ان دو پہاڑوں کو جن کے درمیان یہ بستی واقع ہے ملاکر انکو کچل ڈالوں؟

لیکن انسانیت کے اس سب سے بڑے قدردان نے اس حالت میں بھی جو جواب دیا وہ رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِیۡن کے سوا کسی سے ممکن نہ تھا، آپؐ نے فرمایا نہیں نہیں ایسا مت کرو، کیونکہ عجب نہیں کہ اگر آج نہیں تو کل ان میں کچھ ہونہار ایسے پیدا ہو جائیں جو اللہ کی توحید کا کلمہ بلند کریں۔

محض زبانی طور پر چند کلمات ادا کر دینا اور بات ہے لیکن اپنے دشمنوں کے ساتھ عملاً اتنی قدردانی کا سلوک کرنا یہ کم معجزہ نہیں۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر قریش جیسے اہلِ شرف تہِ تیغ کر ڈالے گئے تو پھر اسلام اگر اپنے اطراف و جوانب میں پھیلا بھی تو کیا، اور اگر یہ اصحابِ شرف اسلام میں داخل ہو گئے تو دوسرے لوگ خود بخود فطری طریقہ پر رام ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے۔

اسی عفوِ عام میں آپ کے مشن کی کامیابی کا راز مضمر تھا جس کو تیرہ سو سال بعد ابھی تھوڑا عرصہ ہوتا ہے جس کو کہ مسٹر کینیڈی اور مسٹر خروشیف سمجھے ہیں۔ پہلے دونوں نے مل کر عالم کی بربادی کے آلات تیار کیے لیکن چونکہ ابھی عالمِ تقدیر میں دنیا کی کچھ عمر باقی تھی اسلیئے اچانک یہ بات دماغوں میں پیدا ہو گئی کہ اگر بالفرض دنیا کے اکثر لائق افراد فنا کے گھاٹ اتر گئے تو بھیڑ بکریوں پر حکومت کر کے بھی کیا ہوگا، یہ بات دوسری ہے کہ ایک جماعت نے اس کو مسٹر کینیڈی کے عزم کا نتیجہ سمجھا اور دوسری جماعت نے مسٹر خروشیف کے ہوش و عزم کا، لیکن بانیٔ اسلام تیرہ سو سال قبل اس بات کو اپنے قول و عمل سے واضح فرما چکے تھے۔

کم از کم مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ حدیثوں کو عقیدت اور حقیقت کی نظر سے پڑھتے تو ان کی کوئی مشکل ایسی نہ تھی جو آسان نہ ہو چکی ہوتی، لیکن اس کا گلہ کس سے کیا جائے کہ وہ دوسروں کی اتباع و محبت میں اتنے ڈوب چکے ہیں کہ اپنے مذہب کی تعلیم کی طرف نظر اٹھانا بھی پسند نہیں کرتے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا

اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔[۱]

خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پیارا شخص وہ ہے جس کی نظر میں اس کی مخلوق سب سے زیادہ پیاری ہو

(۲) عَنۡ اَنَسٍؓ وَّعَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِؓ قَالَا قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اَلۡخَلۡقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الۡخَلۡقِ اِلَی اللّٰہِ مَنۡ اَحۡسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان وفی الباب احادیث صحاح ما یدل علیٰ ھذا المعنی۔ مشکوٰۃ ص ۴۲۵)

ترجمہ: حضرت انس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے عیال نہیں لیکن اس سے بڑھ کر اس کے لیے اس کی مخلوق ہے تو اس کی تمام مخلوق میں اللہ کو سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جس کی نظروں میں اس کی

[۱] میرے والد مرحوم و مغفور تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اسیر مالٹا حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہوا تو ایک بہت بڑے انگریز نے ان کے اعزا کے نام اپنی جانب سے تعزیتی پیغام بھیجا۔ والد مرحوم نے اس انگریز سے فرمایا کہ یہ تعزیت کیا آپ نے سچے دل سے کی ہے یا محض ایک رسم ہے؟ اس نے جواب دیا کہ سچے دل سے کی ہے، اس پر والد صاحب نے فرمایا کیا آپ ان کو اپنا دشمن تصور نہیں کرتے تھے؟ اس نے کہا یقیناً، والد مرحوم نے فرمایا پھر دشمن کی تعزیت کیسی؟ اس نے کہا کہ ہم کو اس کا یقین تھا کہ اگر کسی وقت بھی اور کسی حیلہ سے بھی یہ شخص ہمارے ساتھ آگیا تو تمام ہندوستان ہمارے ساتھ آجائے گا اب ہماری یہ امید ٹوٹ گئی کیونکہ ہماری نظروں میں اب کوئی اتنی مقبول ہستی نہیں ہے کہ صرف اس کے ساتھ آجانے سے ہم ہندوستان کو اپنے ساتھ ملا سکتے ہوں اس لیے اگرچہ وہ دشمن تھے لیکن ہم کو کچھ امیدیں باقی تھیں جو منقطع ہوگئیں اور اس لیے ایسی شخصیت کے فقدان کا ہم کو بھی افسوس ہے۔ فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ (سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو) (پ ۲۸، رکوع ۴)

مخلوق سب سے پیاری ہو جیسا کہ والد کو سب سے پیارا وہ شخص معلوم ہوتا ہے جس کی نظروں میں اس کی اولاد سب سے زیادہ پیاری ہو۔

شرح: عیسائیت یہ کہتی ہے کہ خدا اور ابن آدم کے درمیان جو رشتہ تھا وہ ابنیت کا رشتہ تھا۔ اسی لیے ان کا گمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جگہ جگہ جب اپنے خدا کو پکارا ہے تو اے باپ! اے باپ! کہہ کر پکارا ہے، لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ خدائے قدوس اور ایک مخلوق میں رشتہ کیا، وہ اس تعبیر کو مجاز اور استعارے کے رنگ میں بھی ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے۔

یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اچھا اگر اس کی مخلوق اس کو ڈھونڈنا چاہے اور یاد کرنا چاہے تو کس رشتے سے ڈھونڈے اور یاد کرے؛ اسلام کہتا ہے کہ اس کا صرف ایک رشتۂ محبت ہے اور یہ اس کی تمام مخلوق میں مشترک ہے اور لفظ اَب (باپ) کی بجائے رَبّ (یعنی پالنے والا) کا تصور پیش کرتا ہے، اسی لیے سورۃ الحمد میں اللہ کی صفات میں سے پہلی صفت رب العالمین کی ارشاد فرمائی گئی ہے یعنی اس کو اَب (باپ) کہنا غلط ہے وہ رَبّ ہے اور رَبّ بھی وہ جو رب العٰلمین ہے، ورنہ یوں تو کسی درجہ کی ربوبیت ہر باپ میں اپنے بیٹے کے لیے موجود ہوتی ہے مگر اللہ وہ نہیں جس کی ربوبیت اتنی سطحی اور محدود ہو، اس کی ربوبیت ربوبیتِ حقیقیہ ہے۔ اور اتنی وسیع ہے کہ اس کے احاطہ میں اسکی ساری مخلوق داخل ہے، اسی لیے اسلام کی تعلیم کردہ محبت میں ایک انسان ہی نہیں بلکہ اسکی تمام مخلوق داخل ہے، اسی لیے اسلام کی تعلیم کردہ محبت میں صرف انسان ہی کو نہیں بلکہ اس کی تمام مخلوق کو بھی حصۂ رسد ملا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے محبت کرنے کا ہی دوسرا نام ہے لیکن خدا کی محبت کی یہ راہ رسولؐ کی محبت میں، پھر رسولؐ سے صحابہؓ کی محبت میں اور اسی طرح درجہ بدرجہ عام مؤمنین کی محبت میں، پھر اس کی تمام مخلوقات کی محبت میں سے

ہو کر گذری، اس لیے خدا کی محبت تک رسائی کے لیے ان محبّتوں کو عبور کرنا ناگزیر ہے۔ جو ان محبتوں سے گذر جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی محبت پا کر رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے، کہ اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے تو اس کا کاٹ دینا ہی عین محبت ہے جیسا کہ کوئی درخت اگر بالکل خشک ہو جائے تو اس کو پانی دیئے چلے جانا کھلی حماقت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلامی نظر میں خدا تعالیٰ صرف معبود ہی نہیں بلکہ محبوب بھی ہے اور محبوب بھی وہ کہ اس کی محبت میں فنا ہو کر اس کی پیدا کردہ ساری مخلوق بھی نظروں میں محبوب بن جائے اور وہ بھی صرف زبانی حد تک نہیں بلکہ اس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا وہ سلوک کیا جائے جو اس کے دعوئے محبت کے لیے شاہد صدق بن سکے۔

اسلام پر اعتراض کرنے والے تاریخ سے پوچھ کر دیکھیں کہ جب تک کوئی جماعت یا فرد خدا کی پیاری مخلوق کے لیے کانٹا بن کر نہ رہ گیا، اسلام نے کبھی بھی اس کی طرف انگلی اٹھائی ہے؟

(۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَّهٗ لَوَجَدْتَّنِیْ عِنْدَهٗ یَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَسْقَیْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ اَسْقِیْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَقَیْتَهٗ

وَجَدْتَ ذٰلِکَ عِنْدِیْ۔ رواہ مسلم (مشکوٰۃ ص ۱۳۳)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے ایک حدیث قدسی میں روایت ہے کہ قیامت میں خدائے قدوس اپنے ایک بندہ سے مخاطب ہو کر فرمائے گا اے ابن آدم! میں بیمار پڑا اور تو نے میری عیادت تک نہ کی، وہ عرض کرے گا اے رب العالمین تیری شان اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے، میں تیری عیادت کیا کرتا اور کیسے کرتا؟ ارشاد ہوگا کہ میرا ایک بندہ بیمار ہوا تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھ کو اس کے پاس پاتا (یہی میری عیادت کا مطلب ہے) اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا مگر تو نے مجھ کو کھانا نہیں کھلایا، وہ عرض کرے گا میں تجھ کو بھلا کھانا کیسے کھلاتا اور تُو تو خود تمام جہانوں کا پالنے والا ہے، ارشاد ہوگا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا، تجھ کو اتنی خبر بھی نہیں کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو اس کا نتیجہ آج میرے حضور میں خود دیکھ لیتا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا اور تو نے مجھ کو پانی نہیں پلایا، وہ عرض کرے گا میں تجھ کو بھلا کیا پانی پلاتا تُو تو خود رب العٰلمین ہے، ارشاد ہوگا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تھا اور تو نے اس کو پانی نہیں دیا تھا سُن لے کہ اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو آج میرے یہاں اس کا بدلہ پا لیتا۔

شرح:۔ ظاہر ہے کہ بیمار کے ساتھ محبت کرنا یہی ہے کہ اس کی بیمار پرسی کی جائے اور ایک بھوکے اور پیاسے کے ساتھ محبت کا ثبوت یہی ہے کہ اس کو کھانا کھلایا جائے اور پانی پلایا جائے۔ یہ تمام نسبتیں وہ ہیں جن سے خدائے قدوس کی ذات منزہ و مبرا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ محبت کی یہ تمام نسبتیں کس طرح اس کے بندوں میں سے گذر کر کتنی شائستہ تعبیر کے ساتھ خود خدائے قدوس کی طرف منتقل ہو گئیں۔

تعبیر کی شائستگی یہ ہے کہ پہلے سوال کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ یعنی تو یہ محسوس کرتا کہ میں اس بندہ کے پاس گویا خود موجود ہوں اور کھانا پینا

اگرچہ مرض کی طرح ان عوارض میں سے ہے جس سے حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات پاک منزہ اور مبرا ہے، تاہم یہاں لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ کی بجائے لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ فرمایا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تو اس کا ثواب آج میرے دربار میں دیکھ لیتا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مریض پر خدا تعالیٰ کی رحمت اس طرح برستی ہے گویا وہی اس کا تیماردار ہے۔ اس لیے بیمار پرسی کے وقت بھی اس کا موجود ہونا کسی غلط فہمی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو کھانے اور پینے سے کہیں بالاتر ہو، اس کی کھلانے اور پلانے کے وقت موجودگی کا بیان کرنا یہ خوبصورت تعبیر نہیں، گو یہ سب کچھ ایک پیرایۂ بیان سہی لیکن اس کے لیے بھی جو راہ کھلی وہ اس کی پیاری مخلوق کی محبتوں میں سے گذر کر ہی کھلی۔

اس حدیث قدسی میں خدائے قدوس نے اپنے بندہ کے ساتھ خطاب کا جو محبت آمیز لب ولہجہ اختیار فرمایا ہے اس کو سن کر اگر کوئی درحقیقت انسان ہو تو ندامت سے تاقیامت اس کا سر اٹھ نہ سکے۔ ایک ایک جملہ سے ایسی محبت ٹپک رہی ہے کہ کوئی بڑا شفیق مربّی اپنے بندہ کے ساتھ انتہائی محبت کے انداز میں گویا اس کی کوتاہی پر گلہ و شکوہ کر رہا ہے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ وَاَجَلُّ۔

سبحان اللہ! ایک طرف اس غنیِ مطلق کا اندازِ خطاب کیا ہے اور دوسری طرف ہم سرتاسر محتاجوں کا حالِ زبوں کیا ہے، یعنی اس حسنِ سلوک کے لیے اپنے گھر سے باہر قدم نکالنا بھی ہماری بڑی کسرِ شان ہے، خالقِ مطلق کی برتری اور ایک محتاج مخلوق کی ابتری کا اس سے اندازہ فرما لیجیے۔

مؤمن وہ ہے جو سراپا اُنس و محبت کا پُتلا ہو!

(۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ مَأْلَفٌ وَّلَا خَیْرَ فِیْمَنْ لَّا یَاْلَفُ وَلَا یُؤْلَفُ۔ (رواہ احمد والبیھقی فی شعب الایمان والحاکم فی المستدرك، مشکوٰۃ ص ۴۲۵)

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایمان دار آدمی تو وہ ہے جو مجسم پیکرِ محبت ہو، جو شخص کسی سے الفت نہ رکھے اور نہ اس سے کوئی الفت رکھے، یاد رکھو کہ اس میں بھلائی کی بُو بھی نہیں۔

شرح:۔ حدیث مذکور میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک مسلمان کو اُنس و محبت میں حاکم و محکوم، غریب و امیر، عالم و جاہل، ہر کس و ناکس کا امتیاز اٹھا دینا چاہیئے، کیونکہ محبت ہی وہ نعمت ہے جس سے نظامِ عالم وجود میں آیا اور اسی نعمت کے ساتھ اس کا بقا بھی مربوط ہے۔ مخلوقات میں کوئی مخلوق اس وقت تک حقیقت کا رنگ پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے اجزاء میں پورا پورا امتزاج اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری پوری احتیاج موجود نہ ہو، خواہ خود اس کا شعور ہو یا نہ ہو، حتّٰی کہ انسانی مصنوعات بھی اس وقت تک کسی مشینری کی شکل اختیار نہیں کر سکتیں جب تک کہ اس کے متفرق پُرزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل نہ کر دیا جائے۔ اسی نظام کے قائم رکھنے کیلئے تمام عالم کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا اُلجھا دیا ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی مملکتیں بھی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی خوشامد کرنے پر مجبور نظر آتی ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ آپ اس کو فطرت کی طرف منسوب کریں یا قدرت کا کرشمہ سمجھیں۔

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے احتیاج و عدمِ احتیاج کے علاقہ سے بالاتر ہو کر اپنے مابین محبت کا علاقہ پیدا

کرے تاکہ عالمِ انسان سے لے کر عالمِ حیوانات تک اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرسکے۔ ایک حدیث میں اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ اگر اس کا ایک عضو بھی بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کی بے چینی سے اس کا تمام جسم بے چین رہتا ہے۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وَمَا سُمِّیَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِہٖ
وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّہٗ یَتَقَلَّبُ

یعنی انسان کو انسان کہتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ سراپا اُنس ہی اُنس ہوتا ہے اور قلب کا نام اسی لیے قلب ہے کہ وہ ہر وقت دھڑکتا ہے۔

اسلام سے قبل عرب خاص طور پر جس نعمت سے محروم تھا وہ یہی محبت کی نعمت تھی۔ پھر اسلام کے بعد سب سے پہلے وہ جس نعمت سے سرفراز کیا گیا وہ یہی نعمت تھی، اسی کو آیتِ ذیل میں یاد دلایا گیا ہے:۔

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا ط (اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن، پھر الفت دی تمھارے دلوں میں، اب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی بھائی (پ ۲)

یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نعمت نہ تو سیم وزر کی طمع سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ جبر وتشدد کی طاقت سے، بلکہ یہ خالقِ کائنات کا براہِ راست ایک انعام ہے جو اُسکی مخلوق میں ان بندوں پر کسی ظاہری سبب کے بغیر ہو جاتا ہے جو اس کے صحیح معنیٰ میں بندے بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے ان الفاظ سے ادا فرمایا ہے:۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ (اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا، نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں، لیکن اللہ نے الفت ڈالی ان میں) (پ ۱۰، رکوع ۴)

بدقسمتی سے جب مخلوق کی شامت اعمال کی بدولت یہ نعمت اس سے چھین لی جاتی ہے تو ہمیشہ بدامنی اور قتل وغارت کے بادل عالم پر برسنے لگتے ہیں۔

اب آپ اپنے عقلی فلسفہ سے تھوڑی دیر کے لیے علیحدہ ہوکر ذرا انصاف کے ساتھ اس شرعی فلسفہ پر غور کرکے دیکھیں اور سوچیں کہ ان تمام ترقیات اور باہم محبت کی تمام جدوجہد کے باوجود وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر موجودہ عالم کو اطمینان وسکون کا ایک سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ آپ پر صاف روشن ہو جائے گا کہ جو نعمت اسلام نے ہم کو انس ومحبت سے عطا فرمائی تھی، آج اسلام کو چھوڑ کر اس متاعِ گرانمایہ کو خود اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھے ہیں۔ اگر ہم صرف اسی ایک صفت کو اپنی قوم میں پیدا کرلیں تو ہماری معاشرت میں بغض وعناد، شر وفساد اور دیگر وحشیانہ حرکات کی بجائے انس ومحبت، صلح و آشتی اور انسانیت کے دوسرے شریفانہ افعال بہت جلد پھر پیدا ہو جائیں گے۔

اسلام نے اپنے ابتدائی دور سے لے کر اپنے انتہائی عروج کے دور تک جو قدم بھی اٹھایا ہے وہ اسی قانونِ محبت کے تحت اٹھایا ہے۔ اب نا قدر دنیا جن الفاظ سے چاہے اس کو تعبیر کرے، کسی شاعر نے اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے جو ذرا سی ترمیم کے ساتھ درج ذیل ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور الفت

موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا

(۵) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِاِمْرَأَۃٍ مُّوْمِسَۃٍ مَّرَّتْ بِکَلْبٍ عَلٰی رَأْسِ رَکِیٍّ یَّلْھَثُ کَادَ یَقْتُلُہُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّھَا فَاَوْثَقَتْہُ بِخِمَارِھَا فَنَزَعَتْ لَہٗ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَھَا بِذٰلِکَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَھَآئِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ کُلِّ ذَاتِ کَبِدٍ رَّطْبَۃٍ اَجْرٌ۔ (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۱۶۸)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی عورت کی جو فاحشہ تھی صرف اتنی سی بات پر مغفرت فرمادی کہ اس کا گذر ایک پیاسے کتے پر ہوا جو ایک کنویں کی مینڈ پر پیاس کی شدت سے زبان نکالے پڑا تھا اور دم توڑ رہا تھا، اس کو دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا بس فوراً اس نے اپنے سر کی اوڑھنی اتاری اور اپنے پیر کا جوتا اس میں باندھ کر کنویں سے پانی نکالا اور اس کو پلا دیا بس دریائے رحمت جوش میں آگیا اور اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا، صحابہ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جانوروں کے ساتھ ہمدردی کا بھی ہم کو ثواب ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جی ہاں، جانور تو جانور، ہر جاندار کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تم کو ثواب ملے گا۔

(۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عُذِّبَتِ امْرَاَةٌ فِیْ هِرَّةٍ اَمْسَکَتْهَا حَتّٰی مَاتَتْ مِنَ الْجُوْعِ فَلَمْ تَکُنْ تُطْعِمُهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَاْکُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۱۶۸)

ترجمہ: ابن عمرؓ اور ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک عورت اتنی سی بات پر عذاب میں گرفتار ہوئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، پھر نہ اس کو کھلایا پلایا اور نہ اس کو کھول کر چھوڑا کہ وہ چل پھر کر خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھالیتی۔

(۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ ص ۳۹۷)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے، جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک باہمی محبت نہ کرو گے پورے مؤمن نہیں بنو گے، تو کیا میں تم کو وہ بات نہ بتا دوں کہ جب اس کے خوگر ہو جاؤ تو باہمی محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے) کہ آپس میں ہر شخص کو سلام کیا کرو خواہ وہ تمھارا آشنا ہو یا نا آشنا۔ (مسلم شریف)

شرح:۔ جنت کیا ہے؟ یہ وہ متاعِ گراں ہے جس کے متعلق حدیث شریف سے صرف اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کی نعمتیں نہ کسی نے دیکھیں، نہ کسی کے کانوں نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا گذر ہوا۔ حدیث کا اسلوبِ بیان کتنا پیارا ہوتا ہے کہ اس متاعِ گراں کو رفتہ رفتہ اتنا ارزاں فرما دیا کہ گویا اس کی قیمت صرف ایک لفظِ "سلام" رہ گئی ہے۔

اس نعمتِ عظمیٰ کا حصول پہلے تو ایمان یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تصدیق قلبی کے ساتھ پڑھنا قرار دیا، اگرچہ اس کلمہ کا پڑھنا مشکل بھی کیا؟ اور کسی صحیح حقیقت کی تصدیق میں دشواری ہی کیا، لیکن پھر اس کے حصول کا ذریعہ ایک ایسی صفت کو ٹھیرا دیا، جو ہر شریف انسان میں قدرتاً ودیعت کی گئی ہے یعنی اُنس ومحبت لیکن اُنس ومحبت کا لِوَجْہِ اللّٰہ ہونا ہی ایک ٹیڑھی کھیر ہے، اس لیے محبت کے حصول کا ذریعہ ایک ایسے خوشنما کلمہ کو ٹھیرا دیا جس کو زبان سے ادا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

اب اگر اسی سبق کو آپ یوں پڑھیں تو وہ اور آسان نظر آتا ہے یعنی کثرت سے ایک دوسرے کو سلام کرنے سے محبت پیدا ہوتی ہے اور اس محبت سے ایمان کی شیرینی دل میں اترنے لگتی ہے اور اس مختصر راستہ سے اگر کوئی چاہے تو "خدا کی جنت" بڑی آسانی سے مل سکتی ہے۔ "داتا ہو تو ایسا ہو"

اس حدیث سے ایک اصلِ عظیم یہ بھی معلوم ہوئی کہ بعض نیکیاں دیکھنے میں معمولی

ہوتی ہیں جیسے ایک لفظ "سلام"، مگر ان کے ثمرات بہت دُور رس اور قیمتی ہوتے ہیں، آہ! افسوس کہ انگریزوں کی نقالی میں آج مسلمانوں کا معاشرہ کا معاشرہ لفظ سلام سے تقریباً خالی ہو گیا ہے اور اس پر حسرت یہ کہ اس کی جگہ دوسری بے معنیٰ حرکات نے بے معنیٰ الفاظ نے لے لی ہے۔ جب کسی قوم کا دورِ انحطاط آتا ہے تو ہمیشہ وہ اسی طرح اپنے عمدہ خصائل چھوڑتی جاتی ہے اور دوسروں کے خسیس رذائل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔

بہترین حکومت وُہ ہے جس میں حاکم و محکوم کے درمیان محبّت کا مضبوط علاقہ موجود ہو

(۸) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِیِّ رض عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ خِیَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِیْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ یُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُصَلُّوْنَ عَلَیْهِمْ وَیُصَلُّوْنَ عَلَیْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِیْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَیُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَیَلْعَنُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ قَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِیْكُمُ الصَّلٰوةَ وَلَا مَا اَقَامُوْا فِیْكُمُ الصَّلٰوةَ اِلَّا مَنْ وُّلِیَ عَلَیْهِ وَالٍ فَرَاٰهُ یَاْتِیْ شَیْئًا مِّنْ مَّعْصِیَةِ اللّٰهِ فَلْیَكْرَهْ مَا یَاْتِیْ مِنْ مَّعْصِیَةِ اللّٰهِ وَلَا یَنْزِعَنَّ یَدًا مِّنْ طَاعَةٍ (رواہ مسلم مشکوٰۃ ص ۳۱۹)

ترجمہ:۔ حضرت عوف بن مالک اشجعی رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمھارے بہترین حاکم وہ ہیں جو تم سے محبت رکھیں اور تم ان سے محبت رکھو۔ وہ تم کو دعائیں دیں تم ان کو دعائیں دو اور بدترین حاکم وہ ہیں جو تم سے بغض رکھیں اور تم ان سے بغض رکھو، اور وہ تم پر لعنت کریں اور تم ان پر لعنت کرو۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ان بدترین حاکموں کے ساتھ ہم اپنا رشتہ اطاعت

توڑ کر پھینک دیں، آپؐ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ جب تک کہ وہ تمہاری باجماعت نمازوں کا نظام قائم رکھیں (تاکیداً یہ دوبار فرمایا) خوب سن لو کہ جب کسی پر کوئی حاکم مقرر ہو اور وہ یہ دیکھے کہ وہ خدا کی معصیت میں مبتلا ہے تو اصول یہ ہے کہ اس کی معصیت کو دل میں نفرت کی نظر سے دیکھے، لیکن ظاہری طور پر اس کی اطاعت سے دست کش نہ ہو۔

شرح:۔ حدیث بالا میں بھی حاکم و محکوم کی خوش بختی کی علامت محبت ہی کو قرار دیا گیا ہے، لیکن ادھر ایک دائمی قانون کا مؤسس یہ دیکھ رہا تھا کہ اس انقلابات کی دنیا میں ہمیشہ معیاری حاکم میسر آنا ممکن نہیں، اس لیے اگر چھوٹے بڑے اختلافات کے ساتھ حکومت کی برسرِ بازار مخالفت کی اجازت دے دی جائے تو پھر مستقبل میں کسی حکومت کا قیام بھی مشکل ہو جائے گا۔

اسلام کی نظر میں افتراق و تشتت اور شر و فساد اور فتنہ پردازی کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی ہے کہ اس کو قتل جیسے قبیح جرم سے زیادہ بڑھ کر قرار دے دیا گیا ہے وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ (پ۲، رکوع ۸)

اسلام کا جماعتی نصب العین صرف شان وشکوہ کی برتری نہیں، بلکہ اعمال وکردار کی بہتری ہے

(۹) عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ اَنَّهُ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ رضؓ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ وَّلَّاهُ اللّٰهُ شَيْئًا مِّنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَخَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ فَجَعَلَ مُعٰوِيَةُ رَجُلًا عَلٰى حَوَائِجِ النَّاسِ (رواہ ابوداؤد والترمذی۔ مشکوٰۃ ص ۳۲۴)

ترجمہ:۔ عمرو بن مُرّہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو مسلمانوں کا حاکم مقرر فرمائے اور وہ مسلمانوں کی ضروریات اور حاجات سے غافل ہو کر بیٹھا رہے تو اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ بھی محشر میں اس کی ضرورت اور حاجت کی کوئی شنوائی نہ فرمائے گا۔ یہ حدیث سن کر حضرت معاویہؓ نے اس بات کے لیے مستقل ایک شخص مقرر کر دیا کہ جو لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی ضروریات کو ان کے سامنے پیش کرتا رہے۔

(۱۰) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ اَنَّهٗ کَانَ اِذَا بَعَثَ عُمَّالَهٗ شَرَطَ عَلَیْهِمْ اَنْ لَّا تَرْکَبُوْا بِرْذَوْنًا وَّلَا تَاْکُلُوْا نَقِیًّا وَّلَا تَلْبَسُوْا رَقِیْقًا وَّلَا تُغْلِقُوْا اَبْوَابَکُمْ دُوْنَ حَوَآئِجِ النَّاسِ فَاِنْ فَعَلْتُمْ شَیْئًا مِّنْ ذٰلِكَ فَقَدْ حَلَّتْ بِکُمُ الْعُقُوْبَةُ ثُمَّ یُشَیِّعُهُمْ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ ص ۳۲۴)

ترجمہ:۔ حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ وہ اپنے کسی کارندے کو کسی جانب روانہ فرماتے تو اس کے ساتھ یہ چند شرطیں طے کر لیتے، کہ ترکی گھوڑے پر سوار مت ہونا اور میدہ مت کھانا اور باریک کپڑے مت پہننا اور لوگوں کی ضروریات سننے کے لیے ہر وقت اپنے دروازے کھلے رکھنا، ان کو بند مت کرنا، اگر تم نے ان میں سے ایک بات کی بھی خلاف ورزی کی تو یاد رکھنا اس کا نتیجہ تم کو بھگتنا ہوگا۔ یہ کلمات کہہ کر پھر رخصت فرماتے۔

شرح:۔ حدیث کی شرح سمجھنے سے پہلے یہ اپنے پیش نظر رکھیئے کہ یہ فرمان اس شخص کا ہے جس کے متعلق انگریزوں کا یہ مقولہ ہے کہ اگر کہیں اسلام میں اسی شان کا دوسرا عمر اور پیدا ہو جاتا تو تمام روئے زمین پر مسلمانوں کے سوا دوسرا کوئی حکمران نظر نہ آتا۔ تاریخ آپ کو یہ بتا دے گی کہ ان کی یہ ہدایات کسی جبر و تشدد کی بنا پر نہ تھیں کیونکہ دنیا کبھی جبر و تشدد سے رام نہیں ہو سکتی، بلکہ ان کے حُسنِ تدبیر اور حُسنِ تدبّر کی

بنا پر تھیں اور اسی کے ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھیئے کہ یہ شخصیت وہ تھی جس کی عمر کا اکثر حصہ ایسے تنگ حالات میں گذرا ہے کہ اس وقت کبھی کبھی مسلمانوں کی تمام فوج میں انگلیوں پر گنے ہوئے چند گھوڑے ہوتے تھے جبکہ دشمنوں کی فوج ہر قسم کے سامانوں سے لیس اور مسلح ہوتی تھی، ان کی غذا حالتِ امن میں جَو کا آٹا اور وہ بھی بغیر چھنا ہوا اور ان کا فوجی راشن کبھی کبھی صرف کھجور کی گٹھلیاں ہوتی تھیں۔ پھر ان کے لباس کا کیا پوچھنا ہے ان کے تن یا تو ہمہ وقت زرہ پوش رہتے تھے یا اگر کبھی زرہ اتارنے کی نوبت آتی تو جانوروں کے کچے چمڑے جسم سے لپیٹ لیا کرتے تھے۔

یہ وہ شخصیت تھی جو اپنے دورِ حکومت میں تخت پر بیٹھ کر اپنے پھاٹک بند کرنے کی بجائے رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر مدینہ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے کہ اگر کسی کو اپنی ضرورت بیان کرنے میں کوئی امر مانع ہو تو براہِ راست خود جا کر اس کا تجسّس کریں، اس ضمن میں جو واقعات تاریخ میں موجود ہیں اگر ان کو نقل کیا جائے تو پھر یہ مختصر رسالہ ایک رسالہ باقی نہیں رہ سکتا بلکہ ایک ضخیم جلد بن جائے گا۔

(۱) اب اس روشنی میں آپ اس پر غور کریں کہ اگر حاکم خود ایسا ہو اور اس کا دَور وہ دَور ہو جو آپ اوپر ملاحظہ فرما چکے تو اس کو اپنے کارندوں کو مذکورۂ بالا شرائط کا پابند کر دینا کتنا معقول اور حاکم و محکوم کی عام معاشرتی زندگی میں توازن قائم رکھنے کے لیے کتنا ضروری تھا، لیکن اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے ہر چیز میں فراغت ورفاہیت عطا فرما رکھی ہے، گھوڑوں کی بجائے موٹر اور موٹروں سے بڑھ کر ہوائی جہاز میسر فرما دیئے ہیں اور لباس بھی اچھے سے اچھا آسانی سے نصیب ہو جاتا ہے اور گیہوں کا میدہ بھی قلیل وکثیر اکثریت کو مل جاتا ہے تو اب ان الفاظ کی ظاہری صورت پر جمود کرنا یا اس پر اعتراض کرنا یہ سراسر نا فہمی ہے، البتہ اس فرمان کی روح کو آج بھی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے، یعنی اپنے زمانہ کے ساز وسامان کے مطابق

اور اپنی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں استعمال کر سکتے ہیں لیکن قدم قدم پر اگر ہم کو باعزت زندگی درکار ہے تو ہمارے دماغوں میں عیش پرستی کا تخیل کہیں دور دور بھی نہ آنا چاہیئے اور جفاکشی کی زندگی کا ہمیشہ عادی رہنا چاہیئے۔

ابھی علی برادران مرحوم کو غالباً دنیا نے فراموش نہیں کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس قسم کے لوگ بھی موجود تھے جو ہندوستانی کپڑے کا استعمال تو درکنار ہندوستانی دُھلے ہوئے کپڑے کا پہننا بھی عار سمجھتے تھے۔ پھر اسی زمانے میں شدہ شدہ یہ نوبت آگئی کہ جو گاڑھا پہنتا اور وہ بھی کھدّر کا بُنا ہوا تو بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا اور جو شخص ململ ولٹھا پہنے ہوئے نظر آتا وہ جدھر بھی نکلتا انگلیاں اس کی طرف اٹھنے لگتی تھیں۔ پھر کتنی ناانصافی ہوگی کہ اس عہد سے تازہ تازہ گذرنے والے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمانِ مذکور پر کوئی ادنیٰ سی لب کشائی کا بھی ارادہ کریں۔

(۲) اب ذرا اور گہری نظر ڈالیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حکام کی عیش پرستی کا نتیجہ یہ شکل کر رہتا ہے کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں میں غفلت کرنے لگتے ہیں اور آگے بڑھ کر رفتہ رفتہ اس بُری عادت سے انھیں رشوت خوری کا روگ لگ جاتا ہے کیونکہ جب انسان عیش پرستی میں پڑکر اپنی محدود تنخواہ میں اپنی غیر محدود ضروریات پوری نہیں کرسکتا تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ ضعیف انسانوں کا خون چوس چُوس کر اپنی خواہشات کو پورا کرے۔

(۳) اب اس پر غور کیجیئے کہ جب حاکم اتنا عیش پرست ہو تو بقیہ مملکت پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے۔ سب سے پہلے یہ ہوگا کہ حسبِ قاعدہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ وہ بھی عیش پرستی میں مبتلا ہوں گے اور جب حاکم رشوت خور ہو تو رعایا کو رشوت دینا لازمی امر ہوگا اور اس کے لیے لازمی طور پر ان کو بلیک مارکٹنگ (Black Marketing) اسمگلنگ (Smuggling) اور اسی طرح کے دوسرے راستے تلاش کرنے پڑینگے۔

مقدمات کی گرم بازاری ہو جائے گی اور بالآخر ملک میں قانون کے پردہ میں لاقانونیت پیدا ہو کر رہے گی اور یہ ایک ایسا مرض ہوگا کہ جو حاکم و محکوم دونوں میں سرایت کر جائیگا تو پھر یہ مثل مشہور صادق آنا ضروری ہوگی کہ مقدمہ بازی کر کے جو فریق ہارتا ہے وہ تو ہارتا ہی ہے لیکن جو جیتتا ہے وہ بھی درحقیقت ہارتا ہے کیونکہ اس بیچارہ کا مقدمہ بازی میں کَس نکل جاتا ہے اور قانون صرف عوام میں جنگ کا ایک ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

(۴) اب آئیے دیکھئے، اس کا بہت بڑا اثر دشمنوں پر کیا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا شیرازہ ان کو اس طرح بکھرا ہوا نظر آتا ہے تو وہ ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کرنے کی بجائے صرف چند پیسوں سے فتح کر لینا آسان سمجھنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو ظالم حاکم اپنی خواہشات کی خاطر اپنے ملک کے خون کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا وہ چند پیسہ میں اپنے ملک کو بیچنے میں کیا تأمل کر سکتا ہے، آج اس کے شواہد دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہیں، نام لے لے کر ان کو گنوانا ایک علمی رسالہ میں موزوں نہیں۔

حاکم کی نفسیاتی مضرت، ملک کا نقصان اور دشمنوں کے خطرہ کے علاوہ یہاں کچھ گہری مضرتیں اور بھی ہیں جن کو اس موجودہ مذاق کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ایک بڑی حقیقت کی ناقدری کرلنے کے مترادف ہے اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا جارہا ہے اس رسالہ میں صرف اسی حد تک لکھا گیا ہے جس کو موجودہ دماغ کچھ نہ کچھ قبول کر سکے۔

حضرت عمرؓ کے اس فرمان میں یہ ہے کہ اسلام کا جماعتی نصب العین مال و دولت اور شان و شکوہ کی برتری نہیں بلکہ عمل و کردار میں سب سے بہتری ہے اور انسان کیلیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین نہیں ہو سکتا، اس لیے فرمانِ مذکور میں اسی نصب العین کی رعایت کی گئی ہے کہ حکومت کا نشہ کہیں حکامِ زیر دست کو اعمال و کردار کی بہتری کے بجائے شان و شکوہ کی برتری میں مبتلا نہ کر دے۔

حضرت عمرؓ نے یہ ان حکام کو حکم دیا ہے کہ جو ان کے کارندے ہوتے اور ان کی

نظروں سے غائب ہو کر دوسری خدمات پر مامور کیے جاتے تھے، اگرچہ خود امیر المؤمنین عمرؓ نے مسلمانوں کے حاکم ہونے کے باوجود کسریٰ جیسے جبّار بادشاہ کے لیے بھی اپنی شانِ فقر کے سوا کسی مصنوعی کرّوفر کے دکھانے کا اہتمام نہیں فرمایا لیکن اس ملاقات کا رعب جو ان بادشاہوں کے قاصدوں پر پڑتا تھا وہ تاریخ میں آج بھی مُدوّن ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے بادشاہ میں مال و دولت کی برتری دیکھ کر آتے تھے اور جب حاکمِ اسلام کے سامنے پہنچتے تو یہاں ان کو عمل و کردار کی وہ بہتری نظر آتی تھی، جس کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور اس کا اثر و ہیبت ان کے دلوں پر یہاں تک پڑتی تھی کہ بولنے میں بھی ان کو تکلف ہونے لگتا تھا۔ اس تمام تفصیل کو قرآن کریم کی آیت میں اس طرح سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار تقویٰ یعنی اعمال کی برتری ہے۔

اس تمام گذارش کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی ہم کو کسی قسم کے تمتع کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ بار بار اسکی تنبیہ کی جا چکی ہے کہ احادیث کے سمجھنے کیلئے اس وقت کا ماحول سامنے رکھنا ضروری ہے ورنہ ان کے سمجھنے میں بہت سی بدگمانیاں بے وجہ پیدا ہو جاتی ہیں، خود امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک باب یہ رکھا ہے "باب التجمل للوفود" یعنی آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا باہر سے آنے والے وفود کے لیے ان کے اکرام میں اپنی عام عادت سے کچھ بڑھیا لباس زیبِ تن فرمانا۔ لیکن یہ کسی شان و شکوہ یا رعب و دبدبہ کے اظہار کے لیے نہیں تھا" والعیاذ باللہ بلکہ یہ اُس زمانہ کے ملوک اور سلاطین کا عام دستور تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ شرفِ ملاقات حاصل کریں ان کا اکرام کیا جائے اور آج بھی اس قدیم عادت کے اثرات باقی ہیں، اگرچہ زاویۂ نظر بدل گیا ہے، اس لیے اگر کسی صحیح مقصد کے پیشِ نظر

اپنے دائرۂ وسعت میں رہ کر بیرونی حکام سے ملاقات کے لیے کوئی خاص انتظام کیا جائے تو اگر نیت صحیح ہو تو یہ شریعت کے عین منشاء کے مطابق ہوگا لیکن اگر صرف اپنی شان و شوکت کا لحاظ تو رہے اور اپنے اعمال کی برتری اور اخلاق کی بلندی کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر یہ وہی باتیں ہیں جن کی روک تھام کی خاطر حضرت عمرؓ بہ نظر احتیاط اپنے حکام کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ مبادا کہیں وقتی جمال و تزئین مصلحت کی بجائے ان کی عادت اور طبعی خو نہ بن کر رہ جائے۔

حاکم کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے اور سختی و درشتی کا معاملہ نہ کرے

(۱۱) عَنْ عَائِشَةَ رضؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ مَنْ وُّلِّيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ وَمَنْ وُّلِّيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَرَفِقَ بِهِمْ فَارْفُقْ عَلَيْهِ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص ۳۲۱)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الٰہی! میری امت میں سے جس کو بھی کسی شعبہ کی خدمت کا موقع ملے اور وہ لوگوں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرے تو تُو بھی اس کے ساتھ سختی کا معاملہ فرمانا اور جو اُن میں میری امت کے ساتھ نرمی کرے تو تُو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمانا۔

(۱۲) عَنْ عَائِشَةَ رضؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ كَانَ لَهٗ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهٗ فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعُقُوْبَةِ. (رواہ الترمذی وقال قد روی عنہا ولم یرفع وھو اصح، مشکوٰۃ ص ۳۱۱)

ترجمہ :۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہو، حدود کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ وہ پہلو اختیار کرو جس میں وہ سرکاری مقرر کردہ سزا سے بچ جائیں۔ تو اگر مقدمہ میں کوئی پہلو ملزم کی رہائی کا نکل سکتا ہو تو اس کی بنا پر ملزم کو رہا کر دو، کیونکہ ملزم کو معاف کر دینے میں امام کا غلطی کرنا، غلط طور پر کسی غیر مجرم کو سزا دینے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

شرح :۔ بارگاہ رسالت کی دُور بین نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ خلافت راشدہ کا دور ہمیشہ قائم رہنے والا نہیں اور آئندہ چل کر حاکموں کے دماغ میں حکومت کا نشہ پیدا ہو جانا بعید نہیں، اس لیے صحیح مسلم کی حدیث میں حکمرانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ اپنے عارضی دورِ حکومت میں میری امت کے ساتھ محض اپنی حکومت کے نشہ میں کوئی سختی کا معاملہ کریں گے تو میری بد دعا کے مستحق ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے بد دعائیہ کلمات کا اثر حکمرانوں کے دماغوں پر جتنا پڑ سکتا ہے اتنا اثر صرف ضوابط اور آئین کا نہیں پڑ سکتا۔

تعجب ہے کہ ایک شخص جو ابھی ہمارا بھائی بنا ہوا بیٹھا تھا وہ اگر عارضی طور پر ہمارے انتخاب سے حکومت کی کرسی پر جا بیٹھتا ہے تو اس کو یہ خیال باقی نہیں رہتا کہ وہ بہت قلیل مدت کے بعد ضابطہ میں یا کسی حادثہ میں مبتلا ہو کر پھر ہمارے ساتھ بیٹھنے والا ہے، اس لیے اس کو اپنے دورِ حکومت میں اپنی اسلامی برادری کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے؟ اگر شرعی لحاظ سے یہ جذبہ دل میں پیدا نہیں ہوتا تو ایک ہوشمند دماغ میں کم از کم عقلی لحاظ سے تو پیدا ہونا ضروری ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان اصل رشتۂ الفت و اخوت کسی حالت میں بھی ٹوٹنے نہ پائے لیکن نافہم ذرا سے اقتدار کے حاصل ہو جانے کے بعد اس عمیق مصلحت کو فراموش کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے دورِ حکومت میں غائبانہ

طور پر اہلِ معاملہ کی جانب سے بد دعائیں لیتے ہیں اور اپنے عہدہ سے سبکدوشی کے بعد اور زیادہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور اس طرح اتفاق و اتحاد اور الفت و اخوت کی جڑیں قوم میں سے اکھڑتی چلی جاتی ہیں اور اس کے نتائج و اثرات شخصی نہیں رہتے بلکہ قومی ابتری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دوسری حدیث محدثین کے نزدیک اگرچہ صحیح یہ ہے کہ حضرت عائشہ رض کا قول ہے تاہم اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حدود یعنی سرکاری سزاؤں کے معاملہ میں شریعت کا مقصد حتی الوسع اغماض و چشم پوشی کرنا ہے لیکن اگر کوئی قانونی پہلو نہ نکل سکتا ہو تو ظاہر ہے کہ سزا کا حکم دینا بہر حال تحفظِ قانون کے لیے ناگزیر ہے، یہاں جلد باز طبائع اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اس طریقہ سے کھلم کھلا جرائم کی کثرت ہو جائے گی، کیونکہ ان حدیثوں کا منشا اور ان کی اصل روح حکام کو جور و ظلم سے روکنا ہے۔

اسلامی قانون سے نامانوس دماغوں کے لیے اس سے زیادہ تفصیل کرنی بھی ناکافی ہے اور حقیقت پسندوں کے سمجھنے کے لیے یہ چند کلمات بھی کافی ہیں۔

(نوٹ) حدود سے مراد یہاں قانون تعزیرات کا ایک خاص حصہ ہے جیسے حدِ زنا وغیرہ اس کی قدرے تفصیل آئندہ آئے گی۔

حاکم اگر خواہ مخواہ عوام کی عیب چینی کے درپے رہے گا تو اس کا نتیجہ عوام میں بددلی اور حکومت کی مخالفت کے سوا اور کچھ نہ ہو گا

(۱۳) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رض عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ الْاَمِیْرَ اِذَا ابْتَغَی الرِّیْبَةَ فِی النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ رواہ ابوداؤد مشکوٰۃ ص ۳۲۲)

ترجمہ:۔ ابی امامہ رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے

فرمایا کہ مسلمانوں کا حاکم جب اپنی رعایا کی عیب جوئی کے درپے ہوجائے تو سمجھ لو کہ وہ ان کو بگاڑ کر رہے گا۔

(۱۴) عَنْ مُعٰوِیَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّکَ اِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَّھُمْ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ ص ۳۲۲)

ترجمہ:۔ حضرت معاویہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے میں نے خود سنا ہے کہ جب تم لوگوں کے عیب کے پیچھے لگے تو سمجھ لو کہ تم ان کو بگاڑ کر رہو گے۔

شرح:۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان ضعیف البنیان ہے اور کمزوریوں کا مجموعہ ہے اس لیے ہر انسان میں اس کی زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے اب حاکم اگر اسی کے پیچھے لگا رہے کہ کرید کرید کر انسانی کمزوریوں کو بر سرِ بام لاتا رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام اپنے حاکم سے متنفر ہو جائیں گے اور انتقامی جذبات سے بھر کر اس کے درپے ہوں گے کہ خود اس حاکم کی کمزوریوں کو تلاش کریں اور عوام میں ان کا افشا کریں اور ضدی طبائع سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ اپنے حاکم کی اس حرکت سے برافروختہ ہو کر جن جرائم کا وہ پہلے ارتکاب نہ کرتے تھے ان کا ارتکاب کرنا شروع کر دیں یا کم از کم ان میں اور حد سے تجاوز کر جائیں، اس کا نتیجہ جو کچھ ظاہر ہوگا وہ ظاہر ہے۔

اس لیے حاکم کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ جو چیز اس کے علم میں آجائے اگر وہ جماعتی طور پر مضرت رساں ہو تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے درگذر نہ کرے اور اگر کوئی انفرادی تقصیر ہو اور قابلِ اغماض ہو تو اس سے اغماض کر لے۔ ہاں حاکم کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے زیر دست حکام اور رعایا کے عام حالات سے صحیح صحیح طور پر باضابطہ مطلع رہنے کی سعی کرتا رہے تاکہ حاکم کی غفلت محکوموں کو حکومت کے مقابلہ میں دلیر نہ بنا دے

یہاں حدیث کا منشا، صرف حاکم کو تنگ نظری سے اجتناب کرنے کی ہدایت کرنا منظور ہے اور شخصی کمزوریوں کے ہر وقت درپے رہنے سے ممانعت کرنا مدنظر ہے کیونکہ صحیح نظام اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک کہ حاکم لوگوں کے عیوب کے درپے بھی نہ ہو اور اسی طرح ان کے حالات سے کلیتاً غافل بھی نہ رہے، یہ تو اصول ہے، رہ گئے ہنگامی حالات تو ان کے احکام علٰحدہ ہیں، اس کا فرق ہر حکومت جانتی ہے اور اس کا لحاظ رکھتی ہے.

جن کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت ہو، خدائی قاہرانہ خوف کے سوا کوئی دوسری طاقت انکو رام نہیں کرسکتی

(۱۵) عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ وَّالٍ يَلِيْ رَعِيَّةً مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَّهُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ ص ۳۲۱)

ترجمہ:۔ معقل بن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا کہ جو حاکم بھی مسلمانوں کے کسی شعبہ پر مقرر ہو اور وہ ان کے ساتھ دھوکے اور کھوٹ کا معاملہ کرے اور اسی حالت پر اس کی موت آجائے تو اللہ تعالیٰ اپنی جنت کو اس پر حرام کردے گا.

شرح:۔ قرآن وحدیث کا یہ عجیب اسلوب ہر جگہ قائم رہتا ہے کہ وہ عوام وخواص پر صرف ضوابط وآئین کا دباؤ نہیں ڈالتے بلکہ ایک ایسی طاقت کا خوف ان کے دلوں پر مستولی رکھنا چاہتے ہیں جو حاضر وغائب پر یکساں قائم رہے۔ آئین وضوابط بہت ضروری چیزیں ہیں اور اسلام میں اپنے مفصل دفعات کے ساتھ موجود ہیں لیکن اگر انکے نافذ کرنے والے دماغ آزاد ہوں اور وہ کسی الٰہی یا کم از کم انسانی طاقت کا خوف اپنے دلوں میں نہ رکھتے ہوں تو خواہ ان کی شکل کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو مگر وہ کچھ سودمند ثابت

نہیں ہوتے، حتیٰ کہ بعض مرتبہ غیر آئینی کارروائیوں کے لیے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے الفاظ میں ایسی وسعت رکھی جاتی ہے کہ بوقتِ ضرورت ناجائز کارروائیوں کیلیئے ان ہی ضوابط کے تحت کوئی نہ کوئی راہ کھل جاتی ہے۔ اور اگر اس وسعت سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکے تو بعض دفعات کا اضافہ ایسا کر لیا جاتا ہے جو اُن کی اس ضرورت کو پورا کر دے، لیکن اسلام زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ شخصی ہو یا قومی، کھوٹ رکھنا موجبِ ہلاکت سمجھتا ہے اس لیے اس کے قوانین کا نگراں خود انسان کا ضمیر ہوتا ہے اور اسکے قانون کی خلاف ورزی خود اس کے ضمیر کے لیے باعثِ ملامت ہوتی ہے۔

رشوت شرعی نظر میں بہت بڑا سنگین جرم ہے اور اس کے حلال بنانے میں حیلے تراشنا اس کو اور سنگین بنا دیتا ہے۔

(۱۶) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضی قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ (رواہ ابوداؤد ورواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان عن ثوبان وزاد "وَالرَّائِشَ" یعنی الذی یمشی بینهما۔) (مشکوٰۃ ص ۳۲۶)

ترجمہ:۔ عبداللہ ابن عمرو رض فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت کھانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور کتبِ حدیث میں ثوبان رض سے اس شخص پر بھی لعنت مذکور ہے جو درمیان میں رشوت کا معاملہ طے کرنے والا ہو۔

(۱۷) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رض اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاَهْدٰى لَهٗ هَدِيَّةً عَلَيْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰى بَابًا عَظِيْمًا مِّنْ اَبْوَابِ الرِّبٰو۔ (رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ ص ۳۲۶)

ترجمہ:۔ ابوامامہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر

کسی نے کسی شخص کے معاملہ میں صحیح سفارش بھی کی اور اس کے بعد اس کے سامنے سفارش کرنے والے نے کوئی ہدیہ پیش کیا اور اس نے اس کو قبول کر لیا تو اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بھی بڑی سودخوری کے برابر ہے۔

شرح :۔ رشوت کی حرمت اور اس کی حیثیت مذکورہُ بالا ترجمہ سے ظاہر ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اس ایک جرم میں تین شخص مجرم قرار دیئے جاتے ہیں۔ اسلام میں جرائم کے انسداد کے لیے صرف قوانین کا وضع کر دینا ناکافی سمجھا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ذہنیت اور معاشرت کی تبدیلی پر بھی زور دیا گیا ہے اور انسان کے ضمیر پر ایک ایسی طاقت کا دباؤ ڈالا گیا ہے جو حاضر و غائب اس کے دل پر یکساں مستولی رہے، اسی لیے قرآن کریم میں بہت سے مقامات میں آئین و ضوابط کا تذکرہ فرما کر یا تو اتَّقُوا اللّٰہَ کا لفظ فرما دیا گیا ہے یا یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ جو کچھ تم کہتے یا کرتے ہو وہ پوشیدہ ہو، یا علانیہ، ان میں سے کوئی بات ہمارے علم سے باہر نہیں رہتی وہ براہِ راست بھی ہم سنتے اور جانتے ہیں اور ہماری سی۔آئی۔ڈی کے دو فرشتے تمھاری ایک ایک حرکت اور سکون کو ضبطِ تحریر میں لاتے رہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر تمھارے اچھے بُرے افعال خود تمھارے اعضاء میں ایسے اثرات چھوڑ جاتے ہیں جو دنیا میں زبانِ حال سے اور آخرت میں زبانِ قال سے ان پر شاہد ہوں گے۔

آج بھی ایک پولیس افسر ایک مُشتبہ آدمی کو دور سے دیکھ کر یہ تاڑ لیتا ہے کہ فلاں مال کی چوری اسی نے کی ہے اور صرف اپنے تجربہ اور قیافہ شناسی سے اس کو گرفتار کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ اس کی چوری کے اثرات کچھ نہ کچھ اس کے جسم اور چہرے سے نمایاں ہونے لگتے ہیں تو پھر آپ کو اسی طرح انسان کے دوسرے افعال کی شہادت میں آخرت کے دن شبہ کرنے کی کیا وجہ ہے، شریعت میں لعنت وہ آخری لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے بڑھ کر راندۂ درگاہ کے لیے یعنی ابلیس شیطان

کے لیے استعمال فرمایا ہے، یہی لفظ رشوت کے معاملہ میں استعمال فرمایا ہے۔

اب اگر کسی کے دل پر اس آخری لفظ کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تو پھر وہ صرف قانون سے کیا متأثر ہوسکتا ہے، حکومتیں یہاں کتنا غلط قدم اٹھاتی ہیں کہ خود حکام کی رشوت کی تحقیق کے لیے ایک دوسرا محکمہ قائم کرتی ہیں جس کا عنوان "اینٹی کرپشن" (Anti-Corruption) ہے۔ اس کا حاصل عوام کے حق میں صرف یہ نکلتا ہے کہ پہلے جو رشوت ایک جگہ دی جاتی تھی اب دو جگہ دینی پڑتی ہے، اور یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر اینٹی کرپشن کے افسران قابلِ اعتماد ہیں تو ان ہی کو اصل حاکم کیوں مقرر نہیں کیا جاتا، اس محکمہ کی وجہ سے پہلے افسران کے اوپر فطرتاً یہ اثر پڑتا ہے کہ جب ہم حکومت کی نظر میں یوں بھی رشوت خور ہوسکتے ہیں تو پھر کیوں ہم رشوت لینا شروع نہ کردیں، یعنی ان کی ذہنیت خود بخود مجرمانہ بن جاتی ہے۔

میں نے خود یہ سنا ہے، جب رشوت کی سزا اور تحقیق میں زیادہ شدت ہونے لگتی ہے تو رشوت خور افسران یہ کہہ کر رشوت کا بھاؤ اور گراں کر دیتے ہیں کہ بھئی اب تو رشوت لینا بڑا خطرہ مول لینا ہے اس لیے سَو کی بجائے ہزار دلواؤ تو کام ہو۔ اس لیے لازم ہے کہ جب تک ہماری ذہنیت تبدیل نہ ہو اور ہمارے معاشرہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو اس وقت تک جرائم کا انسداد ناممکن ہے۔

انسانی جبر و تشدد صرف ایک حد تک کام کرسکتا ہے لیکن اندر اور باہر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو چیز مؤثر ثابت ہوسکتی ہے وہ صرف "خوفِ خدا" ہے جو صرف دینی تعلیم ہی سے نہیں بلکہ دینی تربیت سے نصیب ہوتا ہے ورنہ بعض مرتبہ تعلیم کے نتیجہ میں انسان ایک پڑھا ہوا جن بن جاتا ہے اور وہ اَن پڑھ جن سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ جرائم کو فلسفیانہ طریقے سے کرنے کا عادی ہوجاتا ہے یعنی رات کی تاریکی کے بجائے دن کی روشنی میں کار پر بیٹھ کر سرکاری وردی کے بھیس میں جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اس لیے جب تک دینی تربیت نصیب نہ ہو اس وقت تک رشوت کے انسداد کے لیے

صرف آئین کا وضع کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کی سعی کرنی بھی ضروری ہے کہ جس ذریعہ سے ممکن ہو ہمارے قلوب پر حاضر و غائب کسی ذات کا خوف مستولی رہے۔ اور آپ اپنی اصطلاح میں اس کا نام جو چاہیں رکھیں مگر اسلام میں اس کا نام "تقویٰ اللہ" ہے۔

رشوت کی حقیقت ٹھیک وہ ہے جو چوری کے مال کی ہوتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر کھلم کھلا لوٹ کے مال کی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں نے اس کا نام "حق" رکھا ہے۔ اور وہ اسی لفظ سے کہہ کر وصول کیا جاتا ہے کہ ہمارا "حق" دلوائیے۔ یہ مال جس طرح وصول ہوتا ہے اس سے پہلے رشوت دینے والا دفتر سے باہر کھڑے ہو کر ماں اور بہن کی گالیاں دے کر مجبوراً اس مال کو ادب سے پیش کرتا ہے اور باہر نکل کر خود اس کو اور اس کے بچوں کو کڑھ کڑھ کر بد دعائیں دیتا ہے۔

شرح السنۃ میں ابو حمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ زکوٰۃ وصول کرنے پر ایک شخص کو مقرر فرمایا لوگوں نے اپنے مالوں کی زکوٰۃ بھی اس کو دی اور اس کے علاوہ اس کو بھی کچھ ہدیہ پیش کیا، لیکن وہ ایمانداری کا دور تھا اس لیے اس نے ان دونوں مالوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر صاف صاف بات کہہ دی کہ یہ مال تو زکوٰۃ کا ہے اور یہ مجھ کو بطور ہدیہ پیش کیا گیا ہے، آپؐ کو اس کی اتنی اہمیت محسوس ہوئی کہ آپؐ نے اس واقعہ کا تذکرہ منبر پر تشریف لا کر فرمایا اور بڑی ناگواری کے ساتھ یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ میں لوگوں کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجتا ہوں اور وہ واپس آ کر مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ یہ تو زکوٰۃ کا مال ہے اور یہ ہم کو ملا ہے، اگر یہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہتے تو پھر دیکھتے بھلا کون آ کر ان کو یہ ہدیہ پیش کرتا ہے، اس کے بعد آپ نے اس خطبہ میں اور بہت سی باتیں اپنی ناگواری کی ذکر فرمائیں۔ دیکھو مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۵۷ کتاب الزکوٰۃ) اس روایت کی روشنی میں جو حکام طرح طرح کے حیلے بہانے

بناکر حرام رشوت کو حلال بنانا چاہتے ہیں وہ اپنے دل میں خود ہی اس کا فیصلہ کرلیں۔

حضرت ابوامامہؓ کی دوسری حدیث بھی سامنے رکھیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حاکم کے لیے رشوت خوری سے بچنے کے لیے کتنی باریک بینی کی ضرورت ہے اس لیے اگر آپ اسلامی نقطۂ نظر سے حرام مال سے بچنا چاہتے ہیں یا موجودہ اصطلاح میں قوم کی خدمت چاہتے ہیں تو بے وجہ رشوت کو حلال بنانے کی کوشش نہ فرمائیے اور اس مغالطہ میں نہ رہیئے کہ اگر منہ پر آپ کو کوئی رشوت خور نہیں کہتا تو عوام میں بھی آپ معصوموں کی فہرست میں شمار ہوں گے۔ یا اگر حکومت آپ کو گرفت میں لا نہیں سکتی یا مصلحتاً اس سے اغماض کرتی ہے تو خدائی گرفت کے پنجہ سے آپ نکل سکتے ہیں؟ خوب یاد رکھیے کہ اس کا خمیازہ آج نہیں تو کل آپ کو بھگتنا ہوگا۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (بے شک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے) (پ ، رکوع ۱۰)

حکومت ابتداء میں بہت خوبصورت نظر آتی ہے لیکن انتہا میں باعث ندامت ہوتی ہے

(۱۸) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَى الْاِمَارَةِ وَسَتَكُوْنُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ۔ (رواہ البخاری۔ مشکوٰۃ ص ۳۲۰)

ترجمہ:۔ ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے۔ جبکہ تم امیر بننے کی حرص کروگے حالانکہ تمھارے لیے امارت و حکومت قیامت میں باعث ندامت ہوگی اور حکومت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک دُودھ پلانے والی عورت کی کہ ابتداء میں تو بڑی پیاری لگتی ہے اور جب دُودھ چھڑانے لگتی ہے تو وہی بہت بُری لگنے لگتی ہے (یہی حالت حکومت کی ہے کہ ابتداء میں حکومت بہت دلفریب

نظر آتی ہے لیکن جب اس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہی بہت خوفناک بن جاتی ہے۔)

تشریح:۔ حکومت کی ابتدائی دلفریبی اور پھر اس کے عواقب کی بدنمائی جن اعتبارات سے شرعی نظر میں ہے ان کو آخرت سے غافل دماغوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے لیکن سطحی طور پر جو بات موجودہ دماغوں میں آسکتی ہے وہ اتنی واضح ہے کہ کسی زیادہ غور و فکر کی محتاج نہیں بلکہ آنکھوں سے دنیا کے موجودہ واقعات دیکھ کر نظر آرہی ہے۔ ایک حکمران جب تخت حکمرانی پر بیٹھتا ہے تو ابھی وہ جم کر بیٹھنے بھی نہیں پاتا کہ موت اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے، یہ تو ہیں زمانہ کے انقلابات اور لوگوں کی بے عقلی کے ثمرات، لیکن اگر ان سے قطع نظر کرلی جائے تو پھر بھی ایک حاکم کا یہ فرض ہے، کہ وہ انصاف کے ساتھ یہ سوچے کہ کتنے لوگوں کی زندگی اور راحت کی ذمہ داری اس کے سر پر عائد ہوتی ہے جس سے موجودہ دور میں عہدہ برآ ہونا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے۔

اگر حکومت انسانوں کے جان و مال سے کھیلنے کا نام ہو جیسا کہ موجودہ لوگوں کی ذہنیت بن گئی ہے تو یہ بات تو دوسری ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ ایک گھرانے کے والدین پر اپنے بچوں کی صحت، ان کی غذا، ان کی رہائش، ان کی تعلیم و تربیت کی کتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور صحیح طور پر ان کو انجام دینا کتنا مشکل ہوتا ہے، تو صرف یہی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر نازک ذمہ داریاں چند افراد کی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی اس کے سر عائد ہو جاتی ہیں، ان سب کو کامیاب طریقہ پر پورا کرنا کیا کوئی آسان بات ہے لیکن حکومت کی چاشنی اور اقتدار کی ہوس ان سب کو ایسا فراموش کر دیتی ہے کہ گویا خدا کی مخلوق کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے جس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق بدل کر اپنے مغرور نفس کو خوش کرتے رہتے ہیں، کیا حکومت اسی کا نام ہے؟ اور صرف اسلام کا نہیں بلکہ انسانیت اور شرافت کا تقاضا یہی ہے۔؟

تو یاد رکھئیے کہ ایک حاکم کے بننے اور بگڑنے سے ایک ملک کا بگڑنا یا سنورنا وابستہ ہے اگر سنور گیا تو اس سے بڑھ کر خوش قسمت کون ہے اور اگر بگڑ گیا تو اس بدنصیب پر اس کے مرنے کے بعد بھی تاریخ لعنت کرتی رہتی ہے، اس لیے عاقل شخص کب اتنی بڑی ذمہ داریوں کو خوشی کے ساتھ اپنے سر لے سکتا ہے، جن کی ادائیگی یقیناً انسان کے بس سے باہر ہے۔

یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک شوہر جو اپنی چند بیویوں پر صرف ایک ادنیٰ درجہ کی حکومت رکھتا ہے، جب وہ اس کو ادا کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے تو پھر یہ کتنا مشکل ہو گا کہ ایک حاکم کروڑوں انسانوں کے حقوق ادا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس لیے اسلام میں حکومت کے لئے سب سے زیادہ نا اہل شخص وہ ہے جس کے دل میں حکومت کی سب سے زیادہ ہوس ہو۔

اسلام میں حکومت کا سب سے زیادہ نا اہل شخص وہ ہے جس میں اقتدار کی سب سے زیادہ ہوس ہو

(۱۹) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُھُمَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاكَ اللّٰہُ وَقَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ اِنَّا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا اَحْرَصَ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ لَا نَسْتَعْمِلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَہٗ۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۳۲۰)

ترجمہ: ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں تھا اور میرے ساتھ میرے دو چچا زاد بھائی تھے، ان میں سے ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکمران بنایا ہے، اس کے کسی حصہ پر ہمیں بھی حاکم

بنادیں اور دوسرے نے بھی یہی درخواست کی، اس پر آپ نے ناگواری سے فرمایا خدا کی قسم! جو شخص بھی ہم سے حکومت کا طلبگار ہوگا یا اس پر حریص نظر آئے گا ہم اس کو ہرگز حاکم نہیں بنائیں گے۔ ایک روایت میں یوں ہے جو شخص خود کارندہ بننے کا طالب ہو ہم اس کو اپنا کارندہ مقرر نہیں کریں گے۔

(۲۰) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلِ الْاِمَارَۃَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَۃٍ وُکِّلْتَ اِلَیْھَا وَاِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَۃٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۳۲۰)

ترجمہ:۔ عبدالرحمٰن بن سمرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت فرمائی کہ دیکھنا حکومت کی خواہش کبھی نہ کرنا کیونکہ اگر خود سوال کرنے کے بعد تم کو حکومت مل گئی تو خدائی اعانت تمہارے ساتھ نہ ہوگی اور تم کو خود ہی سنبھالنی پڑے گی اور اگر بے مانگی ملی، تو اس کے نظام میں خدا تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔

شرح:۔ اس حدیث سے اوپر کی حدیث کی شرح خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو شخص خود طالبِ حکومت ہو اس کو شرعاً حاکم بنانا کیوں ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت اتنی بڑی ذمہ داری ہے جس کو انسان اپنے ضعیف ہاتھوں سے کبھی انجام نہیں دے سکتا، جب تک کہ اس کی پشت پر خدائی طاقت نہ ہو۔ اس کو صرف ایک مولویانہ بات نہ سمجھیے بلکہ کسی جہاز کے کپتان سے پوچھ کر دیکھ لیجئے جو قسم قسم کے آلات کے باوجود جب سمندر میں اپنے جہاز کو چلاتا ہے تو اس کا تعلق خواہ کسی مذہب سے ہو مگر اس کی نظر ہمیشہ قدرتِ الٰہیہ پر لگی رہتی ہے کیونکہ اپنی آنکھوں سے وہ یہ دیکھتا رہتا ہے کہ اب اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کی اتنی بڑی زبردست مخلوق کے ساتھ ہے کہ اس کے بڑے سے بڑے جہاز کی حیثیت اس کے مقابلہ میں ایک تنکے کے برابر بھی نہیں۔

بیشک وہ آلات کے ذریعہ یہ پہچان لیتا ہے کہ طوفان کس سمت سے آرہا ہے۔ اور کتنی رفتار کے ساتھ آرہا ہے لیکن ابھی تک کوئی آلہ ایسا ایجاد نہیں ہوا جو اس آنیوالے طوفان کا رُخ اس کے جہاز کی جانب سے بدل کر دوسری جانب کر سکے۔ اس لیے وہ جانتا ہے کہ ہر قسم کے آلات کے باوجود نجات مشکل ہے اور اس لیے اس کی نظر ہمیشہ زبردست قدرت پر لگی رہتی ہے، اسی طرح جو شخص حکومت کو از خود طلب کرتا ہے اس کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کتنی مختلف طبائع اور کتنے مختلف المزاج لوگوں کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے اور اکثر حالات میں ممکن ہے بالخصوص ہمارے دور میں کہ کسی سمت سے بھی اور کسی وقت بھی اچانک انسانوں کے جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہو تو کیا اس کے دست و بازو میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اس کا مقابلہ خود کر سکتا ہے۔

اسلامی قانون میں ظاہری نظام کے ساتھ ہر ہر موقع پر اس کا رشتہ کہیں باطنی نظام سے کٹا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ اور یہی مسلمانوں کی اور اسلامی قانون کی بڑی روح ہے جو آج ہمارے موجودہ دماغوں سے نکل چکی ہے۔ مثلاً آفتاب اور مہتاب کا طلوع اور غروب ہونا یہ قدیم فلسفہ میں حرکتِ فلک اور خود ان سیارات کی حرکت کا نتیجہ تھا۔ اور موجودہ زمانہ میں یہ سب کچھ زمین کی حرکت سے متعلق ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر میں ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک جانب پر زور نہیں دیا گیا لیکن یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ اتنے بڑے بڑے سیارات خواہ کتنے ہی اسبابِ ظاہری کے ساتھ مربوط نظر آئیں لیکن باطنی نظر میں ان پر خدا کا ایک زبردست فرشتہ بھی مقرر ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھوں میں وہ مسخر ہوتے ہیں جیسا کہ آج کل جو راکٹ (Rocket) آسمان کی جانب چھوڑے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ایسے آلات بھی رکھے جاتے ہیں جو ان کو مختلف طبقات سے گذرنے میں مدد دیں۔ اور اگر وہ اپنا راستہ بدلیں تو یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ حتی المقدور انھیں اپنے راستوں پر قائم رکھا جائے مگر اتنی ترقیات کے باوجود بھی

اس بارے میں صحیح کامیابی نہیں ہو سکی تو پھر قدرت بھی اگران دو ز بردست سیاروں کو اپنے اپنے مدار پر گھومنے کے لیے کوئی فرشتہ متعین کردے تو اس پر ہنسی اڑانا یہ عقل کی بات نہیں بلکہ بے علمی کی بات ہے، پھر ضعیف انسان کی کیا طاقت ہے کہ وہ بھاری بھاری ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے حریص بن جائے، بس یہی ایک بات اسکی نااہلیت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اپنی قابلیّت سے بڑھ کر کسی ذمہ داری کا اپنے سر لینا ذلّت کا پیش خیمہ ہے

(۲۱) عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْبَغِىْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يُّذِلَّ نَفْسَهٗ قَالُوْا وَكَيْفَ يُذِلُّ نَفْسَهٗ قَالَ يَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيْقُ۔ (رواه الترمذى وابن ماجة والبيهقى فى شعب الايمان۔ مشكوٰة ص ۲۴۴)

ترجمہ:۔ حضرت حذیفہ رضؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا بھلا اپنے نفس کو کوئی کیسے ذلیل کرسکتا ہے، فرمایا ایسا بار اٹھا لینا جس کے اٹھانے کی اس میں طاقت نہ ہو (یہ ذلیل ہی کرنا ہے)

فائدہ:۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دماغ فطرتاً ہی بلند تھے پھر اسلام نے آکر ان کو اور اتنا بلند کردیا تھا کہ ان کے فہم میں اپنے نفس کے ذلیل کرنے کی کوئی صورت ہی نہ آسکی، آپؐ نے ان کو بتایا کہ کبھی عزت کے کام میں بھی ذلت کا خمیازہ بھگتنا پڑجاتا ہے، براہ راست ذلت کے کاموں سے بچنا سب جانتے تھے لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک قدم اور آگے بڑھا کر سمجھایا کہ ایسے عزت کے کاموں

میں پھنسا جن کا انجام ذلت ہو یہ بھی مؤمن کا کام نہیں، پھر معلوم نہیں ذلت کا جو تعلق یہود کے ساتھ تھا، وہ مسلمانوں نے اپنے ساتھ کیسے رکھا ہے، اگر اقتدار کی ہوس رکھنے والے اس نکتے کو سمجھ لیتے تو شاید ہر دانا شخص اس سے بچنے کی کوشش کرتا۔ اس کی تفصیل جواہر الحکم حصہ دوم کی حدیث نمبر ۱۹۔۲۰ میں ملاحظہ فرمائیے۔

غیر محقّق باتوں کا غیر ذمّہ دارانہ طور پر نقل کرنا بھی اسلام میں ایک بڑا عیب شمار ہوتا ہے

(۲۲) عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ رض قَالَ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ اَوْقَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ لِاَبِیْ مَسْعُوْدٍ مَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ زَعَمُوْا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ بِئْسَ مَطِیَّةُ الرَّجَالِ

(رواہ ابوداؤد وقال ان اباعبد اللہ حذیفۃ۔ مشکوٰۃ ص ۲۶۳)

ترجمہ: ۔ حضرت ابومسعود اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما نے باہم ایک گفتگو میں یہ سوال کیا (راوی کو شک ہے کہ یہ سوال کس نے کیا، ابومسعود رضی اللہ عنہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یا حضرت حذیفہؓ نے ابومسعود رضی اللہ عنہ سے) کہ آپ نے کلمہ زَعَمُوْا (لوگوں کا گمان ہے) کے استعمال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ کلمہ بے تحقیق باتوں کے چلتا کرنے کا بہت بُرا طریقہ ہے۔

شرح: ۔ ابن قتیبہ نے "مختلف الحدیث" میں اور امام طحاوی نے "مشکل الآثار" میں اس روایت پر طویل کلام کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کسی بات کا خود یقین حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک صرف اپنی گردن رہا کرنے کے لیے اس کو لوگوں کی طرف نسبت کر کے بیان کر دینا شریعت کی نظر میں یہ بھی قابلِ مواخذہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کذب اور جھوٹ اڑانے کی اہمیت شرعی نظر میں کتنی

ہوگی۔ اگر صرف اسی حدیث پر عمل کر لیا جائے تو آج بے سروپا خبروں کے پھیل جانے کی وجہ سے جو بے بنیاد فتنے مسلمانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اور حکومتوں کے لیے باعثِ تشویش اور مسلمانوں میں باعثِ تفریق بن جاتے ہیں وہ ہرگز نمودار نہ ہوں۔

قرآن مجید نے بھی بے تحقیق خبروں کو قبول نہ کرنے کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (اے ایمان والو! اگر آئے تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر تو تحقیق کر لو، کہیں جا نہ پڑو کسی قوم پر نادانی سے، پھر کل کو اپنے کیے پر لگو پچھتانے) (پ۲۶، رکوع ۱۳)

آیتِ بالا میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اکثر نزاعات و مناقشات کی ابتدا چونکہ جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اس لیے اختلاف و تفریق کے اس سرچشمہ کو بند کرنے کے لیے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی خبر کو یوں ہی بلاتحقیق نہ مانا کرو بلکہ پہلے اچھی طرح اس کی تحقیق کر لیا کرو ورنہ لبسا اوقات بعد میں تم کو پشیمانی اٹھانی پڑے گی۔

پارٹی بندی اور گروہ بندی کے لیے اسلامی معاشرت میں کوئی جگہ نہیں ہے

(۲۳) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ خَطَبَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ ثُمَّ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّهُ لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ وَمَا كَانَ مِنْ حِلْفٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَإِنَّ الْإِسْلَامَ لَا يَزِيدُهُ إِلَّا شِدَّةً (رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ ص ۳۰۳)

ترجمہ:۔ عمرو بن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن یہ اعلان فرمایا کہ آج سے اسلام میں دوستی کا عقد کوئی چیز

نہیں۔ جو عقد زمانۂ جاہلیت میں قائم ہو چکا ہے تو اسلام اس کا مخالف نہیں بلکہ اس کو اور مضبوط کرتا ہے۔

شرح:۔ اسلام سے قبل عرب کا تمام ملک پارٹیوں اور قبائل میں بٹا ہوا تھا گھر گھر میں اختلافات اور قبیلہ قبیلہ میں جنگ وجدال چھڑا رہتا تھا، اسلام کے آنے کے بعد جن نعمتوں سے ان کو سرفراز کیا ان میں سے ایک نعمتِ عظمیٰ اتفاق کی نعمت تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ط (اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جبکہ تھے تم دشمن آپس میں، پھر الفت دی تمہارے دلوں میں، اب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی بھائی (پ۴ رکوع ۲)

عرب ان ہی اختلافات کی وجہ سے ہر وقت خوف وہراس کی زندگی بسر کیا کرتے تھے اس لیے ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہر قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے ساتھ محبت کا ایسا مضبوط عقد باندھے جو دوستی ودشمنی کے وقت اس کے کام آئے اور اسی کو وہ عقدِ محالفت سے تعبیر کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر ایک حلیف کسی کو قتل کر دیتا تو اس کے جرم میں اس کے دوسرے حلیف شخص کو جو مجرم نہ ہوتا گرفتار کر کے اس وقت کے دستور کے موافق سزا دی جاتی تھی گویا اس طرح یہ تعاون جنگ وجدال کے لیے ایک تعاون تھا۔

آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں جن جن اہم باتوں کا اعلان فرمایا ان میں سے اس غلط عقدِ محالفت کی تردید بھی تھی اور خلاصۂ کلام یہ تھا کہ اسلام اس قسم کی گروہ بندی اور پارٹی بندی کا سرے سے مخالف ہے اب رہا امورِ خیر میں پارٹیاں بنانا اور اس بارے میں کوئی جدید عقد کرنا تو اس کی اس لیے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس عقد کا جو کچھ تقاضا ہو سکتا تھا اس سے بڑھ کر تقاضا خود اسلامی اخوت کا ہے، اس لیے اسلامی معاشرت میں پارٹی بندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، نہ موافق اور نہ مخالف۔

موجودہ حکومتوں میں مخالف پارٹی کا وجود لازمی قرار دیا گیا ہے، وہ کن اسباب کی بنا پر ہے، وہ اس وقت کا تعلیم یافتہ طبقہ سب جانتا ہے لیکن میرے نزدیک اس کی حقیقت صرف نقالی اور ترقی یافتہ اقوام سے مرعوبیت کے سوا کچھ نہیں، ان صاحبان نے اس طرف تو توجہ کی کہ ترقی یافتہ ملکوں میں مخالف پارٹی کا وجود کس قدر ضروری سمجھا گیا ہے مگر اس کا دوسرا پہلو بالکل نظر انداز کر دیا یعنی یہ کہ وہ کس ماحول میں اور کس معاشرت میں اور کن نظریات کے ماتحت حکومت کو ہوشیار رکھنے کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے۔ اور نیم ترقی یافتہ ملکوں میں اس کی استعداد اور اہلیت موجود ہے یا نہیں؟ اگر آپ انصاف کریں گے اور دیگر قوموں کی نقالی سے علیحدہ ہو کر مخالف پارٹی کے عنوان ہی کو سوچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اعضائے حکومت میں اختلاف ڈالنے کے لیے یہ عنوان ہی کافی ہے اور اس عنوان کی وجہ سے اس کی ذہنیت فطرتاً یہ بن جانی ضروری ہے کہ وہ موافق پارٹی کی تجویز میں کوئی نہ کوئی قانونی سقم نکالتا رہے۔

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ موافق پارٹی فوراً اس سقم کی جوابدہی کے درپے ہو جاتی ہے اور اس تخریب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حقیقت بینی کی بجائے پارٹی بندی کی روح کام کرنے لگتی ہے۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کس صورت میں ہے بلکہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہماری پارٹی کے غلبہ کی صورت کیا ہے؟ اس لیے اسلام پارٹی بندی سے بالاتر ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور وہ اراکینِ حکومت میں سے ہر رکن کے دماغ پر یہ زور ڈالتا ہے کہ وہ خود اپنے ضمیر میں اس عظیم مقصد کے لیے موافق اور مخالف پہلوؤں پر غور کرے۔ لیکن اگر ہماری فطرت ہی اتنی پست ہو چکی ہے کہ ہم اسلامی فلاح و بہبود کی بجائے اپنی شخصیت کا تحفظ اور بلندی چاہتے ہیں تو پھر مخالف پارٹی بندی کا اکھاڑا بنانے سے بھی کوئی مستقل فائدہ نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی روح یہ ہے کہ مسلمانوں کی جو خدمت کی جائے وہ خلوص پر مبنی ہو، اور

لوجہ اللہ ہو اور اس میں کسی کی رعایت، مخالفت و موافقت، خوشامد اور خوف کا کوئی تصور بھی آئے۔ حکومت کی جو پارٹی بھی ہو اس کے ہر ایک فرد کا یہ فرض ہے کہ جو فرائض مخالف پارٹی کے ہوتے ہیں وہ خود اس کو انجام دے، بلا لحاظ اس کے کہ اکثریت کس طرف ہے اور اقلیت کس طرف، اور اگر ہمارا مقصد ایک ہو تو اس کو جتنا ہم صحیح طور پر متحد ہو کر سوچ سکتے ہیں، اختلاف کی صورت میں فطرتاً اتنا صحیح نہیں سوچ سکتے۔ اس غلط رسم میں پڑ جانے کے بعد اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے تو یہ بات دوسری ہے۔

مسلمان کو چاہیئے کہ وہ صحیح بات پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے اور عوام کے ہر شور و شر کی شرکت سے احتراز کرنا لازم سمجھے

(۴۲) عَنْ حُذَيْفَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَاءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔ (رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص ۴۳۵)

ترجمہ:۔ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے سوچے سمجھے ہر شور و شر میں پبلک (عوام (Common Peop) یعنی عوام کے ساتھ شریک ہونے کی عادت چھوڑ دو یعنی یوں مت کہا کرو کہ اگر لوگ کوئی اچھا کام کریں گے تو ہم بھی وہی کام کریں گے اور اگر لوگ غلط راہ چل کر ظلم کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ اس میں ان کے شریک رہیں گے تم کو چاہیئے کہ تم خود اپنی ایک صحیح رائے قائم کرو اور ان بے علمی کی باتوں کے بجائے یہ کرو کہ اگر لوگ بھلا کام کریں تو تم ان کے ساتھ اس میں ضرور شریک ہو اور اگر وہ کوئی غلط راستہ اختیار کریں تو انکے ساتھ برائی میں ہرگز شرکت مت اختیار کرو۔

تشریح:۔ موجودہ زمانہ میں اگر آپ غور فرمائیں گے تو ہمارے معاشرہ میں خواہ

وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، یہ رسم بدپڑ چکی ہے کہ لوگ اپنی ذاتی رائے کوئی نہیں رکھتے بلکہ خوشی یا ناخوشی سے اپنی پارٹی کے ساتھ رائے دینا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لیے حکومت میں پارٹیوں کا وجود فائدہ مند نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں حریتِ رائے کے سامنے اپنی پارٹی کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں رکھی گئی، بشرطیکہ وہ خلوص اور دیانت پر مبنی ہو اگر یہ اصول ملحوظ رکھا جائے تو آپ خود ہی انصاف فرمالیں کہ مخالف پارٹی کی پھر ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے اور اگر وہی تخریب اور پارٹی بندی کی روح کارفرما ہے تو پھر مخالف پارٹی کا فائدہ کیا نکل سکتا ہے۔ کاش کہ ہمارا اختلاف پارٹی بندی سے بلند ہوکر محض آزادانہ ہوتو اگر مسلمانوں کی مشترکہ جماعت کا فیصلہ ہماری رائے کے خلاف بھی ہوجائے تو ہمارے خلوص کا تقاضا یہی ہونا چاہیئے کہ ہم کو اس میں ناگواری محسوس نہ ہو۔

اوس بن شرحبیل ؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی ظالم کے ساتھ اس نیت سے چلا کہ ظلم میں اس کی مدد کرے تو وہ شخص اسلام کی سرحد سے باہر نکل گیا (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) اس حدیث سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام میں صرف اپنی پارٹی کی رعایت سے رائے دینا اور اس پر غور نہ کرنا کہ حق کس طرف ہے اور ناحق کس طرف، یہ کتنی سخت بات ہے۔

حکومتِ اسلامیہ میں تفرقہ اندازی ناقابلِ عفو جرم ہے۔

(۲۵) عَنْ عَرْفَجَةَ ؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ هَنَاتٌ وَّهَنَاتٌ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَّنْ كَانَ (رواہ مسلم مشکوٰۃ ص ۳۲۰)

ترجمہ:۔ عرفجہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا آئندہ زمانہ میں قسم قسم کے فسادات ہونگے، اگر کوئی شخص ایسی حالت میں جبکہ لوگ کسی ایک حاکم کو تسلیم کر چکے ہیں اُن میں پھوٹ ڈالنے کا ارادہ کرے تو اسکو قتل کر دینا چاہیئے، خواہ وہ کوئی بھی شخص ہو۔

شرح:۔ یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ اسلامی قانون کے مطابق جب اہلِ حل و عقد کسی شخص کو اپنا امیر و خلیفہ اور آجکل کی اصطلاح میں اپنا حاکم مقرر کر لیں، تو اب آخری حد تک اس کی اطاعت کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور ذرا ذرا سے اختلافات پر حکومت کی تبدیلی کو اسلامی سیاست کے لیے انتہائی ضعف کا باعث سمجھا گیا ہے اس لیے جہاں آئے دن انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں وہاں نہ خود حاکم مطمئن رہتا ہے نہ رعایا اور نہ ملک ہی کو اطمینان کی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ کسی حکومت کی مضبوطی کے لیے عوام کا اعتماد اور ملک کی یک جہتی لازمی چیز ہے۔ اس لیے شریعت نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ جب کوئی سردار مقرر ہو جائے تو جماعت کو چاہیئے کہ دل سے اس کی اطاعت کرے، اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کبھی زندگی کی کش مکش سے رہا نہیں ہو سکے گی۔ کسی انسان کا قتل کرنا کوئی اچھی بات نہیں، بُری بات ہے لیکن اگر اس کے وجود سے جماعتی فساد پیدا ہوتا ہے تو وہ اس سے بڑھ کر بُرا ہے۔ اس لیے جب اس فساد کا ازالہ کسی اور طرح ممکن نہ ہو تو پھر خود اس مفسد ہی کو نیست و نابود کر دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اگر مذکورہ بالا حقیقت پیشِ نظر رہے اور خوفِ خدا اور دیانت دل میں موجود ہو تو انقلابات کا خود بخود سدِ باب ہو سکتا ہے، جہاں تک تجربہ شاہد ہے، یہی ثابت ہوتا ہے کہ انقلابات بیشتر اقتدار کی ہوس میں رُونما ہوتے ہیں اور اسی لیے وہ نہ قوم کے حق میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں اور نہ ملک کے لئے باعث دوام بلکہ بعض اشخاص اپنے معاشرہ کا جائزہ لیے بغیر موجودہ اقتدار پر مفسد ہونے کا حیلہ بنا کر فساد کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھا لینا

اپنے لیے باعثِ کامیابی سمجھ لیتے ہیں اور اس پر غور نہیں کرتے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے وہ کوئی دوسری قابلِ قدر شخصیت جو اسلامی معیار پر پوری اتر سکتی ہو، برسر اقتدار لا سکتے ہیں کہ نہیں۔ یہ فیصلہ اپنی ذاتی رائے سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ جس طرح اسلامی اقتدار اہلِ حل و عقد کی رائے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس کا عزل بھی انھیں کی رائے کے تابع ہوتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جو لوگ علم و فہم نہیں رکھتے وہ صحیح رائے بھی نہیں رکھتے اس لیے یہاں ان کی رائے کوئی رائے نہیں کہی جا سکتی۔

جن ممالک میں فیصلہ اکثریت کی رائے سے ہوتا ہے ان میں علم و فہم کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن ہم نے اپنی نافہمی سے اس طرف تو نظر نہیں کی اور بے سوچے سمجھے ان کی نقالی شروع کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اور اسی قسم کی بہت سی چیزوں میں ہم خود اپنی نافہمیوں کی بدولت دن بدن خود اپنی قوم اور غیروں کی نظروں میں بھی گرتے چلے جاتے ہیں۔

وہ آخری حد جس کے بعد کسی اسلامی اور صالح معاشرہ کے لیے غیر صالح حاکم کے ساتھ مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

(۲۶) عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ رض قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَکُوْنُ عَلَیْکُمْ اُمَرَآءُ تَعْرِفُوْنَ وَتُنْکِرُوْنَ فَمَنْ اَنْکَرَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ کَرِہَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰکِنْ مَّنْ رَضِیَ وَتَابَعَ قَالُوْا اَفَلَا نُقَاتِلُھُمْ قَالَ لَا مَا صَلَّوْا لَا مَا صَلَّوْا۔ اَیْ مَنْ کَرِہَ بِقَلْبِہٖ وَاَنْکَرَ بِقَلْبِہٖ۔ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ ص ۳۱۹)

ترجمہ:۔ حضرت ام سلمہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آئندہ تم پر ایسے حاکم مقرر ہوں گے کہ ان میں بھلی باتوں کے ساتھ بری باتیں بھی ہوں گی، اب

جس شخص نے ان کی بری باتوں پر اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا اور جو دل ہی دل میں کڑھتا رہا وہ بھی بچا رہا، لیکن جو ان کی بری باتوں پر خوش ہوا اور ان کے ساتھ ساتھ رہا وہ ہلاک ہوا اس پر انھوں نے عرض کیا کہ کیا ایسے حاکموں کے ساتھ ہم مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیں، آپ نے فرمایا ہرگز نہیں، جب تک کہ وہ لوگ نمازیں پڑھتے رہیں۔

شرح:۔ یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ اسلام نے اطاعت شعاری کے لیے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں آرار کا اختلاف کبھی ختم نہیں ہو سکتا، ہر قابل سے قابل اور صالح سے صالح شخصیت کے ساتھ دوسرے شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ بلکہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، لہٰذا اگر یہاں ہر اہل و نااہل کو ہر بات پر نکتہ چینی اور اختلاف کرنے کی آزادانہ اجازت دے دی جائے تو نظامِ حکومت قائم رکھنے کا کوئی راستہ ہی نکل نہیں سکتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی حد خود صاحبِ شریعت کی جانب سے مقرر کر دی جائے، لیکن اس سے قبل یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ یہ خطاب کس ماحول میں تھا اور کن کو تھا؟

یہاں متکلم بہ نفسِ نفیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے مخاطب تمام روئے زمین کے چیدہ اور سب سے پاکیزہ نفوسِ قدسیہ ہیں یعنی صحابہ کرامؓ، اس وقت کے معاشرہ کی بلندی کا حال پوچھنا کیا ہے، ہر ہر متنفس خدا ترس، بنی نوع انسان کا ہمدرد اور مجسم ایثار ہے، معصیت، خود غرضی اور انسانوں کے ساتھ بدسلوکی اگر کہیں نظر آئے بھی تو اس کے ساتھ اس سے زیادہ توبہ و استغفار، تضرع و ابتہال کا شور مچا ہوا ہے۔ نافہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دور تھا جس میں مسلمانوں کا کام صرف مسجدوں میں پڑے رہنا تھا اور ان ظالموں کو اتنا بھی نظر نہیں آتا کہ یہ زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ اسلام کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور اینٹوں کی بجائے اس میں مسلمانوں کے سر اور پانی گارے کی بجائے مسلمانوں کے خاک و خون میں غلطاں جسم

بنیادیں رکھے جا رہے تھے۔ وہ نمازی ضرور تھے مگر ایسے نمازی تھے کہ اگر عین جنگ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آ جاتا تو اپنے رب کے سامنے دربیں صف آرا ہو جاتے اور ٹھیک اسی وقت دشمنوں کے مقابلہ کے لیے بھی سرگرم رہا کرتے۔ حاکم و محکوم مولا و غلام، امیر غریب میں کسی جگہ کوئی فرق نظر نہ آتا تھا ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اب آپ سوچیں کہ ایسے صالح معاشرہ کا حاکم کتنا بڑا صالح شخص ہونا چاہیئے، اور اگر بدقسمتی سے کوئی غیر صالح حاکم مسلط ہو جائے تو اس کے متعلق صلاحیت کی شرائط میں کہاں تک نرمی کی جا سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دین سب کا سب ہی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن نماز کو دینی ارکان میں جو حیثیت حاصل ہے اس کو ایسا سمجھئے جیسا کہ وہ بانس کہ جو درمیانِ خیمہ میں لگا ہوا ہوتا ہے کہ اس کو اگر گرا دیا جائے تو سارا خیمہ نیچے آ پڑتا ہے گویا کہ خیمہ کی نہ صورت قائم رہتی ہے اور نہ اس کے تاننے کا جو مقصد تھا وہ باقی رہتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی صالح معاشرہ کا حاکم بد دینی میں اس نوبت کو پہنچ جائے کہ اس کو اقامتِ صلوٰۃ جیسے فریضہ کی بھی پروا ہی نہ رہے تو کیا وہ ایسے صالح معاشرہ کے لیے قابلِ برداشت ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے جو تمکین فی الارض اور حکومت اسلامی کے اہم فرائض بیان کئے ہیں وہ ان الفاظ میں ذکر فرمائے ہیں:۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا) (پ، رکوع ۱۲)

ایت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو زمین کے کسی ٹکڑے پر اطمینان اور شرکت

کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہو جائے تو ان کے فرائض میں سب سے پہلے یہ ہے کہ وہ اس سرزمین میں صرف اتنا ہی نہیں کہ خود نمازیں پڑھیں بلکہ صحیح طریقہ پر نمازوں کے پڑھنے کا عام دستور طاقت کے ساتھ قائم کر دیں اور مالیات کے سلسلہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا پورا اہتمام کریں اور معاشرہ کی پوری پوری اصلاح کرنے کے لیے عمدہ عمدہ باتوں کے احکام نافذ کریں اور تمام فواحش و منکرات کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دیں، لیکن اگر خدانخواستہ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس نوبت کو جا پہنچے کہ جو شخص نمازی ہو الٹا اس کی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں اور اس پر آوازے کسے جانے لگیں تو کیا اب بھی حاکم کی اطاعت سے دست کشی کے لیے یہی حد مقرر کی جا سکتی ہے، ظاہر ہے کہ اگر ان حالات میں اسی حقیقی حد کو باقی رکھا جائے، تو بہت ممکن ہے کہ ہماری بدقسمتی سے ایک بے نمازی حاکم کے بجائے دوسرا اس سے بدتر بے نمازی حاکم بیٹھا ہوا نظر آئے اس لیے حدیثوں کو سمجھنے کے لیے صرف لفظوں کا رٹنا کافی نہیں بلکہ بہت سے امور اور مصالح کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہوگا، ان حالات میں یہ سوال باقی رہتا ہے تو اچھا پھر وہ حد کیا ہے کہ جس کے بعد مسلمانوں کے حاکم کا قابل عزل ہونا ضروری قرار پائے تو اس کے جواب کے لیے اس وقت کے معاشرہ کا جائزہ لینا ضروری ہوگا اسلیے کوئی ایک جواب نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ معاشرہ کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہے گا۔ اگرچہ آخری جواب وہی ہوگا جو حدیث میں مذکور ہے۔

مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۱۹ پر ایک حدیث ہے جس سے مذکورہ بالا مضمون کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے اور اس آخری حد کے متعین کرنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔

عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم آپؐ کا ہر فرمان سنیں گے اور مانیں گے، فراخی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی، خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی، غرض کہ ہر حالت میں اور اس بات پر بھی کہ اگرچہ ہماری حق تلفی کی جائے اور دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دی جائے اور اس پر کہ ہم سچی بات کا

اعلان کرتے رہیں گے، جہاں بھی ہوں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ہرگز پروا نہیں کرینگے
اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہم یں جو شخص حکومت کا اس وقت اہل ہوگا اس کے
ساتھ کبھی جھگڑا نہیں ڈالیں گے ہاں صرف اس صورت میں جبکہ کھلم کھلا کفر نظر آتے لگے
اور وہ بھی ایسا کہ جس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہمارے پاس کھلا ہوا ثبوت موجود ہو۔
(بخاری، مسلم)

اس حدیث سے اس بات کی اہمیت دریافت کی جاسکتی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں مسلمانوں کا حاکم بدقسمتی سے ایسا شخص منتخب ہوجائے جس کے دل میں شریعت کا لحاظ و پاس باقی نہ رہے تو اسلام اندرونی خلفشار کی بجائے اس ناقابلِ برداشت فساد کو کہاں تک برداشت کرنے کی ہدایت کرتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب معاملہ اسلام کی سرحد سے نکل کر کفر کی سرحد میں داخل ہوجائے تو اب اس کا نام ہی اسلامی حکومت باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے مسلمانوں کو نقصان ہو یا نفع، ان کی سیاست بنے یا بگڑے، اس کے برداشت کرنے کا حکم کیسے دیا جاسکتا ہے۔ ترجمان السنۃ جلد۳ صفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۸ پر اس کی تفصیل ملاحظہ کی جائے۔

حاکم جب تک حاکم رہے وہ آخری لمحۂ حکومت تک عوام کی نظروں میں محترم رہنا چاہیئے

(۲۷) عَنْ زِيَادِ بْنِ كُسَيْبٍ الْعَدَوِيِّ رحمہ اللہ قَالَ كُنْتُ مَعَ اَبِيْ بَكْرَةَ تَحْتَ مِنْبَرِ ابْنِ عَامِرٍ وَهُوَ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَقَالَ اَبُوْ بِلَالٍ اُنْظُرُوْا اِلٰى اَمِيْرِنَا يَلْبَسُ ثِيَابَ الْفُسَّاقِ فَقَالَ اَبُوْ بَكْرَةَ اُسْكُتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَهَانَ سُلْطَانَ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ اَهَانَهُ اللّٰهُ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن غریب، مشکوٰۃ ص ۳۲۱)

ترجمہ:۔ زیاد بن کسیب عدوی رضؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکرہ رضؓ کے ساتھ ابن عامر کے منبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس وقت باریک کپڑے پہنے ہوئے خطبہ دے رہے تھے تو اس کو دیکھ کر ابو بلال نے کہا کہ ذرا ہمارے امیر کو دیکھو تو ایسا لباس پہنے ہوئے ہے جیسا فاسق لوگوں کا ہوتا ہے، اس پر ابوبکرہ رضؓ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا خاموش رہ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے یہ خود سنا ہے کہ جس نے خدا کے مقرر کردہ حاکم کی بے عزتی کی اللہ تعالیٰ اس کی بے عزتی کرے گا۔

شرح:۔ شرعی نظر میں حاکم اور محکوم اپنے اپنے رتبہ میں سب محترم ہیں اور ہمارے موجودہ زمانہ کی ذہنیت کی طرح ایک ادنیٰ شخص کو بھی ذلت کی نظر سے دیکھنا کسی حاکم کے لیے روا نہیں رکھا گیا، یہ بات دوسری ہے کہ جرم کی نوعیت کے لحاظ سے جس سلوک کا وہ مستحق ہے وہ اس کے ساتھ کرنا ضروری ہے لیکن صرف حکومت کے نقطۂ نظر سے اس کو ذلیل سمجھنا یہ بدترین ذہنیت ہے، جو شریعت محکوم کے متعلق یہ ذہنیت پیدا کرنا چاہتی ہو اب تم خود سوچ لو کہ وہ حاکم کے متعلق کتنی بلند ذہنیت پیدا کرنا چاہتی ہوگی۔

حاکم و محکوم کے اس خاص علاقہ کو چھوڑ کر شرعی معاشرت کا ایک عام قانون یہ ہے کہ جو چھوٹا شخص اپنے سے عمر میں بڑے شخص کی تعظیم نہ کرے اور جو بڑی عمر کا آدمی اپنے چھوٹے پر شفقت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں، جہاں عام معاشرہ کے لیے یہ ضروری ہو وہاں حاکم و محکوم کے مابین نظام قائم رکھنے کے لیے جتنی عاقبت اندیشی اور احتیاط کے ساتھ اسکے احترام کو لازم قرار دیا ہوگا وہ ظاہر ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حاکم جتنا چاہے مطلق العنان ہو کر اپنی رعایا کے سامنے انگشت نمائی کے سامان پیدا کرتا رہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر دور میں ہر حاکم منصب حکومت پر بیٹھ کر صحیح توازن قائم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا جب تک اس کے قلب پر خدا تعالیٰ کے خوف اور خشیت کا پورا استیلاء نہ ہو اب اگر ان حالات میں رعایا کو نکتہ چینی اور اعتراضات کی عام اجازت دے دی جائے تو

پھر ایسے حاکم کا رعب بھلا کیا قائم رہ سکتا ہے اور جب تک حاکم کا رعب نہ ہو اس وقت تک دنیوی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے حدیثِ بالا میں ابو بکرہ رضؓ صحابی نے اپنے حاکم کی توہین گوارا نہیں کی اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا حکیمانہ ارشاد سنایا جو اہلِ فہم کو رہتی دنیا تک یاد رکھنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ حکومت اور سلطنت کا قرعہ جسکے نام نکلتا ہے وہ خدائی معیت کا عکس ہوتا ہے، اب اگر وہ ظالم یا نا اہل ہے تو بھی کسی مصلحت سے قدرت نے اس کا انتخاب کیا ہے اور اگر صالح اور اہل ہے تو بھی باطنی نظر میں وہ اس کی پسندیدگی کا ثمرہ ہے۔ لہذا بادشاہ کی توہین کرنا گویا خدائی انتخاب کی توہین ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو پہاڑ سے ٹکرائے گا خود پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں، ایک یہ کہ سلطان اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس بادشاہ کا انتخاب اسلامی نظریات کے مطابق ہوا ہو، خواہ معاشرہ کے فساد کی وجہ سے اس وقت کوئی مفسد شخص ہی برسرِ اقتدار کیوں نہ آجائے۔ دوسری بات یہ کہ بادشاہ کی توہین کرنا یہ بالکل دوسرا مسئلہ ہے، اب رہا آئین و ضوابط کے ماتحت بوقتِ ضرورت کسی غیر شرعی معاملہ کے متعلق سوال کرنا تو یہ اہلِ فہم اور سنجیدہ افراد کا حق ہے جو مطلقاً ان سے سلب نہیں کیا جا سکتا، توہین اور استہزاء ایجی ٹیشن (Agitation) اور مقابلہ اور حکومت کے خلاف عوام کو بھڑکانا یہ بالکل جداگانہ باتیں ہیں، ان میں فرق کرنا چاہیئے اور نافہمی سے دونوں کو یکساں نہیں سمجھنا چاہیئے۔

جو قوم موت کا خوف اپنے دل میں رکھتی ہے وہ عزت کی حیات اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھتی ہے

(۴۸) عَنْ ثَوْبَانَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ

الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا فَقَالَ قَائِلٌ وَّمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ قَالَ بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَّلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ، قَالَ قَائِلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ قَالَ حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی دلائل النبوۃ۔ مشکوٰۃ ص ۴۵۹)

ترجمہ:۔ ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے کہ تمھاری مثال اس پیالہ کی سی ہوگی جس میں تیار شدہ کھانا موجود ہو اور لوگ اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو یہ کہہ کر دعوت دیں کہ آؤ بھئی اس کو کھالو، اس پر ایک شخص نے تعجب سے کہا کیا لوگوں کو یہ جرأت اس لیے ہوگی کہ ہماری تعداد اس زمانہ میں بہت کم ہوجائے گی، آپؐ نے فرمایا نہیں نہیں اس دن عدد کے لحاظ سے تم بہت ہوگے لیکن تمھاری مثال اس خس وخاشاک کی سی ہوجائے گی جو بارش کے بہتے ہوئے پانی کے اوپر تیرتا نظر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے دلوں سے (تمھاری بداعمالی کی بدولت) تمھارا خوف اور رعب نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں اَلْوَھْنُ کا روگ ڈال دیگا، ایک شخص نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الوھن کیا چیز ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت کا خوف۔

شرح:۔ موجودہ دور میں مسلمان اپنے دشمنوں کے درمیان جس طرح گھرے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے ان کو عالم سے نیست ونابود کرنے کی جس طرح دشمنوں کی نظریں بڑی لاپروائی کے ساتھ ہماری طرف لگ رہی ہیں، ان کا سب سے سچا فوٹو کیا ان الفاظ سے زیادہ بہتر طریقہ سے کھینچا جاسکتا ہے جو حدیثِ بالا میں مذکور ہوئے۔ حیرت یہ ہے کہ ہماری پستی ونکبت کا یہ فوٹو ایسی طاقت کے زمانہ میں کھینچا جارہا تھا جبکہ اس بات کا

سمجھنا مخاطبین کو اتنا بعید معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سبب پوچھے بغیر آخر کار ایک شخص سے رہا نہ گیا، پھر جن کے سامنے امت کے عروج و زوال کے تمام دور روحی کے قطعی اور یقینی ذریعہ سے سب کے سب کھولکر رکھ دیئے گئے تھے، انھوں نے ہمارے اس روگ کی کتنی صحیح تشخیص کی، پھر کتنی مختصر کہ صرف دو لفظوں میں اس کا لب لباب نکال کر رکھ دیا.

اگر آج ہم میں حدیث و قرآن پر یقین کی حقیقی روح موجود ہوتی تو ہم اسلام کے ایک اسی لفظ پر قربان ہو جاتے۔ کیا یہ بات نہیں کہ ہماری تعداد بحمداللہ تعالیٰ اس وقت دنیا میں بہت بڑی تعداد ہے لیکن اس کے ساتھ اگر آپ ہمارے اسلام کو کسوٹی پر کس کر دیکھیں تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ ہمارا دعوئے اسلام گو بہت بلند آہنگی کے ساتھ ہو رہا ہے لیکن اس میں حقیقت اتنی بھی نہیں ہے جتنی حدیث کے لفظوں میں خس وخاشاک کی ہوتی ہے.

کیا آج ہمارے دلوں میں بلکہ روئیں روئیں میں مال کی محبت گھسی ہوئی نہیں ہے؟ کیا ہم کبھی یہ احتیاط رکھتے ہیں کہ جس مال کی محبت میں فنا ہو رہے ہیں وہ حلال راستہ سے آتا ہے یا حرام راستہ سے. ظلم وعدوان کی راہ سے حاصل ہو رہا ہے یا عدل وانصاف کی راہ سے یا آنکھ میچ کر صرف اس کو سمیٹنے میں مشغول ہیں خواہ اس میں ہمیں اپنے ملک و قوم کو کھو دینا ہی کیوں نہ پڑے، پھر اسی کیساتھ اپنے دلوں کی طرف غور کر کے دیکھئے. کہ ان میں موت سے خوف کتنا پیدا ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مال و دولت کی محبت کیساتھ جاں فروشی کی روح کبھی پیدا نہیں ہو سکتی، اس لیے اگرچہ یہاں موت کا خوف اور مال کی محبت یہ لفظ تو دو ہیں مگر ان کی حقیقت ایک ہی ہے اور جب اس کا احساس دشمنوں کو ہو جاتا ہے کہ کسی قوم میں جاں فروشی کی بجائے عیش پرستی کی روح داخل ہو چکی ہے تو پھر فطرتاً ان کے دلوں سے ایسی قوم کا رعب وخوف نکل جاتا ہے۔ اور یہی دشمنوں کی دلیری کا باعث بن جاتا ہے۔

مشترکہ ہند میں گذشتہ دور میں مسلمانوں کے ساتھ کتنے ہی معرکے پیش آئے جن میں

مسلمان نہتے تھے اور مال و دولت کی نعمت سے بھی محروم تھے لیکن جب جنگی سرگرمیوں نے ایک بار یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں ابھی جان فروشی کی روح باقی ہے تو ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ایسا طاری ہوا کہ وہ بتیس [۳۲] دانتوں میں ایک زبان ہو کر سالہا سال آرام کی نیند سویا کیے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی کمزوریوں کا احساس کریں اور مرض و علاج کی صحیح تشخیص و تجویز کے بعد بھی اس کے معالجہ کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ (سو عبرت پکڑو لے آنکھ والو) (پ۲۸، رکوع ۴)

اس ضمن میں یہ تنبیہ کر دینی بھی موزوں معلوم ہوتی ہے کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے قرآن کریم نے جو حکم مسلمانوں کو دیا ہے وہ یہ ہے:۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (اور تیاری کرو ان کی لڑائی کے لیے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک بیٹھ جائے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر) (پ۱۰، رکوع ۴) یعنی کفار کے لیے جو قوت بھی تم تیار کر سکتے ہو اس کی تیاری میں لگے رہو۔

ان میں سے اس وقت کے لحاظ سے ایک بات یہ ہے کہ جہاد کرنے کے لیے گھوڑے بھی پالو۔ یہ سب تیاری اس مقصد کے لیے ہے کہ دشمنوں پر رعب جمے اور تمہاری دھاک ان پر بیٹھی رہے۔ اس لحاظ سے ہر زمانہ میں جو آلات جدیدہ ایجاد ہوں گے ان کو بھی زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اسی آیت کے حکم میں داخل ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اعلاء کلمۃ اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ سپاہیانہ زندگی اور فوجی ٹریننگ ہے اس لیے ہر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ عیش پرستی کی زندگی چھوڑ کر ایک فوجی جوانمرد بنے اور جتنا آج وہ مادی ترقیات کے پیچھے پڑا ہوا نظر آتا ہے اتنا ہی فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کا شوقین نظر آئے کیونکہ جو شخص خود اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ دین و ملک کی حفاظت کیا کرے گا۔

دنیا میں ملٹری (Militay) اور سویلین (civilian) کی تقسیم علیحدہ علیحدہ ہے

لیکن اسلام میں ہر مسلمان جس طرح نماز اور روزہ کا مخاطب ہے اسی طرح وہ جہاد کا بھی مخاطب ہے۔ لیکن آہ! اسلام سے غفلت کی بدولت ہماری ترقی کی راہیں اتنی مسدود ہیں کہ آج اگر ہماری پبلک سب کی سب مسلح کر دی جائے جیسا کہ عہد سلف میں رہا کرتی تھی، تو شاید سب سے پہلے مسلمان کا ہتھیار مسلمان کے مقابلہ میں گھر گھر اس طرح استعمال ہونے لگے کہ تعدد ازدواج اور برتھ کنٹرول (Birth Control) کے مسائل پر غور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے یعنی مسلمانوں کی کثرت خود اپنے ہاتھوں اتنی قلت میں تبدیل ہو جائے کہ پانی اور غذا کی فراہمی کی جو مشکلات درپیش ہیں ہماری بدنصیبی سے ان کی حاجت باقی نہ رہے، کتنا افسوس ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم میں کا ایک ایک مسلمان مسلح تھا، ہم میں کا ایک ایک فرد بہادری اور طاقت میں رستم واسفندیار تھا، لیکن جب کبھی مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی نوبت آتی تو ہم ہی سب سے زیادہ نہتے اور سب سے زیادہ بُزدل نظر آتے تھے پھر جب عالم کے انقلابات نے نقشہ بدلا اور خونریزی کا بازار خود مسلمانوں کے درمیان گرم ہو گیا تو اسی دن سے ہمارا دور انحطاط شروع ہو گیا اور بدقسمتی سے وہ انحطاط صرف ملکی نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ دینی تھا اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہم جو کبھی مخلوقِ خدا کا بوجھ اٹھایا کرتے تھے، خود اپنا بوجھ بھی اٹھانے کے قابل نہ رہے اور اپنے دشمنوں سے بھیک مانگ مانگ کر بڑی ذلت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

وقت اب بھی نہیں گیا ہے اگر ہم آج بھی مل کر قرآن کریم کی آیتوں پر صحیح صحیح عمل کرنا شروع کر دیں تو ہمارے دن پھر جائیں اور ہم اسی عزت کی حیات کے مالک نظر آئیں۔

جنگ اس لیے کی جاتی ہے کہ فتنہ فرو ہو، اس لیے نہیں کی جاتی کہ فتنہ بپا ہو

(**۲۹**) عَنْ نَافِعٍ رض اَنَّ ابْنَ عُمَرَ رض اَتَاهُ رَجُلَانِ فِيْ فِتْنَةِ ابْنِ الزُّبَيْرِ رض فَقَالَا اِنَّ النَّاسَ صَنَعُوْا مَا تَرٰى وَاَنْتَ ابْنُ عُمَرَ وَصَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا يَمْنَعُكَ اَنْ تَخْرُجَ فَقَالَ يَمْنَعُنِيْ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيَّ دَمَ اَخِي الْمُسْلِمِ قَالَ اَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ تَعَالٰى وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَدْ قَاتَلْنَا حَتّٰى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ وَّ كَانَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ وَاَنْتُمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تُقَاتِلُوْا حَتّٰى تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِغَيْرِ اللّٰهِ (رواه البخاری مشکوٰۃ ص ۵۵۲)

ترجمہ:۔ نافع رض روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رض اور حجاج ظالم کی جنگ میں دو شخص ابن عمر رض کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ لوگ کس خطرناک حالت سے گذر رہے ہیں اور آپ کس کے فرزند ہیں یعنی عمر رض کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، پھر آپ بھی جنگ کے لیے باہر کیوں نہیں نکل آتے اور کیوں اندر دبے بیٹھے بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا جو بات اس وقت مجھ کو جنگ سے مانع ہو رہی ہے وہ صرف ایک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب پر مسلمانوں کا خون بہانا حرام فرمایا ہے۔ اس پر اس نے کہا، کیا قرآن میں ہی یہ ارشاد موجود نہیں کہ ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک فتنہ بالکل ختم نہ ہو جائے۔ یہ سنکر ابن عمر رض نے فرمایا جی ہاں، ہم نے جنگ کی اور اس وقت تک کی کہ فتنہ نیست و نابود ہو گیا اور صرف ایک خدا تعالیٰ کا دین غالب آگیا، اب جنگ کر کرکے تم یہ ارادہ کر رہے ہو کہ پھر فتنہ اٹھ کھڑا ہو اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بجائے کفر کو غالب آنے کا موقع مل جائے۔

شرح:۔ حضرت عبداللہ بن عمر رض کی مراد سمجھنے کے لیے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس

گفتگو کے دوران میں جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی کچھ تشریح سن لی جائے۔
قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ط (پ ۹ ۔سورۂ انفال۔رکوع ۵) یعنی کافروں سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ ان کا زور ٹوٹ جائے (یعنی کافر ایمان لانے سے نہ روک سکیں یا مذہب حق کو ختم کرنے کی دھمکی نہ دے سکیں)، اور اللہ کا دین سب پر غالب آجائے۔

آیتِ بالا میں جہاد کا ایک عظیم مقصد بیان کیا گیا ہے اور اس کے دو حصے ہیں سب سے اہم مقصد خدا کے دشمنوں کی طاقت اور شوکت کو اتنا توڑ دینا ہے کہ پھر ان میں اسلام کے مقابل آکر جنگ کرنے کا حوصلہ باقی نہ رہے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ خدائی قانون عالم پر اس طرح پھیل جائے کہ غالب پھر وہی ہو اور بقیہ قوانین اس کے زیر قیادت و سیادت اپنے اپنے دائرہ میں محدود رہیں، کیونکہ تاریخ شاہد ہے جب کبھی کفار کو غلبہ ہوا مسلمانوں کا مذہب اور ایمان خطرہ میں پڑ گیا۔ اسپین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کس طرح قوت اور موقعہ ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مُرتد بنایا گیا اور موجودہ زمانہ میں بھی اس کے شواہد دنیا کے سامنے ہیں حتیٰ کہ بعض ممالک میں مسلمانوں پر مظالم توڑنا گویا اپنی سیر و تفریح کا سامان سمجھا جاتا ہے کہ جب چاہا پرندوں کی طرح ان کا شکار کھیل لیا، ان کے جان و مال لوٹ لیے، ان کی عزت و آبرو برباد کر دی۔ پھر کوئی نہیں ہوتا جو ان کی داد فریاد سُنے۔

اس کے بعد ابن عمرؓ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک ہمارے مقابل کفار تھے اس وقت تک ہم شیر نیستاں بنے رہے۔ ہمارے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے تھے اور خدا کے دین کے غلبہ کے لیے ہم اپنے خون کی قیمت پانی کے قطرہ سے بھی کم سمجھتے رہے یہاں تک کہ کفر کا سر نیچا ہو گیا اور اس کی طاقت و شوکت پاش پاش ہو کر نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ یہ تو وہ جنگ تھی جس کا قرآن نے ہم کو حکم دیا تھا اور الحمد للہ! اس کا مقصد ہماری آنکھوں نے

پورا ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیا. لیکن موجودہ جنگ جو عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ ہو رہی ہے یہ مسلمانوں کے درمیان جنگ ہے ۔ اس جنگ میں وہی بہادر نفوس سب سے زیادہ بزدل نظر آنے چاہییں اور مسلمانوں کے پسینہ کی قیمت وہ نظر آنی چاہیے جو کبھی خون کی قیمت سمجھی جاتی تھی۔ پہلی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کر تمام کرۂ ارض پر خدا کا دین غالب آگیا اور موجودہ مسلمانوں کی باہمی جنگ کا یہ نتیجہ ہو کر رہیگا کہ مسلمان روز بروز کمزور پڑتے چلے جائیں گے اور خدائے تعالیٰ کے دین کی بجائے کفر کا غلبہ ہو جائے گا.

ابن عمرؓ کے ان مختصر جملوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلامی جنگ کے مقاصد کیا ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا نتیجہ کیا نکل کر رہنا ہے ۔ اس لیے حضرت ابن عمرؓ کے بیان کی روشنی میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ باہمی شدید سے شدید اختلافات کے باوجود اس نکتہ کا خیال رکھیں کہ ان کے اندرونی اختلافات سے کہیں کوئی دشمن فائدہ اٹھانے نہ پائے ، لیکن مسلمانوں کی ذہنیت بدل جانے کا نوحہ آج کس کے سامنے کیا جائے کہ وہ محض ضد میں آکر بڑی خوشی کے ساتھ یہ پسند کرنے لگے ہیں کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو بات ان کی اونچی رہے خواہ دین خدا باقی رہے یا نہ رہے یا خود ان کا ملک ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے قبضہ میں جا پہنچے ۔

میں اس کے شواہد موجودہ دور میں بھی پیش کر سکتا ہوں تاکہ واضح طور پر یہ نظر آجائے کہ آج مسلمان کس طرح ملک فروشی اور دین فروشی میں منہمک نظر آتے ہیں لیکن خلافِ مصلحت ہونے کی وجہ سے عنانِ قلم کو روکنا پڑتا ہے ، اہل فہم کے لیے دنیا کی موجودہ تاریخ سامنے ہے اور اشارہ کردینا کافی ہے. مثل مشہور ہے :۔

" اگر در خانہ کس است حرفے بس است "

یہاں اسلامی جنگ کے مقاصد اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دینا مدنظر نہیں، یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور مستقل فرصت کا محتاج ہے، صرف یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے

کہ کسی طرح مسلمان باہمی اختلافات سے اگر باز نہ آئیں تو کم از کم اپنے خیالات کو اتنی ہوا بھی نہ دیں کہ وہ بھڑک کر خود ان کو اور دین و ملک کو جلا کر خاکستر بنا دے۔

جنگ تمنا کرنے کی چیز نہیں، لیکن جب ناگزیر ہوجائے تو پھر ثابت قدم رہ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے

(۳۰) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی رض اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ بَعْضِ اَیَّامِهِ الَّتِیْ لَقِیَ فِیْهَا الْعَدُوَّ اِنْتَظَرَ حَتّٰی مَالَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ قَامَ فِی النَّاسِ فَقَالَ یٰاَیُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوا اللّٰهَ الْعَافِیَةَ فَاِذَا لَقِیْتُمُ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ ثُمَّ قَالَ اللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتٰبِ وَمُجْرِیَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْهِمْ (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۳۴۱)

ترجمہ: ۔ عبداللہ بن ابی اوفی رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں جس میں دشمن کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہوا، اتنی دیر انتظار کیا کہ آفتاب ڈھل جائے اس کے بعد صحابہ رض سے مخاطب ہوکر فرمایا دیکھو، دشمن سے جنگ کی تمنائیں مت کرنا اور اللہ سے ہمیشہ عافیت مانگنا، جب جنگ سر ہی پڑ جائے تو پھر ثابت قدم رہنا اور اس کا یقین رکھنا کہ جنت کہیں دور نہیں، بس تلواروں کے سائے کے نیچے ہے اس کے بعد یہ کلمات دعائیہ فرمائے، اے خدا، اپنی کتاب کے نازل فرمانے والے اور بادلوں کے چلانے والے اور دشمن کو شکست دینے والے ہمارے دشمنوں کو شکست دے اور ان کے مقابلہ میں ہم کو فتح نصیب فرما۔

تشریح: ۔ انسانی فطرت بالخصوص عوام کی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ذرا سی بات پر عواقب سے غافل ہوکر جذبات سے بھڑک اٹھتی ہے اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر

نہ خود غور کرتی ہے اور نہ دوسروں کو غور کرنے کا موقع دیتی ہے، یہاں صحیح طریق تو یہ تھا کہ اس کجروی کی بجائے معاملہ ان کے سپرد کر دیا جاتا جو اس کے سمجھنے اور اس کا فیصلہ کرنے کے اہل تھے۔ لیکن ہماری موجودہ جمہوریت کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اس کے جمہور یعنی ناعاقبت اندیش عوام اپنی طاقت سے اہل فہم کو اس پر مجبور کر دیں کہ وہ ان کی رائے کے سامنے جھک جائیں۔ اگر جمہوریت کا مفہوم یہی ہے تو اس سے بدتر شاید ہی کوئی اور چیز ہوگی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ؁ (اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک، تو تحقیق کرتے اس کو جو اُن میں تحقیق کرنیوالے ہیں اس کی اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے) (پ۵، رکوع ۸)

خلاصہ یہ کہ منافق اور کم سمجھ لوگوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی بات امن کی پیش آتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا یا لشکرِ اسلام کی فتح کی خبر سننا یا اس کے برخلاف کوئی خوفناک خبر سن لینا جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا، تو اس کو بلا تحقیق کئے مشہور کرنے لگتے ہیں اور اس میں اکثر فساد اور نقصان مسلمانوں کو پیش آ جاتا ہے۔ منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ مسلمان کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے، لہذا کہیں سے کوئی خبر آئے تو چاہیئے کہ اول اپنے حاکم تک پہنچائیں اور اس کے نائبوں تک، جب وہ اس خبر کی تحقیق کر کے تسلیم کر لیں تو ان کے کہنے کے موافق اس کو کہیں نقل کریں اور اس پر عمل کریں اور اللہ اپنے فضل سے تمھاری اصلاح اور تربیت کے لیے احکام نہ بھیجتا اور تم کو وقتاً فوقتاً

حسبِ ضرورت ہدایت اور تنبیہ نہ فرماتا رہتا جیساکہ اس موقع پر رسول اور حاکموں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم کبھی کے گمراہ ہو جاتے سوائے ان چند کامل العقل اور کامل الایمان افراد کے جنھوں نے ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھا اور شکر کیا اور ان کی فوری تعمیل کی، قرآن کریم نے ایک دوسرے موقعہ پر قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ کیا ہے جو ایک ظالم بادشاہ کے ظلم سے تنگ آکر اپنے نبی کے پاس گئی اور اس کے سامنے اپنے مسائل رکھے اور اس پر یہ زور ڈالا کہ موجودہ مصائب کے ہوتے ہوئے ہمارے لیے جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ اور اب اللہ کے راستے میں نکل کھڑے ہونے کے سوا ہمارے لیے کوئی راہ باقی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا آپ ہمارے لیے فوری طور پر کوئی جنگی پروگرام مرتب کردیجئے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ط (جب انھوں نے کہا اپنے نبی سے مقرر کردو ہمارے لیے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں، پیغمبر نے کہا کیا تم سے یہ اندیشہ نہیں کہ اگر حکم ہو تم کو لڑائی کا تو تم اس وقت نہ لڑو، وہ بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے، پھر جب حکم ہوا ان کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے، مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو) (پ۲، رکوع ۱۶)

یہاں قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے کہ جب ان کی نیت خراب ہوئی، تب ان پر ایک بادشاہ جالوت (نامی) مسلط ہوا۔ ان کو شہر سے نکال دیا اور لوٹا اور ان کو پکڑ کر غلام بنالیا، بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے، اس وقت حضرت شموئیل علیہ السلام پہنچے تو ان سے درخواست کی کہ کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کردو، چنانچہ اس نبی نے ان پر

ایک بادشاہ مقرر کر دیا۔ شروع میں ان کے نبی نے بہت سمجھایا کہ جنگ بڑی آزمائش کی چیز ہے اس کی تمنا نہ کرو، انھوں نے جذبات میں بھر کر یہ جواب دیا، جب ہمارے گھربار تک برباد ہو چکے تو آخر وہ کونسا دن ہوگا جب ہم جنگ کریں گے، لیکن انھوں نے ان کے ساتھ پھر وہی کٹ حجتی جاری رکھی، آخر جب بڑی بحث کے بعد ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے اکثر بھاگ نکلے اور صرف کچھ لوگ ہی باقی رہ گئے جو ثابت قدم رہے اور جنگ میں شریک ہوئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے جس میں ان کے علاوہ جنگ کے اور دوسرے عواقب و نتائج پر تنبیہ کی گئی ہے۔ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ط (کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے سرداروں کو بے عزت اور ایسا ہی کچھ کریں گے) (پ۱۹، رکوع ۱۸) خلاصہ یہ ہے کہ قوی اور مضبوط بادشاہوں سے لڑنا ہنسی کھیل نہیں، ان کی یہ عام عادت ہے کہ اگر وہ غالب آ جائیں جیسا کہ ظنِ غالب ہوتا ہے تو ملوک اور سلاطین کی عام عادت کے موافق تمھارے ملک کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے اور وہ انقلاب ایسا ہوگا جس میں عزت والوں کو ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ عواقب پر غور و خوض کیے بغیر جنگ کرنے میں عجلت پسندی سے کام نہ لیں بلکہ ان کی طاقت، طبعی رجحانات، نوعیتِ حکومت اور اس بات کا پتہ لگائیں کہ ان کی دھمکیوں کی پشت پر کونسی قوت کارفرما ہے اور یہ کہ واقعی طور پر وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں اور ان تجاویز پر غور کریں کہ اگر جنگ کسی صورت سے بھی ٹل سکتی ہے تو زیادہ بہتر ہے ورنہ جو کچھ ان کا رویہ معلوم ہوگا، پھر مجبوراً اس کے مناسب کارروائی کرنی پڑیگی اور اس وقت جس چیز کی سب سے اہم ضرورت ہے وہ آخری دم تک صبر و استقامت، ایثار و قربانی کی ہے۔ صرف مالی نہیں بلکہ جانی بھی۔ عرب کا ایک بڑا شاعر باوجود خونخوار

فطرتاً جنگجو ہونے کے جنگ کے متعلق اپنے جذبات کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے ؎

فَلَمَّا صَرَّحَ الشَّرُّ فَأَمْسَىٰ وَهُوَ عُرْيَانٌ
وَلَمْ يَبْقَ سِوَى الْعُدْوَانِ دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا

یعنی جب جنگ کھل کر ہمارے سامنے آگئی اور جنگ کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تو پھر ہم نے بھی ان کے کیے کا اچھی طرح ان کو مزہ چکھا دیا۔

اس موقعہ پر یہ بھی ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اسلامی تعلیم و تاکید کے باوجود صدیوں سے ہماری زندگی فوجی باقی نہیں رہی ہے بلکہ عیش پرستی کی زندگی بن گئی ہے۔ اور ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جنگ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک کے سپاہی کہیں ہم سے دور جا کر ملک کی حفاظت کی خاطر اپنے سر کٹوائیں گے اور ہماری فتح یقینی ہوگی اور ہم اس طرح اپنے گھروں میں اطمینان و راحت کے ساتھ کھاتے پیتے رہیں گے، حالانکہ موجودہ جنگ میں سب سے پہلے دشمن کی نظروں میں دشمن کا نصب العین یہ رہتا ہے کہ ملک میں جو ترقیات بڑی مشقتیں اور محنتیں اٹھا کر اور بڑے مصارف برداشت کر کے کسی حد تک ہوئی ہیں سب سے پہلے ان کو اپنا ہدف بنائے اور برباد کر ڈالے اور اتنا ہی نہیں عوام کی بھی اس طرح خانہ ویرانی کر دے کہ عورت کا شوہر نہ رہے بچے یتیم ہو جائیں، ہری بھری کھیتیاں راکھ کا ڈھیر بن جائیں۔ غرضکہ جو ملک بڑی مصیبتیں جھیل کر سنبھلا تھا، چند گھنٹوں میں قبرستان نظر آنے لگے، اس ضمن میں جو موت کے گھاٹ اتر جائیں ان کو چھوڑیئے لیکن جو باقی رہ جائیں گے ان کو در در کی بھیک مانگنی پڑے، پہننے کے لیے کپڑا نصیب نہ ہو اور سر چھپانے کے لیے کوئی گھر باقی نہ رہے۔

اب سوچیئے اگر یہ مصائب کسی ملک پر خدا نہ کردہ آ پڑیں تو اس کی مکافات ممکن ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کے لیے کتنی مدت درکار ہے، پھر اس درمیانی وقفہ کے لیے باقی ماندہ انسانوں کی زندگی جس طرح گذرے گی وہ بھی سامنے رکھنی چاہیئے۔

چاہیے اگر فوجی اسپرٹ ہو تو اس جفاکشی کی کچھ نہ کچھ مشاق قوم کے اکثر افراد میں موجود ہوتی ہے لیکن جہاں ناشتہ کے بغیر ایک قدم گھر سے باہر نکالا نہ جائے اور ہر وقت ایئر کنڈیشن مکانوں میں رہنے کی عادت ہو، بوٹ سوٹ پہننے کا شوق ہو، غرضکہ زندگی کے ایک ایک شعبہ میں اتنی قیود گلے کا طوق بن چکی ہوں کہ ان میں سے ایک کا بھی چھوڑنا قیامت معلوم ہو اور اس سے تو شاید ہی عوام کا کوئی فرد آشنا ہو کہ آلاتِ جدیدہ تو در کنار کر پستول اور بندوق نام کا بھی کوئی ہتھیار رہے ان حالات میں آیاتِ بالا کی روشنی میں یہ فیصلہ کر لینا اب آپ کا کام ہے کہ جنگ کا جلد بازی سے مول لینا بہتر ہے یا عارضی طور پر صبر کے تلخ گھونٹ پی لینا بہتر ہے۔

چنانچہ ان ہی حقائق کے پیش نظر دنیا کی سب سے بڑی دو طاقتوں یعنی امریکہ اور روس نے رو در رو مقابل ہو کر پھر اپنے عزم کو فسخ کیا اور اس کی کوئی پروا نہیں کی کہ اس واپسی پر دنیا کیا ریمارک کرے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ طاقتور کو فتح ہو یا شکست، ہر حالت میں وہ اس کو اپنی فتح سے تعبیر کرتا ہے، چھوٹے ملکوں کو چاہیئے کہ وہ ان عظیم مملکتوں کے پختہ عزم جنگ اور پھر فوری خاموشی سے سبق حاصل کریں، صرف جوش کارآمد نہیں ہوتا اس کے ساتھ کچھ ہوش بھی درکار ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلف بن حوشب نے جنگ کی مذمت میں جو چند اشعار نقل کیے ہیں وہ یہاں ہدیۂ ناظرین کر دیے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سلف ان اشعار کو پڑھنا پسند فرماتے تھے۔

اَلْحَرْبُ اَوَّلُ مَا تَكُوْنُ فُتَيَّةً ٭ تَسْعٰى بِزِيْنَتِهَا لِكُلِّ جَهُوْلِ

(جنگ اول اول تو ایک خوبصورت جوان عورت کی شکل میں نظر آتی ہے جو بناؤ سنگھار کر کے ہر جاہل آدمی کو اپنا فریفتہ بنا لیتی ہے۔)

حَتّٰى اِذَا اشْتَعَلَتْ وَشَبَّ ضِرَامُهَا ٭ وَلَّتْ عَجُوْزًا غَيْرَ ذَاتِ حَلِيْلِ

(لیکن جب مشتعل ہو جاتی ہے اور اس کی لپٹیں بھڑکنے لگتی ہیں تو ایسی بدنما نظر آتی ہے جیسے بڑھیا عورت جس کا کوئی شوہر بھی نہ ہو یعنی اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا)

شَمْطَاءُ يُنْكَرُ لَوْنُهَا وَتَغَيَّرَتْ ۞ مَكْرُوْهَةً لِلشَّمِّ وَالتَّقْبِيْلِ

(ادھیڑ عورت کی طرح بن جاتی ہے جس کا نہ پہلا سا رنگ رہتا ہے نہ روپ اور نہ اس قابل رہتی ہے کہ کوئی شخص اس کی خوشبو سونگھنی پسند کرے یا اس کو منہ لگائے۔)
(صحیح بخاری طبع ہند، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر ج ۲ ص ۱۰۵۱)۔

غیر ملکی زبانوں کی حیثیت شرعی نظر میں

(۳۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَتَعَلَّمَ لَهٗ كَلِمَاتٍ مِّنْ كِتَابِ يَهُوْدَ وَقَالَ اِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا اٰمَنُ يَهُوْدَ عَلٰى كِتَابِيْ قَالَ فَمَا مَرَّ بِيْ نِصْفُ شَهْرٍ حَتّٰى تَعَلَّمْتُهٗ لَهٗ قَالَ فَلَمَّا تَعَلَّمْتُهٗ كَانَ اِذَا كَتَبَ اِلٰى يَهُوْدَ كَتَبْتُ اِلَيْهِمْ وَاِذَا كَتَبُوْا اِلَيْهِ قَرَأْتُ لَهٗ كِتَابَهُمْ (هذا حديث حسن صحيح ترمذی ص ۱۰۱۔ ج ۲)

ترجمہ:۔ زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم فرمایا کہ میں آپ کے خطوط لکھنے کے لیے یہود کی زبان سیکھ لوں، اور آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھ کو یہودیوں کے لکھنے پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ابھی نصف مہینہ بھی مجھ پر گذرنے نہ پایا تھا کہ میں نے آپؐ کی خدمت کی خاطر ان کی زبان سیکھ لی۔ یہ کہتے ہیں کہ جب میں نے اس کو سیکھ لیا تو جب آپؐ کوئی خط یہود کو لکھتے تو آپ کی طرف سے میں ان کو لکھتا اور جب وہ کوئی خط آپؐ کے نام لکھتے تو اس کو پڑھ کر آپؐ کو سنا دیتا۔

شرح:۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر بَابُ تَعْلِيْمِ السُّرْيَانِيَّةِ کا عنوان

قائم کیا ہے۔ کیونکہ اس وقت یہود کی زبان بھی سُریانی زبان تھی، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اپنی ملکی زبان چھوڑ کر بوقتِ ضرورت غیر ملکی زبان سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور جب سریانی زبان کی اجازت ثابت ہوئی تو پھر ہماری ضروریات کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا رہے ان سب زبانوں کو سیکھنا ہمارا فرض ہونا چاہیئے۔ اس وقت جو کوتاہی جماعتی طور پر مجھ کو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے دماغوں میں مختلف زبانوں میں صرف انگریزی زبان میں اپنی مساعی کا داعیہ محدود کر رکھا ہے اور بے وجہ اسکو اپنے لیے مایۂ ناز اور طرۂ امتیاز بنا رکھا ہے۔ یہ بات ہمارے دورِ غلامی تک تو صحیح تھی لیکن آزادی کے بعد بھی اگر انگریزی کے متعلق ہمارے جذبات وہی ہیں جو دورِ غلامی میں تھے تو یہ قابلِ صد افسوس ہے۔

ہمارے لیے اس کے دو نتائج بہت مضرت رساں ہیں ایک تو یہ کہ انگریزی زبان کی بے وجہ عزت کرنے سے ہمارے قلوب میں بے وجہ انگریزوں کی عزت قائم ہوتی ہے حالانکہ اب وہ ہمارے لیے اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے جو دوسرے ممالک رکھتے ہیں، دوسرا نقصان اس میں یہ ہے کہ آزادی کے بعد جب ہم کو دوسرے ممالک کے ساتھ گفتگو کرنے کا واسطہ پڑتا ہے تو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی اور ان کے مافی الضمیر کے فہم میں ہم کو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ ہماری ترجمانی ان وزنی الفاظ میں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا جو ہم خود کر سکتے ہیں اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ عمداً یا سہواً ترجمان سے غلط ترجمانی کرنا بھی ممکن ہے اور حدیث مذکور میں جس نقطۂ نظر سے اپنے دشمن کی ترجمانی سے احتیاط کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اس کی احتیاط رکھنا ہمارے لیے بھی لازم ہے۔

اس جگہ بے موقع نہ ہوگا اگر عربی زبان کی اہمیت کے متعلق بھی چند کلمات لکھدیئے جائیں، میرے خیال میں جبکہ وحدتِ قومی کی بنیاد مذہب ہو نہ کہ وطن تو کم از کم اس

عقیدہ رکھنے والوں کے لیے عربی زبان کی اہمیت کا مسئلہ بدیہی ہونا چاہیئے۔ عالم اسلامی کے درمیان اس کی ضرورت میں آج کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور ان میں زبانوں کے اختلاف کے باوجود اگر کوئی زبان مشترک طور پر رائج ہو سکتی ہے تو وہ صرف ایک عربی زبان ہی ہے۔ جب تک کوئی مشترک زبان ان ممالک میں عام طور پر رواج نہ پا جائے اس وقت تک ان کے مابین اتحاد کی حقیقی روح پیدا ہونی مشکل ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی عمر میں ایک بڑے مبصر کی تالیف دیکھی تھی جس نے ایک بڑی قیمتی بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ عالمِ اسلامی اگرچہ منتشر ہے اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹا ہوا ہے لیکن جنگی لحاظ سے جو اِن ممالک کا محلِ وقوع ہے وہ اتنی اہمیت رکھتا ہے جیسا ہندوستان کے لیے کبھی کوہِ ہمالیہ اہم تھا اس لیے اگر ان کے مابین حقیقی وحدت پیدا ہو جائے خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو تو بڑی سے بڑی طاقت ان کی محتاج نظر آئے گی، جغرافیائی مطالعہ رکھنے والے اس بیان کی اہمیت خوب محسوس کر سکتے ہیں۔

مذکورۂ بالا حدیث کے تحت جو بحث کی گئی ہے وہ مختلف زبانوں کی تعلیم کے متعلق تھی لیکن ذیلی طور پر یہاں تربیت کی اہمیت کی طرف بھی متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم خواہ کسی زبان کی ہو لیکن جب تک اس کے ساتھ تربیت اسلامی رنگ کی نہ کی جائے اس وقت تک تعلیم کے صحیح نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، غالباً اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات میں سے یُعَلِّمُھُمْ وَیُزَکِّیْھِمْ ارشاد فرمایا گیا ہے یعنی آپؐ اپنی امت کے لیے صرف ایک معلم ہی نہ تھے بلکہ ان کے مزکی بھی تھے، اس تزکیہ کی حقیقت کیا تھی، یہ بہت تفصیل طلب ہے لیکن اگر اجمالاً تربیت کو درج کر دیا جائے تو بعید نہ ہوگا۔ یہ بات اس وقت تک پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی جب تک کہ تربیت نبوت کی حقیقت بتائی نہ جائے لیکن یہ بات بہت طویل ہے۔

تربیت میں سب سے پہلے معاشرتی اصلاح، اخلاق اور اولوالعزمی کا لحاظ رکھنا لازمی ہے

اور صحت کے خیال کے ساتھ جفاکشی کا عنصر شامل رکھنا اور عیش پرستی سے اپنے نوجوانوں کو متنفر رکھنا، غریبوں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا اور اپنے نفس کے اخراجات میں قدم قدم پر اعتدال کو ملحوظ رکھنا، باہمی تنافس کی بجائے تعاون وتناصر کی زندگی بسر کرنا، زندگی کے گوشہ گوشہ میں خودداری اور وقار کو قائم رکھنا، ایثار وقربانی کی روح پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ، ان امور کو صرف ذہنی نہیں بلکہ ان کو عملی زندگی میں داخل کردینا اور ان کو طبیعت وفطرت بنادینا لازمی ہے[1]۔

اسلام حقِ مالکیّت کو تسلیم کرتا ہے لیکن مالکوں پر یہ اخلاقی دباؤ ڈالتا ہے کہ جو مال ان کی حاجت سے فاضل ہو اس کو وہ غریبوں کا ایک رزروفنڈ سمجھیں

(۳۲) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ رض قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ فِیْ سَفَرٍ مَّعَ

---

[1] تقسیم ہند سے قبل ایک مرتبہ افغانستان کی دعوت پر میرا جانا ہوا۔ اس وقت وہ افغانستان کوئی دوسرا ہی افغانستان تھا۔ بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی لیکن وزیراعظم کے ساتھ مجالست کا کچھ طویل اتفاق ہوا۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنے عہدہ کے لحاظ سے سات مختلف زبانیں جانتا ہوں لیکن اپنے گھر میں صرف پشتو بولتا ہوں۔ اسی طرح ایک بڑے فوجی آفیسر سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ سمجھ کر کہ میری فارسی ان کی وطنی فارسی سے ممکن ہے کہ کچھ مختلف ہو اس لیے تبادلۂ خیالات کے لیے انگریزی زبان مناسب سمجھی، تو اس نے بڑی نفرت کے ساتھ کہا کہ ہم انگریزی زبان نہیں جانتے اور نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے، اگر انگریز کو ہزار بار ضرورت ہو تو ہماری زبان میں ہم سے گفتگو کرے۔ اس بیان پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرتا صرف آزاد قوم کے جذبات بتانا مقصود ہیں اور بس۔

رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَآءَهٗ رَجُلٌ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ فَجَعَلَ يَضْرِبُ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ مَعَهٗ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهٖ عَلٰى مَنْ لَّا ظَهْرَ لَهٗ وَمَنْ كَانَ لَهٗ فَضْلُ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهٖ عَلٰى مَنْ لَّا زَادَ لَهٗ قَالَ فَذَكَرَ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ حَتّٰى رَأَيْنَا اَنَّهٗ لَا حَقَّ لِاَحَدٍ مِّنَّا فِيْ فَضْلٍ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص ۳۳۸)

ترجمہ:۔ ابو سعید خدری رضؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ اچانک ایک شخص آپؐ کے سامنے آیا لیکن اس کا اونٹ اتنا تھکا ہوا تھا کہ جب وہ اس کو مارتا تو وہ دائیں بائیں مڑ جاتا مگر سامنے نہ چلتا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کوئی سواری اس کی ضرورت سے زائد ہو تو وہ اس شخص کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کچھ توشہ ہو تو وہ اسکو دیدے جس کے پاس کچھ توشہ نہیں ہے۔ اسی طرح آپؐ نے مختلف چیزوں کے متعلق ارشاد فرمایا۔ اس بارے میں آپ نے اتنی تاکید فرمائی کہ آدمی کے پاس جو چیز بھی اس کی ضرورت سے زائد ہو اس میں گویا اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے (بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس کو اپنے دوسرے حاجتمند بھائی کو دیدے)

(۳۳) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا اَوْ لِيَمْنَحْهَا اَخَاهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهٗ

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۲۵۷۔)

ترجمہ:۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس کوئی زمین کا ٹکڑا ہو اس کو چاہیئے کہ یا تو خود اس میں کھیتی کرے ورنہ اپنے بھائی کو دیدے کہ وہ اس میں کھیتی کرے اور اگر یہ دونوں کام نہیں کرتا تو آپؐ نے ناگواری کے لہجہ میں فرمایا کہ پھر اپنی زمین لیے بیٹھا رہے۔

شرح :- ان ہر دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اسلام حقِ مالکیت تسلیم کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ انسان کا شرف ہے جو اس کے سوا کسی اور جاندار کو بخشا نہیں گیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص جدو جہد کر کے حلال طریقہ پر مال کماتا ہے تو اس کو اسکی ملکیت کیوں نہ تسلیم کیا جائے، اسی کے ساتھ عقولِ انسانیہ میں تفاوت ہے، اور جفاکشی و محنت میں بھی بہت بڑا فرق ہے تو اگر مختلف انسان اپنی اپنی جدو جہد کے لحاظ سے حقوقِ ملکیت میں بھی مختلف رہیں تو اس کے معقول ہونے میں کیا شبہ ہے لیکن اسی کے ساتھ آپ نے دیکھا کہ اسلام ملکیت میں نفسِ حق تسلیم کرنے کے بعد اس کی تاکید کرتا ہے کہ فارغ البال شخص کا فرض ہے کہ وہ حاجتمند شخص کو اپنے کمائے ہوئے مال میں صرف شریک ہی نہ سمجھے بلکہ اس کو اس کا حقدار سمجھے۔

یہ تو اسلام کا نظریہ ہے لیکن اس کے برخلاف اشتراکیت صرف زبانی طور پر انسان کے لیے حق ملکیت کا انکار کرتی ہے اور اشرف المخلوقات کو اور حیوانات کو ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ ایک جدو جہد کرنیوالے اور ایک فہیم و ذکی شخص کو اس دوسرے شخص کے ساتھ جو ان صفات میں اس کے ہم پلہ نہیں ہے، برابر رکھنا یہ بھی ان کا ایک نصب العین ہے، لیکن اسی کے ساتھ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص ان میں برسر اقتدار آجاتا ہے وہ عوام کی تمام اسٹیٹ پر اس طرح قابض ہو کر مالکانہ تصرف کرنا جائز سمجھتا ہے جو شاید حقیقی مالکوں کو بھی حاصل نہیں ہے اور عوام سے مشورہ کرنا تو درکنار ان کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دیتا اور اپنے لیے وہ تمام راحت کے سامان جائز تصور کرتا ہے، جو کوئی دوسرا حقیقی مالکیت رکھنے والا بھی مشکل سے حاصل کر سکتا ہے۔

لہٰذا اب موازنہ کیجئے کہ حقِ مالکیت تسلیم کر کے خود مالک کے ہاتھوں سے محتاجوں پر ان کا حق سمجھ کر مال تقسیم کر دینا زیادہ بہتر ہے یا مالکیت کا انکار کر کے صرف چند اشخاص کا

اس سے اپنی رائے کے مطابق اپنے منافع حاصل کرنا بہتر ہے۔ شریعت کو چھوڑیئے، فطرت کے تقاضہ پر غور فرمائیے کیا ہونا چاہیئے۔

یں مال کے علاوہ اور دوسرے انسانیت سوز گوشوں سے اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتا جس میں ماں اور بیوی کے درمیان بھی کوئی فرق نہ سمجھا جائے، گویا وہ بھی مال کیطرح اسٹیٹ کا ایک حق ہیں۔ اس کھلی ہوئی حیوانیت و بربریت کا اثر جو اس اشرف المخلوقات کے معاشرہ پر پڑ سکتا ہے اور پڑا ہے۔ اس کو لکھتے ہوئے بھی قلم شرماتا ہے لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کوئی صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اس کو مختلف طریقوں سے معقول بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اہلِ عقل وفہم پر گو ابتداءً اس کا بوجھ پڑے لیکن طاقت یا عادت کے بعد رفتہ رفتہ وہ اس کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ وہی ان کو معقول حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ط فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (بھلا ایک شخص کہ بھلی سمجھائی گئی اسکو اس کے کام کی برائی پھر دیکھا اس نے اس کو بھلا، کیونکہ اللہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہے اور سمجھاتا ہے جس کو چاہے) (سورۃ الفاطر پارہ ۲۲، رکوع ۱۴) یعنی شیطان نے جس کی نگاہ میں بُرے کام کو بھلا کر دکھایا کیا وہ شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا کے فضل سے بھلے بُرے کی تمیز رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر جو شخص شیطانی اغوا سے برائی کو بھلائی، بدی کو نیکی اور زہر کو تریاق سمجھ لے، کیا اس کے سیدھے راستے پر آنے کی کچھ توقع ہو سکتی ہے۔

اسلامی حکومت کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ کمزوروں کا حق بڑے لوگوں سے لے کر ان کو دلوا دے

(۳۴) اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ

نِ الدُّوَرِ بِالْمَدِيْنَةِ وَهِيَ بَيْنَ ظَهْرَانِيْ عِمَارَةِ الْاَنْصَارِ مِنَ الْمَنَازِلِ وَالنَّخْلِ فَقَالَ بَنُوْ عَبْدِ بْنِ زُهْرَةَ نَكِّبْ عَنَّا ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلِمَ ابْتَعَثَنِي اللّٰهُ اِذًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُقَدِّسُ اُمَّةً لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهِمْ حَقُّهُ۔

(رواہ فی شرح السنۃ، مشکوٰۃ ص ۲۵۹)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعود رضؓ کو زمین کا ایک قطعہ مدینہ منورہ میں عنایت فرمایا۔ اتفاق سے زمین کا یہ ٹکڑا انصار کے باغات اور مکانات کے درمیان میں واقع ہوا تھا (عبداللہ بن مسعود رضؓ مہاجر ہونے کی وجہ سے کچھ اجنبی تھے) اس پر بنو عبد زہرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر یہ درخواست پیش کی کہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود رضؓ کی کنیت) کو ہمارے مکانات سے کہیں علیحدہ زمین عنایت فرمائیں تو مناسب ہے۔ اس پر آپؐ نے گرانی کے لہجہ میں ان کو یہ جواب دیا کہ اگر میں ایسا کروں تو اللہ تعالیٰ نے مجھکو رسول بناکر بھیجا کس مقصد کے لیے ہے، یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ کسی جماعت کو اس وقت تک پاک نہیں کرتا کہ جب تک کہ ان میں کمزور کا جو حق ہے وہ اس کو نہ دلوا دیا جائے۔

شرح: اسلامی حکومت کا مقصد مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ بہت شائستہ انداز میں عوام کو خواص کو حقوق اللہ اور عوام کے حقوق کی ادائیگی کا سلیقہ اس طرح سکھلایا جائے کہ وہ اپنی اندرونی اور بیرونی زندگی میں طبعی طور پر اس کے خوگر بن جائیں لیکن جب کبھی غیر صالح شخصیتیں برسرِ اقتدار آجاتی ہیں تو یہ مقصد فوت ہوجاتا ہے اور رعایا کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ ان کے حقوق کا تحفظ صحیح طور پر قائم نہیں رہتا اور مختلف ناجائز راستوں سے عوام کے حقوق کا نظام بالکل درہم برہم ہوکر رہ جاتا ہے۔ ایک بڑی شخصیت والا انسان جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے تعلقات یا حکومت کے اثرات یا مال و دولت کے بل بوتے پر جس غریب کو چاہے پیس ڈالتا ہے، اور ایک غریب

انسان اگر اس کی داد و فریاد کرنا چاہے بھی تو اس کو سننے کے لیے کوئی شخص تیار نہیں ہوتا۔

حدیثِ مذکور میں بہت کھلے ہوئے الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ بعثت، نبوت اور اسلامی حکومت کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو اسلام سے پہلے عوام کے حقوق تلف ہو رہے تھے اس کا نظام از سرِ نو پھر درست کر دیا جائے، اب غور فرمائیے کہ یہاں شکایت کرنے والے کون ہیں اور ان کی شکایت کیا ہے؟ اور پھر یہ غور کیجئے کہ جس شخص کے متعلق یہ شکایت کی گئی ہے وہ ملکی لحاظ سے کس حیثیت کا مالک ہے؟ اس کے بعد پھر آپؐ کے فیصلے اور لب ولہجہ کے انداز پر بھی ذرا توجہ فرمایئے۔ یہاں شکایت کرنے والے وہ انصار ہیں جنھوں نے قدم قدم پر آپؐ پر جاں نثاری کا اور اپنی پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور جب آپؐ کی قوم نے غداری کی تو انھوں نے اپنے سر اور آنکھوں پر آپؐ کو بٹھانا اپنے لیے فخر سمجھا، اور شکایت صرف یہ ہے کہ جس طرح ہر جماعت بالخصوص عرب اپنی اندرونی زندگی کو آزادانہ رکھنا چاہتے تھے آئندہ بھی وہ اسی طرح آزاد رہے اور جن کے متعلق شکایت ہے وہ اہلِ مکہ میں سے ایک مہاجر ہیں اور گو مذہبی لحاظ سے بہت بڑے رتبہ کے مالک ہیں لیکن ہجرت کے ابتدائی حالات میں ابھی تک کسی مشہور حیثیت کے مالک نہ تھے۔ اس لیے ان تازہ مہاجر کا انصار کو اپنے محلہ کے درمیان رہنا شروع شروع میں کچھ قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوا ہو۔

ابھی تک مہاجرین اور انصار کے مابین رشتہ اور تعلقات کے اتنے گہرے علائق قائم نہ ہوئے تھے کہ انصار اپنے ابتدائی دور میں اپنی قدیمی عادات کے خلاف کوئی تأثر نہ لیتے اس لیے انھوں نے آپ کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ یہ درخواست پیش کی کہ زمین ان کو ضرور دی جائے لیکن ہمارے محلہ سے کہیں الگ ان کو قطعہ دیدیا جائے، تو ہمارے اور ان کے دونوں کے لیے مناسب ہوگا لیکن چونکہ اس واقعہ سے قبل آپؐ زمین کا وہ قطعہ ان کو دے چکے تھے تو اس جلیل القدر صحابی کے صرف نو وارد ہونے کی وجہ سے

طاقتور انصاریوں کے موافق فیصلہ دینا یہ حکومتِ اسلامی کے نظریہ کے خلاف تھا اسلیئے آپؐ نے کسی کی دل جوئی یا ناراضگی کی پروا کیے بغیر انصار کی درخواست مسترد کردی، اور ناگواری کے انداز میں یہ فرمایا کہ اگر میں طاقتوروں کے مقابلہ میں ضعیفوں کے حق دلوانے میں کوئی پس وپیش کروں تو پھر میری بعثت کا جو اہم مقصد ہے وہی فوت ہو جاتا ہے۔

سوچیئے کہ اگر آپ بالفرض کسی دوسرے مقام پر ان کو کوئی قطعۂ زمین اس سے بڑا عطا فرما دیتے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا لیکن چونکہ اس سے اصولی طور پر ایک غلط مثال قائم ہوتی تھی، اس لیے آپؐ نے پہلے ہی قدم پر اس کو اتنی سختی کے ساتھ روک دیا کہ آئندہ کسی کے دماغ میں اس قسم کے خیالات کا تصور بھی پیدا نہ ہونے پائے، پھر بہت جلد یہ نقشہ بدلا اور انصار اور مہاجر مل جل کر اس طرح رہنے لگے گویا وہ شیر وشکر تھے۔

بدقسمتی سے اِس وقت اُس بلند نظریہ پر عمل کرنا تو درکنار اس کے برخلاف تعلقاتِ وطنی، تعصب اور بڑے اور چھوٹے کا فرق اس طرح پیدا ہوگیا ہے گویا ہماری حکومتوں کے قیام کی بنیاد اسی پر ہے اور یہ ہم سمجھ چکے ہیں کہ اگر ہم اس غلط طریق کو اختیار نہ کریں تو ہمارے ذاتی اقتدار کا بقا ہی مشکل ہے اور میں یہ یقین رکھتا ہوں اور اس کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تمام نتائج شرعی نظام سے غفلت اور قادر مطلق کی ذات سے بے خوفی کے ہیں۔

سرکاری سزاؤں میں سفارش کرنے کا حق کسی کو نہیں۔

(۳۵) عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ قُرَيْشًا اَهَمَّهُمْ شَاْنُ الْمَرْاَةِ الْمَخْزُوْمِيَّةِ الَّتِيْ سَرَقَتْ فَقَالُوْا مَنْ يُّكَلِّمُ فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا وَمَنْ يَّجْتَرِئُ عَلَيْهِ اِلَّا اُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَهٗ اُسَامَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللهِ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ ثُمَّ قَالَ إِنَّمَا أُهْلِكَ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَايْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا۔ (متفق علیہ، ص ۳۱۴)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ بنی مخزوم خاندان کی ایک شریف عورت نے چوری کے جرم کا ارتکاب کیا تو اس کے معاملہ میں قبیلۂ قریش کو بڑی فکر دامنگیر ہوگئی (کہ اگر چوری کی سزا اس پر نافذ ہوگئی تو بڑی بدنامی کی بات ہوگی) اس بارے میں ان میں یہ گفتگو ہونے لگی، کہ کوئی ایسا شخص ہے جو اس شریف خاندان عورت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض معروض کر سکے۔ تو اس پر یہ بات طے ہوئی کہ بھلا اس بات کی کون ہمت کر سکتا ہے، ہاں اگر اسامہ بن زیدؓ ہمت کر جائیں تو کر جائیں، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے لاڈلے ہیں چنانچہ اس معاملہ میں ہمت کر کے اسامہ بن زیدؓ نے آپؐ کی خدمت میں سفارش کی، اس پر آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تنبیہ کے لہجہ میں فرمایا کہ اسامہؓ! کیا تم خدائی تعزیر کے معاملہ میں بھی سفارش کرتے ہو؟ اس کے بعد آپؐ نے اتنے ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ اس کی اتنی اہمیت محسوس کی کہ منبر پر کھڑے ہو کر یہ خطبہ دیا کہ تم سے پہلے لوگ اسی جرم کی پاداش میں ہلاک کیئے گئے ہیں کہ ان میں یہی بُری رسم پڑ گئی تھی کہ جب ان میں کوئی شریف آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کا ارتکاب کرتا تو جھٹ اس پر سزا کا حکم کر دیتے اس کے بعد آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر فرمایا کہ فاطمہؓ جو میری بیٹی ہے (عیاذاً باللہ) اگر اس جرم کا ارتکاب کرے تو میں اس پر بھی شرعی سزا نافذ کروں گا۔ (اعاذنا اللہ منہ)

شرح:۔ سرکاری سزا سے مراد یہاں قانون تعزیرات کا ایک خاص حصہ ہے جس کو اصطلاح میں "حدود" کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ سزائیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے معین کر دی گئی

ہیں اور ان میں حاکم کے لیے کمی وبیشی کا کوئی اختیار نہیں رکھا گیا ہے مثلاً زنا اور چوری کی سزا۔ اور معترضین کی نظر میں بھی دو سزائیں ہیں جو ان کو کھٹکتی ہیں ورنہ اسلام کی عام تعزیرات میں بڑی سہولت قائم رکھی گئی ہے لیکن ان دو سزاؤں کو اگر ذیلی دفعات کے ساتھ دیکھا جائے تو پھر اس میں کوئی شدت بھی باقی نہیں رہتی۔

اس وقت توجس بات پر تنبیہ کرنی ہے وہ یہ ہے کہ حدود کے سوا بعض جرائم وہ ہیں جن کی سزاؤں میں کمی وبیشی کرنے کا حاکم کو اختیار دیا گیا ہے ان میں اسلامی قانون تعزیرات میں انتہا درجہ کی سہولت قائم رکھی گئی ہے مثلاً شریف اور شریر کا فرق، اتفاقیہ اور عادت کا فرق اور اس قسم کے امور کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے اور حکام کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سزا دینے سے قبل اس پر غور کریں کہ وہ مجرموں کی شخصیت اور ان کی طبائع کا لحاظ رکھیں اور اس کا اندازہ کریں۔ کہ بعض اوقات سزا کا نفاذ کر دینا باعثِ انسدادِ جرائم ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شریف طبائع معافی کا جتنا اثر لیتی ہیں اتنا اثر سزا کا نہیں لیتیں۔ لیکن یہ سب رعایتیں حدود کے باب کے علاوہ دوسری قسم کی سزاؤں میں ہیں اور حدود میں بھی قانوناً حاکم کے لیے اس کے ثبوت کے دلائل پر غور وخوض کرنے کے لیے اتنے شرائط مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ ہر جگہ آسانی سے مہیا نہیں ہو سکتے، لیکن اگر کسی مقام پر معاشرہ کی برتری اور ماحول کی صلاحیت کی وجہ سے وہ شرائط پورے طور پر موجود ہو جائیں تو حاکم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ اس سزا کو بلا کسی پس وپیش اور بلا کسی تفریق نافذ کر دے کیونکہ مذکورہ بالا جرائم کے اثرات شرعی نظر میں خطرناک بھی ہیں اور متعدی بھی اور امراضِ متعدیہ میں آج بھی اس قسم کے مریضوں کے ساتھ تندرستوں کی مخالطت ممنوع سمجھی جاتی ہے۔ اور ان سے اجتناب وپرہیز ضروری سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ ان کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ اچھی طرح واضح رہنا چاہیئے کہ اسلامی قانونِ تعزیرات کا مقصد نظم ونسق قائم رکھنا ہے

صرف سزا دینا مقصود نہیں، اس لیے جو جرائم ناقابلِ برداشت ہیں ان کی سزائیں بھی سخت مقرر کرنی ناگزیر ہے۔ جو لوگ غور و خوض کیے بغیر اسلامی تعزیرات پر محض انگریزوں کی تقلید میں نکتہ چینی کرنے کے لیے زبانیں کھول دیتے ہیں وہ اپنی زبانیں بند کرلیں اور پھر آنکھ کھول کر دیکھیں کہ ان کے موجودہ قانونِ تعزیرات نے جرائم کا انسداد کر دیا یا اس میں اور اضافہ کر دیا اور پھر عارضی طور پر ہی سہی، اسلامی قانونِ تعزیرات کو نافذ کر کے دیکھیں کہ جرائم کا انسداد ہوتا ہے کہ نہیں، اتنی بھی ہمت نہ ہو تو ذرا ان ممالک کے اوپر ہی نظر ڈال لیں جہاں پر یہ قوانین کسی حد تک نافذ ہیں۔

تعزیرات کا منشاء مجرم کو راحت دینا نہیں بلکہ خلق اللہ کو راحت دینا ہے اگر اس پر نظر کرلی جائے اور عیسائیوں کے اعتراضات کا خوف دل سے نکال ڈالا جائے تو اسلامی قانونِ تعزیرات سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا، افسوس ہے کہ اس وقت یہ میرا موضوع نہیں ہے اس لیے اس کی تفصیل نہیں کی جا سکتی۔

حکومت کو غلط مشیروں سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے

(۳۶) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا بَعَثَ اللّٰہُ مِنْ نَّبِیٍّ وَّلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِیْفَۃٍ اِلَّا کَانَتْ لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَأْمُرُہٗ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَبِطَانَۃٌ تَأْمُرُہٗ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ۔ (رواہ البخاری- مشکوٰۃ ص ۳۲۱)

ترجمہ:- ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے جو بھی نبی اور خلیفہ بنایا ہے اس کے ساتھ دو قسم کے مشیر ضرور رکھے ہیں ایک مشیر وہ جو نیک کاموں کے لیے اس کو مشورہ دیتا تھا اور اس کی ترغیب بھی دیتا تھا اور دوسرا وہ جو برائی کا

مشورہ دیتا تھا اور اسی کی ترغیب دلاتا تھا اور برائی سے وہی بچتا ہے جس کو خدا ہی بچالئے۔

شرح:۔ نسائی شریف میں اس حدیث کی تشریح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں نقل فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب مسلمانوں کے امیر کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے سچا وفادار وزیر مقرر فرما دیتا ہے جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر غفلت سے امیر کسی بھلے کام کو بھول جائے تو وہ اس کو یاد دلا دیتا ہے اور اگر اس کو یاد ہو تو اس کو عملی جامہ پہنانے میں اس کی مدد کرتا ہے اور اگر خدا نہ کردہ مشیتِ الٰہیہ کچھ اور ہوتی ہے تو اس کے لیے بُرا وزیر مقدر فرما دیتا ہے جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ کوئی کارِ خیر اگر امیر بھول جائے تو اس کو یاد نہیں دلاتا اور اگر اس کو یاد ہو تو اسے کرنے میں روڑے اٹکاتا ہے (مشکوٰۃ شریف ص۳۲۲)

علماء نے لکھا ہے کہ ان دو مشیروں سے مراد ایک فرشتہ اور دوسرا شیطان ہے اور دونوں کی اپنی اپنی خدمات خیر و شر کی معلوم ہیں لیکن انبیاء تو عصمتِ خداوندی کی وجہ سے شیطان کے شر سے یقیناً محفوظ رہتے ہیں اور ان کے علاوہ جو خلفاء ان کے قدم بقدم چلتے ہیں ان کو بھی خدا تعالیٰ شیطان کے فریب سے محفوظ رکھتا ہے، یہ دو وہ قوتیں ہیں جن کا ادراک عام انسانوں کو نہیں ہوتا اسی لیے شریعت نے ان پر متنبہ کیا ہے۔

اسی طرح ہر حکومت کے ساتھ بھی اس کے مشیر دو قسم کے ہوتے ہیں اور ظاہری طور پر اپنی فطرت کے مطابق حکومت کو اچھے بُرے مشورے دیتے رہتے ہیں اور جب ایک ضعیف انسان دو متضاد مشیروں کے پھندے میں پھنس جاتا ہے تو پھر اس کے ساتھ اگر خدائی مدد نہ ہو تو بسا اوقات غلط مشیروں کی چرب زبانی اور فریب کاری میں پھنس کر رہ جاتا ہے، اس لیے حاکم کا فرض ہے کہ وہ مشورہ تو ضرور لے لیکن کسی مشیر کو اپنی پارٹی میں شامل نہ کرے اور نہ خود اس کی پارٹی میں شامل ہو۔ اور حاکم کی قابلیت کا معیار یہی ہے

کہ وہ آنکھ بند کر کے کسی پر اعتماد کے بجائے اپنے خدا پر بھروسہ کر کے اپنے عزم سے وہ راہ اختیار کرے جس میں کسی پارٹی کی بجائے مخلوقِ خدا کی بھلائی ہو۔

خوب یاد رکھیئے کہ حکومت کی صلاحیت کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اقتدار واختیار کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد خدا کی ضعیف مخلوق کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔؟

دو دشمنوں میں سے اگر کسی مصلحت سے ایک کے ساتھ ساز کرنا ناگزیر ہو جائے تو کس کے ساتھ ساز کرنا چاہیئے

(۳۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی الٓمّٓ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ قَالَ غُلِبَتْ وَغَلَبَتْ قَالَ کَانَ الْمُشْرِکُوْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ یَّظْهَرَ اَهْلُ فَارِسَ عَلَی الرُّوْمِ لِاَنَّهُمْ وَاِیَّاهُمْ اَهْلُ الْاَوْثَانِ وَکَانَ الْمُسْلِمُوْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ یَّظْهَرَ الرُّوْمُ عَلٰی فَارِسَ لِاَنَّهُمْ اَهْلُ کِتٰبٍ فَذَکَرُوْهُ لِاَبِیْ بَکْرٍؓ فَذَکَرَهٗ اَبُوْبَکْرٍؓ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسلم فَقَالَ اَمَا اَنَّهُمْ سَیَغْلِبُوْنَ فَذَکَرَهٗ اَبُوْبَکْرٍ لَهُمْ فَقَالُوْا اِجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَكَ اَجَلًا فَاِنْ ظَهَرْنَا کَانَ لَكَ کَذَا وَکَذَا وَاِنْ ظَهَرْتُمْ کَانَ لَکُمْ کَذَا وَکَذَا فَجَعَلَ اَجَلَ خَمْسِ سِنِیْنَ فَلَمْ یَظْهَرُوْا فَذَکَرُوْا ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَا جَعَلْتَهٗ اِلٰی دُوْنَ قَالَ اَرَاهُ الْعَشْرَ قَالَ قَالَ سَعِیْدٌ وَالْبِضْعُ مَا دُوْنَ الْعَشْرِ قَالَ ثُمَّ ظَهَرَتِ الرُّوْمُ بَعْدُ قَالَ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ اِلٰی قَوْلِهٖ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ قَالَ سُفْیَانُ سَمِعْتُ اَنَّهُمْ ظَهَرُوْا عَلَیْهِمْ یَوْمَ بَدْرٍ۔ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔ (ترمذی ابواب التفسیر)

ترجمہ:۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیت الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ الخ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آیۂ کریمہ میں لفظ غُلِبَتْ دو طرح پڑھا گیا ہے یعنی معروف بھی مجہول بھی (یہ علم نحو کی اصطلاحیں ہیں) وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ روم اور فارس کی جنگ میں مشرکوں کی دلی خواہش تو یہ تھی، کہ اہلِ فارس، رومیوں پر غالب آجائیں کیونکہ وہ دونوں شرک اور بُت پرستی میں مشترک تھے اور مسلمانوں کی تمنا یہ تھی کہ روم والے اہلِ فارس پر غالب آجائیں کیونکہ رومی گو کافر سہی مگر پھر بھی اہل کتاب تھے (اس لیے رومی بہ نسبت اہل فارس کے مسلمانوں سے قریب تر تھے) لہٰذا یہ بات انھوں نے صدیق اکبرؓ سے ذکر کی، حضرت ابوبکرؓ صدیق نے یہ خیالات آپؐ کی خدمت میں عرض کیے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا، رومی اہلِ فارس پر فتح پائیں گے چنانچہ ابوبکرؓ نے یہ بات مشرکوں سے کہہ دی، اس پر انھوں نے کہا اچھا تو اس کی کوئی مدت مقرر کرلو (تاکہ اس درمیان میں تمھارے صدق وکذب کا فیصلہ ہوجائے) اگر ہماری بات اونچی رہی، تو تم کو اتنا مال دینا پڑے گا اور اگر تمھاری بات سچی ثابت ہوئی تو ہم تم کو اتنا اتنا مال دیں گے (اس زمانہ تک بازی اور مال کی شرط لگانی اسلام میں درست تھی، بعد میں منسوخ ہوگئی۔)

اس پر حضرت صدیقؓ نے اپنی رائے سے پانچ سال کی مدت مقرر کردی مگر اس درمیان میں اہلِ فارس کو فتح حاصل ہوگئی، گویا صدیق اکبرؓ شرط میں ہار گئے۔ صدیق اکبرؓ نے یہ بات جاکر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپؐ نے فرمایا کہ تم نے دس سال سے کم مدت مقرر کیوں نہ کی۔ اور پانچ سال کی تحدید کیسے کردی، کیونکہ قرآن میں اس پیشین گوئی میں لفظ بضع آیا ہے جس کا اطلاق تین سے زیادہ اور دس سے کم پر ہوتا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے، کہ اس واقعہ کے بعد آخر کار یوں ہی ہوا کہ دس سال کے اندر ہی اندر رومی غالب آگئے چنانچہ لفظ غَلَبَتْ جو بصیغۂ معروف پڑھا گیا تھا اس کی تصدیق ہوگئی اور اس پیشین گوئی کا ظہور ٹھیک اپنے وقت مقرر میں ہوگیا اور مسلمان اس کی خوشیاں منانے میں مصروف ہوگئے، سفیانؒ کہتے ہیں کہ رومیوں کی یہ فتح جنگ بدر کے موقعہ پر ہی نصیب ہوئی اس لیے ان کو دہری خوشی

ہوئی، ایک بدر میں کامیابی کی، دوسرے پرانی پیشین گوئی کے ظہور کی۔

شرح:۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت شریفہ کے متعلق اپنے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ نو سال کے اندر اندر رومی غالب ہو جائیں گے کیونکہ لغت میں اور حدیث میں "بضع" کا اطلاق تین سے نو تک پر ہوا ہے، ان آیات میں قرآن نے ایک عجیب وغریب پیشین گوئی کی، جو اس مخالفت کی عظیم الشان دلیل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ کی بڑی بھاری دو سلطنتیں "فارس" (جسے ایران کہتے ہیں) اور "روم" مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں ۶۰۲ء سے لے کر ۶۱۴ء کے بعد تک ان کی حریفانہ نبرد آزمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (Encyclopeadia Britannica) کی تصریحات سے ظاہر ہے۔

۵۷۰ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء میں آپؐ کی بعثت ہوئی۔ مکہ والوں میں جنگِ روم وفارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں اسی دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوٰئے نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لیے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی، فارس کے آتش پرست مجوس کو مشرکین مکہ مذہبًا اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے۔ اور روم کے نصارٰی اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے بھائی یا کم از کم اتنے قریبی دوست قرار دیئے جاتے تھے۔ جب فارس کے غلبہ کی خبر آتی مشرکینِ مکہ مسرور ہوتے اور اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی فال لیتے اور خوش آئند توقعات باندھتے تھے۔ مسلمانوں کو بھی طبعًا صدمہ ہوتا کہ عیسائی اہلِ کتاب آتش پرست مجوسیوں سے مغلوب ہوں اور ان کو مشرکینِ مکہ کی شماتت کا ہدف بننا پڑے۔

آخر ۶۱۴ء کے بعد (جبکہ ولادتِ نبوی کو قمری حساب سے تقریبًا پینتالیس سال ہو چکے اور بعثت کے پانچ سال گذر چکے) خسرو پرویز (کیخسرو ثانوی) کے عہد میں فارس نے

روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کُن شکست دی. شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گئے، ہرقل، قیصر روم کو ایرانی لشکر نے قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کردیا اور رومیوں کا دارالسلطنت بھی خطرہ میں پڑگیا، بڑے بڑے پادری قتل یا قید ہوگئے. بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایرانی فاتحین لے اڑے، قیصرِ روم کا اقتدار بالکل فنا ہوگیا، بظاہر کوئی صورت روم کے ابھرنے اور فارس کے تسلط سے نکلنے کی باقی نہ رہی. یہ حالات دیکھ کر مشرکین مکہ نے خوب بغلیں بجائیں، مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کیا بڑی بڑی خوش آئند توقعات قائم کرنے لگے، حتیٰ کہ بعض مشرکین نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے، کل ہم بھی تمھیں اسی طرح مٹا ڈالیں گے، اس وقت قرآن نے سلسلۂ اسباب ظاہری کے بالکل خلاف عام اعلان کردیا کہ بیشک اس وقت رومی فارس سے مغلوب ہوگئے ہیں لیکن نوسال کے اندر اندر وہ پھر غالب ومنصور ہونگے. اسی پیشین گوئی کی بناء پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بعض مشرکین سے شرط باندھ لی (اس وقت تک ایسی شرط لگانا حرام نہ ہوا تھا) کہ اگر اتنے سال تک رومی غالب نہ ہوئے تو میں سو اونٹ تم کو دوں گا ورنہ اسی قدر اونٹ تم مجھ کو دوگے شروع میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے سے "بضع سنین" کی میعاد کچھ کم رکھی تھی. لعدہٗ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے "بضع" کے لغوی مدلول یعنی نوسال پر معاہدہ ٹھہرا اِدھر ہرقل قیصرِ روم نے اپنے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کا تہیہ کرلیا اور منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو فارس پر فتح دی تو "حمص" سے پیدل چل کر "ایلیا" (بیت المقدس) تک پہنچوں گا، خدا کی قدرت دیکھو کہ قرآنی پیشین گوئی کے مطابق ٹھیک نوسال کے اندر (یعنی ہجرت کا ایک سال گذرنے پر) عین بدر کے دن جبکہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر نمایاں فتح ونصرت حاصل ہونے کی خوشیاں منا رہے تھے. یہ خبر سن کر اور

زیادہ مسرور ہوئے کہ رومی اہلِ کتاب کو خدا تعالیٰ نے ایران کے مجوسیوں پر غالب فرمایا اور اس ضمن میں مشرکینِ مکہ کو مزید خذلان و خسران نصیب ہوا۔

قرآن کی اس عظیم الشان اور محیّر العقول پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کرکے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے سو اونٹ مشرکینِ مکہ سے وصول کیے جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کر دیئے جائیں۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ عَلٰی نِعَمَائِہِ الظَّاھِرَۃِ وَالْاٰیَاتِہِ الْبَاھِرَۃِ۔ یعنی پہلے فارس کو غالب کرنا روم کو مغلوب کرنا اور پیچھے حالات کو الٹ دینا، سب اللہ کے قبضہ میں ہے صرف اتنی بات سے کسی قوم کے مقبول و مردود ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان لوگوں میں) (پ۴، رکوع ۵) ایک تو اس دن اپنی فتح کی خوشی، اس پر مزید خوشی یہ ہوئی کہ رومی اہل کتاب (جو نسبتہً مسلمانوں سے اقرب تھے) فارس کے مجوسیوں پر غالب آئے، قرآن کی پیشین گوئی کی صداقت کا لوگوں نے مشاہدہ کر لیا۔ کفارِ مکہ کو ہر طرح ذلت نصیب ہوئی۔

شیخ الاسلام رحؒ کے یہ فوائد اس لیے نقل کیے گئے ہیں تاکہ آپ کو حدیثِ مذکورہ میں ذکر شدہ واقعہ کا تھوڑا سا تاریخی پس منظر معلوم ہو جائے اس کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن جب دنیا میں آیا تو فطری طور پر اس کے مخاطبین دو قسموں میں بٹ گئے، ایک وہ جنھوں نے اس کو سچا مانا اور اس کو تسلیم کیا وہ مسلمان کے لقب سے پکارے گئے۔ دوسرا گروہ جنھوں نے اس کو جھٹلایا اور اس کا انکار کیا وہ منکرین کی صف میں شمار ہوئے اور ان کا لقب کافر قرار پایا۔

اسلامی نقطۂ نظر میں منکرین کی پارٹی اگرچہ اجمالاً ایک ہی صف میں شامل رہی ہے لیکن تاہم ان میں کتبِ سماویہ کے نزول کی وجہ سے اہل کتاب اور غیر اہل کتاب ہونے کا فرق قائم رکھا گیا ہے یعنی جس جماعت میں خدا کی کوئی کتاب اُتری اگرچہ اسکے حاملین نے

اس کی ناقدری کرکے اس کی ایسی تحریف کی کہ اپنی اصلی شکل وصورت میں وہ باقی نہ رہ سکی اور اس لحاظ سے وہ محرف ہوکر ایک طریقہ پر دنیا سے گویا نیست ونابود ہوگئی۔ تاہم اس قوم کی نسبت ایک نازل شدہ کتاب کی طرف باقی رہی اور مسلمانوں کی نظروں میں اس لحاظ سے ان کا رشتہ ان کافروں سے پھر بھی بلند رہا۔ جن کی کسی آسمانی کتاب سے کوئی نسبت صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کسی نازل شدہ کتاب کی طرف وہ خود اپنی نسبت کرتے ہیں۔ تو یہ صرف ان کا اپنا دعوٰی ہے جس کا کوئی ثبوت نہ ان کے ہاتھ میں ہے اور نہ تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حدیث مذکور میں رومیوں کی فتح پر انکے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مجوسیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔ یہ ایک وقتی بات تھی جو اس وقت مقابلہ کی وجہ سے پیش آئی۔ تاہم اس میں ہمارے لیے ایک سبق ہے اور بہت اہم سبق ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر دو دشمن ہمارے سامنے ہوں تو اگرچہ دشمن ہونے میں وہ دونوں برابر ہوں لیکن اگر کسی مصلحتِ وقتی کی بنا پر ہم کو کسی کے ساتھ ساز کرنا ناگزیر ہوجائے تو ہم کو ترجیح کس کو دینی چاہیئے۔

قرآن کریم نے جس حقیقت کا جگہ جگہ اعلان فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ کافر خواہ وہ کسی فریق میں داخل ہو اس کے ساتھ قلبی محبت رکھنا یعنی اس کے ساتھ دوستی رکھنا، اس پر اعتماد کرنا ایک لمحہ کے لیے بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ ان کو اپنے معاملات میں مشیر بنانا اور ان سے مشورہ طلب کرنا اس کو تو حد درجہ کی حماقت قرار دیا گیا ہے اور تاریخی اور عقلی طور پر مختلف مقامات میں اس کو ثابت کیا گیا ہے، اگر میں ان آیات کا استیعاب کروں، تو جس اختصار کو ہر جگہ پر اختیار کرتا آیا ہوں، وہ یہاں میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا تاہم مُشتے نمونہ از خروارے ایک آیت تحریر کرتا ہوں جس سے آپ قرآنی نقطۂ نظر کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

(اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا، وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔ انکی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف میں رہو، نکلی پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو کچھ مخفی ہے ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے، ہم نے بتا دیئے تم کو پتے اگر تم کو عقل ہے، سن لو کہ تم لوگ ان کے دوست ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے، تو کہہ مرو تم اپنے غصہ میں اللہ کو خوب معلوم ہیں دلوں کی باتیں) (پ ۴، رکوع ۴)

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہاں صاف صاف آگاہ کر دیا کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور راز دار نہ بنائیں کیونکہ یہود ہوں یا نصاریٰ، منافقین ہوں یا مشرکین، ان میں کوئی جماعت تمہاری حقیقی خیر خواہ نہیں بلکہ ہمیشہ یہ لوگ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ تمھیں پاگل بنا کر نقصان پہنچائیں اور دینی و دنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں۔ ان کی خوشی اسی میں ہے کہ تم تکلیف میں رہو اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچ جائے۔ جو دشمنی اور بغض ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت ہی زیادہ ہے لیکن بسا اوقات عداوت و غیظ کے جذبات سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں، مارے دشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی۔ پس عقلمند آدمی کا کام نہیں کہ ایسے خبیث باطن دشمنوں کو اپنا رازدار بنائے۔

خدا تعالیٰ نے دوست دشمن کے پتے اور دوستی وغیرہ کے احکام کھول کر بتلا دیئے ہیں، جس میں عقل ہوگی ان سے کام لے گا، یعنی یہ کیسی بے موقع بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دم بھرتے ہو اور وہ تمھارے دوست نہیں بلکہ جڑ کاٹنے والے دشمن ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہو خواہ وہ کسی قوم کی ہوں اور کسی زمانہ میں کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں (جن کے خدا نے نام بتلا دیئے ان پر تفصیل کے ساتھ اور جن کے نام نہیں بتلائے ان پر بالاجمال ایمان رکھتے ہو) اس کے برخلاف یہ لوگ تمھاری کتاب اور تمھارے پیغمبر کو نہیں مانتے۔ بلکہ خود اپنی کتابوں پر بھی ان کا ایمان صحیح نہیں۔ اس لحاظ سے چاہیئے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفرت کرتے اور بیزار رہتے۔ مگر یہاں معاملہ برعکس ہو رہا ہے۔ منافقین تو کہتے ہی تھے۔ عام یہود و نصاریٰ بھی بحث و گفتگو میں "امنا" (ہم مسلمان ہیں) کہہ کر یہ مطلب لے لیتے تھے کہ ہم اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو تسلیم کرتے ہیں، یعنی اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت و محبت دیکھ کر یہ لوگ جلے مرتے ہیں اور چونکہ اس کے خلاف کچھ بس نہیں چلتا اس لیے فرطِ غیظ وغضب سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں، یعنی خدا تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو اور زیادہ ترقیات و فتوحات عنایت فرمائے گا، تم غیظ کھا کھا کر مرتے رہو، اگر ایڑیاں رگڑ کر مر جاؤ گے تب بھی تمھاری آرزوئیں پوری نہ ہوں گی۔ خدا اسلام کو غالب اور سربلند کر کے رہے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو ان شریروں کے باطنی حالات اور قلبی جذبات پر مطلع کر دیا اور سزا بھی ان کو ایسی دے گا جو اندرونی شرارتوں اور خفیہ عداوتوں کے مناسب ہو، قرآن کریم سے آپ کے عہد مبارک میں ایسی جماعت کا بھی پتہ چلتا ہے جو سرے سے خدا ہی کی منکر تھی، ان کے متعلق کسی رسول اور کسی کتاب کے ماننے کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے، اس فریق کا تذکرہ آیتِ ذیل میں کیا گیا ہے۔ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (اور کچھ نہیں بس یہی ہے

ہمارا جینا دنیا کا ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سو زمانہ سے (پ ۲۵، رکوع ۱۹)

اس جماعت کا وجود اُس وقت گو قلیل تھا اور بے علمی کی وجہ سے اس کو فلسفیانہ رنگ بھی نہیں دیا گیا تھا لیکن زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ جماعت بھی ترقی کرتی رہی اور عالمِ مادیات کی تحقیقات نے اس کو اتنا پھیلا دیا کہ اب وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں قلیل یا کثیر تعداد میں نظر آنے لگے اور علوم و فنون نے اس کو ایسا رنگ دیا کہ بڑی بڑی جماعتوں نے اس عالم کو جس کے ذرہ ذرہ میں پوشیدہ حکمت و اسرار اس کے علیم و خبیر خالق کا پتہ دے رہے تھے اس کا انکار کرکے ان سب کو براہِ راست ایک غیر ذی شعور مادہ کے سپرد کر دیا اور شدہ شدہ اس کے اثرات بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر بھی نمایاں ہونے لگے۔ اور یہ فرق ہماری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا کہ قدرت کس کا نام ہے اور فطرت کس کا نام ہے۔

انھوں نے عالم بے شعوری میں ان دونوں کے اصول و فروع کی رعایت کیے بغیر ان کو مرادف الفاظ تصور کر لیا حتیٰ کہ مسلمانوں میں بعض تعلیم یافتہ دماغ بھی عالم کے انقلاب کا رشتہ خدا تعالیٰ کی قاہرانہ طاقت کے بجائے مادی اسباب سے اس طرح قائم کرتے ہیں گویا یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا کوئی خالق ہے ہی نہیں۔ حالانکہ عالم پر اور اس کے نظام میں باہمی ربط پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو جو بات سب سے پہلے بدیہی ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا نہ صرف علیم و قدیر ہے بلکہ حکیم بھی ہے لیکن انسانی دماغ کی ساخت بھی عجیب ہے کہ وہ جس جانب ڈھل جاتا ہے بس اسی جانب کے دلائل تیار کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور دوسری جانب کی طرف اسکا خیال بھی منتقل نہیں ہوتا۔ ایسے نادان انسانوں کو انسانوں میں شمار کرنا بھی مشکل ہے ہماری موجودہ دنیا میں اب ایسے افراد کی اتنی کثرت ہوتی رہی ہے کہ جو ان کا مخالف ہو

اس کا شمار قدامت پرست اور بے عقلوں میں ہونے لگتا ہے لیکن جب کفار کی صف میں اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کا فرق اسلامی نقطۂ نظر سے ملحوظ رکھا گیا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ان منکرین کا شمار کس قطار میں ہوسکتا ہے۔

ہمارے زمانہ میں بڑی دشواری یہ ہے کہ ایک طرف اسلام ہے اور وہ بھی ضعیف شکل میں، دوسری طرف کفر اپنی مختلف شکلوں میں امڈا چلا آرہا ہے اور وہ بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ۔ اس لیے ضعیفوں کو اپنی معیشت کا توازن قائم رکھنے کے لیے طاقتور جماعتوں کا سہارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ یہ موقع نہایت نازک اور عمیق غور و فکر کا محتاج ہے یہاں عقلِ کوتاہ اندیش خدانہ کردہ اگر قادرِ مطلق کی طاقت سے ذرا غفلت کر جائے تو اسکو صحیح فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوجاتا ہے، وہ صرف اپنے مقصد کی کامیابی کے سوچنے میں اتنی مستغرق ہوجاتی ہے کہ دوسرے اطراف و جوانب کا استحضار اس کو نہیں رہتا۔ اور بسا اوقات اپنے نفع کی خاطر وہ ان مضرتوں کو بھول جاتی ہے جو اس تھوڑے نفع کے ساتھ لازمی طور پر اس کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

انسان کتنا ہی دانا ہو لیکن پھر بھی اس کی عقل قاصر ہے اس لیے ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی آخری فیصلہ کے مکمل کرنے سے پہلے کم از کم ایک نظر اپنے دین سماوی کی طرف بھی کرلے جس نے اپنے متعلق انسانی معاش اور معاد کے لیے ایک مکمل آئین ہونیکا دعویٰ کیا ہے۔ اس نے ایک اصول ہم کو یہ بھی بتلایا ہے کہ عالم کی ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی، اس لیے اشیاء کا صرف نفع ہی نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس میں زیادہ نفع ہے یا نقصان اور فیصلہ اس کے بعد کرنا چاہیئے لیکن انسان کی عجلت پسند طبیعت اس کو غور و فکر کی مہلت نہیں دیتی اور اپنے نفع کی خاطر دوسری جانب کی مضرت سے غافل ہو کر یک طرفہ فیصلہ کر ڈالتی ہے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اس کے عواقب نظر آتے ہیں تو وہ اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ معاملہ لا علاج اور قابو سے باہر

ہو جاتا ہے۔

اس لیے اگر دشمنوں میں سے کسی کے ساتھ ساز کرنا ناگزیر ہو جائے تو فیصلہ جذبات سے نہیں کرنا چاہیئے بلکہ نفع و مضرت کے توازن پر پورے غور و خوض کے بعد فیصلہ کرنا چاہیئے اسلام نے کافروں کے ساتھ دوستی اور اعتماد کی اگرچہ بڑی اہمیت کے ساتھ ممانعت کی ہے لیکن اپنی حدود میں رہ کر ان کے ساتھ عہد و معاملات کرنے میں بڑی وسعت رکھی ہے اور ان کی پابندی کرنا اولین فرض قرار دیا ہے۔ کاش کہ مسلمان سب باہم متفق ہو کر ایک اسلامی رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور یہ یقینِ محکم پیدا کر لیں کہ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (اور مدد ہے صرف اللہ ہی کی طرف سے جو کہ زبردست ہے حکمت والا) (پ۴، رکوع۴) تو انھیں آج دنیا بھر میں کسی کا منہ تکنا نہ پڑے اور نہ کسی کی خوشامد کی ضرورت باقی رہے لیکن باہم تفرقہ در تفرقہ پارٹی در پارٹی کا گلہ کس سے کیا جائے ؎

ہر کس کہ از دستِ غیر نالہ کند ٭ سعدیؒ از دستِ خویشتن فریاد

اس سے زیادہ اس مسئلہ کو میں اور صاف صاف الفاظ میں لکھنا پسند نہیں کرتا امید ہے کہ غور کرنے والوں کے لیے یہ مجمل کلمات کافی ہوں گے۔

نام نہاد اور غلط عالموں کا برسرِ اقتدار آنا اسلام کی بنیادیں ہلا دیتا ہے

(۳۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا یَنْتَزِعُہٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰکِنْ یَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یَبْقَ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُھَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۳۳)

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو یوں نہیں اٹھائے گا کہ اپنے بندوں کے سینوں سے چھین لے بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ علماء کو ایک ایک کرکے اٹھاتا رہے گا، یہاں تک کہ جب ایک عالم بھی باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو عالموں کے بجائے اپنا سردار بنالیں گے، وہ بے علمی کے ساتھ فتویٰ دیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ خود تو گمراہ تھے ہی، دوسروں کو بھی گمراہ کردیںگے۔

شرح:۔ خدا تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک صفت علم ہے اور یہی انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے، بلکہ ایک منشاء خلافتِ آدم علیہ السلام کا یہ بھی ہے۔ یہ حدیث خبردار کرتی ہے کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ یہ عظیم نعمت انسانوں سے واپس لے لی جائیگی اور یہ وہ خطرناک دور ہوگا جبکہ انسانیت کا گویا خاتمہ قریب ہوگا اور خلافتِ ارضی فنا ہونے والی ہوگی۔ اس نعمت کے اٹھنے کے اسباب بھی حدیثوں میں مذکور ہیں اور وہ علماء کی جانب سے ان کے قلوب میں دنیوی طمع کا پیدا ہونا اور مخلوق کی جانب سے اس کی ناقدری اور اس سے بے نیازی ہوگی۔

یہاں ایک تیسری بات کا ذکر ہے کہ اس عظیم نعمت کے اٹھنے کی صورت کیا ہوگی۔ یعنی یہ کہ جو صحیح علماء ہوں گے وہ اٹھتے چلے جائیں گے اور جو ان کے جانشین ہونگے وہ نام کے علماء ہونگے، ان کے سینے صحیح علم سے خالی ہوں گے یعنی علم نبوت اور خشیتِ الٰہی سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام گمراہی پھیل جائے گی اور جس طرح کہ علم ہی کے ذریعہ خلافتِ ارضی قائم ہوئی تھی اسی طرح اس کے خاتمہ سے وہ ختم بھی ہو جائے گی، ہمارا مقصد یہاں علم سائنس کی تعلیم سے روکنا نہیں بلکہ ہم کو اس کی آج بہت ضرورت ہے لیکن وہ سب کو معلوم ہے اس لیے جس بات پر زور دینا ہے وہ یہ ہے کہ کہیں اس شوق میں اصل علم فنا نہ ہو جائے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر صحیح علماء جدید فنون سیکھ لیں تو وہ جدید فنون کا

استعمال اس طرح کریں گے کہ ان فنون کا فائدہ بھی حاصل ہوگا اور صحیح علم بھی اپنے مرکز سے ہٹنے نہ پائے گا لیکن اگر جدید سائنسدان دو چار کتابیں پڑھ کر علماء کی فہرست میں داخل ہوگئے تو پھر یہ ہو کر رہے گا کہ دانستہ یا نادانستہ وہ علم صحیح کو سائنس کی جدید روشنی میں مطالعہ کریں گے جس کے بعد صحیح علم کا اپنے مرکز سے ہٹنا لازم ہوگا اس لیے آپ کو یہ فیصلہ کرلینا لازم ہے کہ آپ کو علمِ نبوت درکار ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا آپ کے نزدیک آئے دن سائنس کی تبدیلیوں سے وہ بھی قابلِ تبدیل ہونا چاہیئے یا نہیں؟ جدید تعلیم کی بدولت دیندار طبقہ میں جیسے سی اثرات پیدا ہوگئے وہ علامہ اقبال کے ان اشعار میں پڑھ لیجئے ؎

فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی ‌ ‌ ‌ رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے ‌ ‌ ‌ یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے

یہ تو ان کے زمانہ کا نقشہ تھا، اب اندازہ فرمالیجئے کہ اتنے عرصہ کے بعد اب دین کا نقشہ کیا ہوگیا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح مسلم میں منقول ہے:- اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (مشکوٰۃ ص ۳۷) یعنی یہ علمِ نبوت تمہارا دین ہے اس لیے جب اپنا دین حاصل کرو ذرا اچھی طرح دیکھ بھال کرلینا کہ جس سے تم دین حاصل کر رہے ہو وہ کیسا شخص ہے (یعنی دیندار ہے یا بے دین)

کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ قرآن پاک صرف اوراق میں اور اسلام صرف نام کا اسلام باقی رہ جائے

(۳۹) عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ

وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَّنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ۔ (رواه البيهقي۔ مشكوٰة ص ۳۸)

ترجمہ:۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ خطرناک زمانہ قریب ہی آنے والا ہے جبکہ اسلام کا صرف نام ہی باقی رہ جائے گا اور اسی طرح قرآن پاک کے بھی صرف نقوش باقی رہ جائیں گے، اس وقت اگر تم ان کی مسجدوں کو دیکھو گے تو وہ نمازیوں سے بھری ہوئی اور آباد نظر آئیں گی لیکن ہدایت کا ان میں نام بھی نہ ہوگا، اس لحاظ سے وہ سب برباد ہوں گی، ان کے علماء (دنیا طلب اور بے علم ہونگے) آسمان کے نیچے بسنے والوں میں سب سے بدتر ہوں گے اور ایسے فتنہ پرداز ہوں گے کہ فتنے ان ہی میں سے اٹھیں گے اور پھر لوٹ کر ان ہی میں داخل ہوں گے۔

شرح:۔ قرآن کریم صدیوں تک مسلمانوں کے لیے صرف تلاوت کرنے کی ایک کتاب نہ تھی بلکہ ان کی سیاسی اور مذہبی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل بھی یہی ایک کتاب تھی۔ جزیرۂ عرب سے نکل کر جب اسلام باہر نکلا اور قیصر و کسریٰ جیسی بڑی بڑی سلطنتیں اسلام کے زیر حکومت آئیں تو اس وقت مسلمانوں کی راہ نما بھی یہی کتاب تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں جب چار دانگ عالم میں اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا تو اس کی بنیاد بھی یہی کتاب اللہ تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ جملہ مفتوح اقوام صرف جنگلی بدّو نہ تھیں، بلکہ اپنے ممالک کے لیے کچھ منظم ضوابط و آئین بھی رکھتی تھیں، عمرانیات و صنائع اور ملکی ترقیات جتنی ان کے زمانہ میں تھیں، موجودہ زمانہ کی ترقیات کے لحاظ سے بھی وہ کچھ کم نہ تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جدید ضروریات نے ہمارے دماغوں کو کچھ جدید ایجادات کی طرف متوجہ کر دیا ہے جن کی اس وقت ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی اور یہ زمانہ کے ارتقاء کا طبعی تقاضا ہے لہٰذا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ سمجھنا خلافِ واقع ہے کہ

قرآنی حکومت صرف اس دور میں کامیاب تھی جب تک کہ دماغوں میں کسی قسم کی علمی روشنی موجود نہ تھی۔

گزشتہ دور کی ترقیات اور دماغی قابلیتوں کا اندازہ آثار قدیمہ اور غار ہائے الورا کے مشاہدات سے کیا جاسکتا ہے اور آگرہ کا تاج محل تو آج کی بات ہے۔ کیا ان زمانوں میں قرآنی قوانین بالکل معطل اور بیکار ثابت ہو چکے تھے؟ لیکن آج اسکی ناکامیابی کا تخیل جن اسباب کی بنا پر ہے وہ بہت تفصیل طلب ہیں جس کا یہ محل نہیں افسوس ہے کہ اس دستور العمل پر عمل کیے بغیر بلکہ اس کو سمجھے بغیر جب پہلے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر ڈالا جائے کہ قرآنی تعلیمات ہماری ترقیات کا ساتھ نہیں دے سکتیں، تو یہ وہی زمانہ ہے جس کی اس حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے اور جب ہماری زندگی کے گوشہ گوشہ سے قرآنی دستور نکل جائے اور اس پر کہیں عمل باقی نہ رہے تو پھر یہ دن وہی دن ہے جس کا حدیث مذکور میں بایں الفاظ ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن پاک کی حقیقت صرف اوراق میں مکتوب رہ جائے گی۔

کیا جو کتاب خالقِ کائنات کی جانب سے افضل الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر افضل مَلک کے ذریعہ سے زندگی کا ایک دائمی دستور العمل بن کر لوحِ محفوظ سے نازل کی گئی تھی، آج مسلمان اس کو صرف اس حیثیت میں دیکھنے پر راضی ہیں کہ وہ صرف اوراق میں لکھی ہوئی رہ جائے؟ اب آپ سنئے کہ اسلام کیا چیز ہے! اسلام کا اگرچہ اجمالی عنوان صرف کلمۂ طیبہ ہے لیکن اس کی تشریح میں وہ تمام تفصیلی دفعات بھی شامل ہیں جو قرآنی ضابطہ کے ماتحت صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے عہد میں احادیث نبویہ کی روشنی میں ان لوگوں نے مدوّن کی تھیں۔ جنھوں نے دورِ اول کے دینی ماحول میں دردر پھر کر مختلف اربابِ علم سے ان کو حاصل کیا تھا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دین ہو یا دنیا ہر ایک کے لیے ایک ماحول کی ضرورت ہے جس طرح کہ ہر درخت کے پھلنے پھولنے

کے لیے ایک خاص قسم کی زمین اور ایک خاص آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ہی درخت اپنے موافق زمین اور اپنے مناسب آب و ہوا میں جتنی آسانی کے ساتھ پرورش پاتا اور پھول پھل لے آتا ہے وہی درخت دوسری جگہ بڑی جدوجہد کے بعد بھی وہ نشو و نما حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اسلام جب عجم میں پھیلا اور مختلف قسم کے مذاہب، اور مختلف قسم کے عقائد اور مختلف مزاجوں کے لوگوں سے اس کو سابقہ پڑا تو ماحول کی اس ناسازگاری سے جو نشو و نما اس کو اپنے پہلے سازگار ماحول میں حاصل تھی، اب وہ حاصل نہ رہی اور اب تو آراء کا اختلاف اس درجہ ناگفتہ بہ حالت پر جا پہنچا ہے کہ ایک جماعت نے تو اسلامی تشریحات ہی سے صاف انکار کر ڈالا حالانکہ وہ اس دور میں مرتب ہوئی تھیں جس میں کہ احادیثِ نبویہ کی روشنی اور صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کی موجودگی سے اسلام کی تدوین ہوئی تھی لیکن جن لوگوں کو زبانِ عربی پر بھی عبور حاصل نہ تھا۔ اس پر جو ماحول ان کو نصیب ہوا وہ کفر کی طاقت کا ماحول تھا، ان حالات میں انھوں نے اس دور کی مرتب کردہ کاوشوں کا نام صرف چند اشخاص کی رائے رکھ کر اس کو ردی کی طرح پھینک دیا حالانکہ وہ متأخرین کے لیے بہت بڑا قیمتی ذخیرہ تھا۔

آج بھی دنیا میں کسی ضابطہ کی تشریحات میں بڑے بڑے ججوں کے فیصلوں کی بڑی قیمت سمجھی جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر براہِ راست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی انکار کر دینا اسلام کا ایک مسلّمہ اصول قرار دے ڈالا۔ اب ظاہر ہے کہ جب احادیثِ نبویہ ہی کی کوئی قیمت نہ رہی (العیاذ باللہ) تو اسلام کے ججوں کی تشریحات کی کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی، اس لیے بہت سے لوگوں کے سامنے اب ایک صرف قرآن رہ گیا جو کہ عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور وہ بھی فصاحت اور بلاغت کے اس اعلیٰ درجہ میں جس کا نام اعجاز ہے۔ اس کو ان لوگوں نے بڑے ادب اور

احترام کے ساتھ دینِ عِلم خود اردو یا انگریزی تراجم سے انسانی دماغ کی بنائی ہوئی سائنس کی روشنی میں مطالعہ کرنا شروع کیا اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو اسلام کا ہمنوا تو درکنار موجودہ زمانہ میں اس کے ناقابلِ عمل ہونے کا یقین کر چکا ہے۔ پھر اس کی اسلام پرستی کا یہ ایک احسان ہی کہیئے کہ اپنے اس مطالعہ سے جو قرآنی ضابطہ کی تشریح اس کے مغرب زدہ دماغ میں آگئی اس نے اس کا نام اسلام رکھ دیا اور اب اس جدید مجوزہ اسلام میں اتنی لچک اور وسعت پیدا ہو گئی کہ اگر اس میں نبوت کا اختلاف بھی پیدا ہو جائے تو پھر بھی وہ اسلام میں قابلِ برداشت ہو سکتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

خلاصہ یہ کہ اب اسلام کا مفہوم ایک ایسا مفہوم بنا لیا گیا ہے جو صرف کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے وسیع سے وسیع دائرے میں داخل رہنے سے باقی رہ سکتا ہے، اگرچہ اس میں اس کے بنیادی اصولوں میں سے کتنے ہی اصول کا انکار کر ڈالا جائے۔ اب اگر ان کو اس پر تنبیہ کی جاتی ہے تو اس کا نام فرقہ پرستی اور تنگ نظری رکھا جاتا ہے۔ اسکو حدیثِ مذکور کے الفاظ میں یوں ادا کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ اسلام کا نام ہی باقی رہ جائے گا۔ اور اس کی حقیقت اور اس کی روح یکسر فنا ہو جائے گی، کیا آپ ایسے اسلام کو پسند کرتے ہیں؟

حدیث کا تیسرا فقرہ بہت عبرتناک ہے اور اتنا ہی تعجب خیز بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اسلام کے اس دورِ تنزل کا نقشہ اس طرح نہیں بدلے گا کہ قرآن پاک ظاہری طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ رہے یا خدانہ کردہ وہ کھلم کھلا اسلام سے بیزاری کا اظہار کر دیں۔ اس کا نام تنزل نہیں یہ تو کھلا ارتداد ہے بلکہ یوں ہوگا کہ ظاہری رونق پہلے سے زیادہ ہوگی اور اسلام کا دعوٰی پہلے سے زیادہ طمطراق کے ساتھ ہوگا۔ ذرا نگاہِ عبرت سے دیکھیئے کہ کیا قرآن پاک کبھی اس آب وتاب سے چھپا کرتے تھے اور کیا کبھی غلغلۂ اسلام گلی اور کوچوں میں اس بلند آہنگی سے مچا کرتا تھا۔ اسی طرح حدیث کے تیسرے جملے میں

یہ بیان ہے کہ یہ تنزل اس طرح پیش نہیں آئے گا کہ مسجدوں کی تعمیر بند ہو جائے یا اس میں نمازی نظر نہ آئیں بلکہ مساجد پہلے سے زیادہ رونق دار بنائی جائیں گی۔ نمازی بھی اس میں پہلے سے زیادہ نظر آئیں گے مگر یہ سب کچھ فخر و مباہات کے لیے ہوگا۔ ہدایت کی روح ان میں گم ہوگی اور اس سب کی بنیاد یہ ہوگی کہ اس وقت جو ان کے علماء ہوں گے، وہ مخلوق میں اس وقت آسمان کے نیچے سب سے بدتر جماعت ہوگی اور جب علماء کا حال اتنا ابتر ہو جائے گا تو پھر روح ہدایت کہاں سے آئے۔

یہاں جس طرح اسلام کے دورِ انحطاط کی داستان ہے اسی طرح علماء کے دورِ انحطاط کا نوحہ بھی مذکور ہے جن کو اسلامی نقطۂ نظر سے علماء کہنا بھی غلط ہے، وہ صرف نام کے علماء ہوں گے۔ میں یہاں قدیم تاریخ کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا ابھی قریب ہی زمانہ میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کا خاندان مثلاً حضرت شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ، اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے زمانہ کے حضرت شیخ الہند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور ان کے بعد بھی بہت سے علماء ربانیین ایسے رہے ہیں جن کی تاریخ ابھی تک زندہ ہے اور وہ یہ شہادت دے سکتی ہے کہ اس طبقہ کو اسلام کی سربلندی کے سوا دنیوی مقاصد اور اقتدار سے ذرہ بھر بھی کوئی علاقہ نہ تھا۔ ان حضرات نے جہاد کیے اور اپنے وطن چھوڑے حتیٰ کہ بعض نے شہادت کے جام بھی ذوق و شوق کے ساتھ نوش کیے اور آئندہ علماء کے لیے اپنی زندگی کے یہی سبق چھوڑ گئے۔ اس لیے علی الاطلاق علماء سے بدگمانی کر کے علماءِ حق کو بھی نظر انداز کر ڈالنا اور اس کے برخلاف ایسی کوشش کرنی کہ جس کے نتیجہ میں ایسے علماء پیدا ہی نہ ہوں۔ جن میں صحیح اسلامی روح ہو اور صحیح اختلافِ رائے کرنے کی ہمت بھی ہو، اسلامی آئین کو زندہ کرنے کے بجائے ہمیشہ کے لیے اس کو دفن کرنے کے مترادف ہوگا۔

عالمِ نساء کی اہمیت کے باوجود اس کی بعض قدرتی اور اصولی خامیاں

(۴۰) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رض قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَضْحٰی اَوْ فِطْرٍ اِلَی الْمُصَلّٰی فَمَرَّ عَلَی النِّسَاءِ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَھْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ مَا رَاَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِیْنٍ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِیْنِنَا وَ عَقْلِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَلَیْسَ شَھَادَۃُ الْمَرْاَۃِ مِثْلَ نِصْفِ شَھَادَۃِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِھَا اَلَیْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِھَا (رواہ البخاری فی باب ترک الحائض الصوم ص ۴۴) ورواہ فی کتاب الایمان عن ابن عباسؓ مرفوعًا وفیہ قَالَ یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ وَیَکْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدٰھُنَّ الدَّھْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْکَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَاَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ۔

ترجمہ:۔ ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید قربان یا عید الفطر میں عیدگاہ کی طرف تشریف لائے (اس وقت عیدین کی نمازوں میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں) آپؐ کا عورتوں کی صفوں کی طرف گزر ہوا تو آپؐ نے ان کو صدقہ کرنے کے لیے رغبت دلائی اور فرمایا کہ صدقہ کرو کیونکہ مجھ کو جہنم کا نظارہ دکھلایا گیا تو اس میں زیادہ تر تم ہی کو دیکھا ہے۔

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے کس قصور پر؟ آپؐ نے فرمایا اس پر کہ تم بات بات پر لعنت کرنے کی عادی ہو اور اپنے شوہر کی بڑی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تمہیں دیکھا کہ جو دین و عقل میں ناقص ہو، پھر ایک سمجھدار پختہ کار شخص کی عقل پر پردہ ڈالنے والی تم سے بڑھ کر کوئی اور ہو سکتی ہے۔ اس پر انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے دین اور عقل میں خامی کیا ہے ذرا تشریح فرما دیجئے، آپؐ نے فرمایا کیا یہ بات نہیں ہے کہ ایک عورت کی شہادت مرد کی نصف شہادت کے برابر ہوتی ہے (یعنی دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے قائم مقام ہے) انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو ضرور ہے، آپؐ نے فرمایا یہ اسی وجہ سے تو ہے کہ تم میں عقل کا کچھ نقصان ہے۔ اب رہا تمھارے دین کا نقصان تو کیا یہ بات نہیں کہ تم جب اپنے خاص ایام میں ہوتی ہو تو نہ تم روزہ رکھ سکتی ہو اور نہ نماز پڑھ سکتی ہو، انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہی تو تمھارے دین کے ناقص ہونے کا ثبوت ہے۔

بخاری شریف کی دوسری روایت میں شوہر کی ناشکری کی تفصیل یہ ہے کہ اگر شوہر تمام عمر بھی تمھارے ساتھ احسان کرتا رہے پھر کہیں اتفاق سے کسی بات میں بال برابر اس سے ذرا کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو پٹ سے بول اٹھو گی کہ ہمارے ساتھ تو عمر بھر تم نے کبھی احسان کیا ہی نہیں۔

شرح:۔ اس سے قبل کہ میں حدیث میں صنفِ نساء کی فطری خامیاں ذکر کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا اعلان کر دوں کہ شریعتِ اسلام نے ایسے وقت میں عورت کے حقوق کا تعارف کرایا ہے جبکہ عورت کا وجود دنیا میں ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ایک مشفق باپ اپنی دختر یعنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دینا اپنا ایک فرض سمجھتا تھا تو پھر اگر وہی شریعت عورت کی فطری خامیوں کا کوئی تذکرہ کرتی ہے تو پھر اس پر یہ حکم لگا دینا کہ اسلام میں عورت کا کوئی حق نہیں سمجھا گیا، بہت بڑی

غلطی ہوگی۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کا وجود زندگی کے لیے ایک حیثیت سے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ مرد کا، میں جانتا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام مسجودِ ملائکہ بنے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خلافتِ ارضی کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔ مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کا خانۂ دل اس وقت تک ویران پڑا رہا جب تک کہ حضرت حوّا کا وجود ظہور پذیر نہ ہوا۔ اس لیے جب آدم علیہ السلام ہی کا خانۂ دل عورت کے بغیر ویرانہ رہا تو نسلِ انسانی میں وہ کونسا خانہ ہوگا جو عورت کے بغیر آباد ہوسکتا ہے۔ میں جانتا ہوں، کہ حضرت آدم علیہ السلام بڑے بڑے کمالات کے حامل تھے مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اپنی وحشت دور کرنے کے لئے پھر بھی کسی کی رفاقت کے پیاسے تھے اور جب تک حضرت حوّا کی پیدائش نہ ہوئی اس وقت تک ان کی یہ پیاس نہ بجھ سکی۔ اور ان کا خانۂ ویراں آباد نہ ہوسکا، اسی کی طرف قرآن مجید میں اشارہ فرمایا ہے وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس آرام پکڑے (پ ۹، رکوع ۱۴)

اگر عورت کے بغیر مرد کو قلبی سکون حاصل ہوسکتا تو کیا قدرتِ الٰہیہ آدمؑ کے لیے ایک دوسرا مرد اُن جیسا پیدا نہ کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ کے لیے بھی ایک انیسِ حیات کے سوا چارہ کار نہ تھا اور چونکہ اصلِ انسانی کے خصائص نسلِ انسانی میں نمودار ہونے ضروری ہیں اس لیے پھر یہ صفت انکی نسل میں ہمیشہ کے لیے موجود رہی کہ مرد خواہ وہ کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو وہ اپنی زندگی کی تکمیل کے لیے اور اپنے قلبی سکون وراحت کے حاصل کرنے کے لیے پھر بھی عورت ہی کا محتاج رہا۔ یہ نظریہ آج بھی مسلم ہے اور اسی نظریہ کے ماتحت شریعت نے نکاح کو مسنون فرمایا ہے کیونکہ بلا نکاح کے مرد کی زندگی کی تکمیل اور اس کے قلب کو سکون حاصل ہونا کیسے ممکن تھا جبکہ اس کی اصل میں یہی صفت موجود تھی۔

افسوس ہے کہ دنیا نے آج اس نظریہ کو تسلیم کیا مگر جو راستہ شریعت نے تجویز کیا تھا اس کو بدل کر ایک غلط راستہ اختیار کر لیا یعنی آج بھی متمدن ممالک میں عورت کی عظمت اس پر موقوف ہے کہ اس کے چند دوست غیر مرد بھی ہوں، اسی طرح کوئی مرد اسوقت تک بلند پایہ شخصیت کا مالک نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ اس کی رفاقت کے لیے چند اجنبیہ عورتیں نہ ہوں، حتیٰ کہ آجکل ہوائی جہاز میں یہ ایک قانون ہے کہ اگر سب سیٹیں پُر ہوں تو کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی انیسۂ حیات کو اپنی رفیقۂ سفر بھی بنا سکے بلکہ یہ ضروری ہے کہ متبادل طریق پر ہر شخص کی رفیقۂ سفر وہ ہو جو کسی دوسرے کی انیسۂ حیات ہو، کیا یہ رفاقت اسی لیے نہیں کہ مرد کے لیے مرد کی ہم نشینی اتنی باعثِ سکون نہیں ہو سکتی جتنی کہ عورت کی۔

پس نظریہ تو آج بھی وہی ہے لیکن طریقۂ کار اتنا مختلف ہے کہ جو فطرت کا تقاضا تھا اس کو غیر شرعی طریق پر پورا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ متمدن ممالک کا سفر کریں تو آپ کو ہسپتال میں ہر جگہ نرس (Nurse) ہی ملیں گی، آخر یہ کیوں؟ کیا مرد اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتے، پھر مریض کی تیمارداری کے لیے عورت ہی کو کیوں مناسب سمجھا جاتا ہے؟ اس قسم کی دوسری جزئیات سے آپ کو اس کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ جدید دنیا میں عورت کچھ ایسے کمالات کی حامل ہے جو مرد میں موجود ہی نہیں اور اسی طرح قدرت نے اس کے لیے کچھ ایسے فرائض مقرر فرمائے ہیں جن کی ادائیگی مرد کے بس سے باہر بات ہے۔

بلکہ میں ترقی کرکے اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ عورت کا وجود دنیا میں نہ ہوتا تو آج دنیا کی آبادی ہی معدوم ہوتی اور اگر اس موضوع پر میں زیادہ تفصیل کروں تو اس کے لیے ایک رسالہ درکار ہے لیکن اگر عورت کے ان تمام کمالات کے ساتھ قدرت نے اس میں کچھ خامیاں بھی رکھی ہیں اور خود صاحبِ شریعت نے ان کا اعلان

کیا ہے ان کا اظہار کردوں تو اس کے یہ معنٰی نہیں کہ میں عورت کے کمالات کا قائل نہیں اس لیے آپ یہ نہ کہیں کہ ؎

عیب ما جملہ بگفتی ہنرشش نیز بگو

اسی کے ساتھ میں یہ دعوٰی بھی نہیں کرتا کہ مرد میں کسی جہت سے کوئی نقصان نہیں جہاں حقیقت یہ ہے کہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اپنی تکمیل کے لیے دوسرے کی ضرورت ہے لیکن سوال حل طلب یہ ہے کہ کیا ہر ایک کے لیے میدان مشترک ہے یا علیحدہ علیحدہ تو مردوں کا عورتوں کے میدان میں قدم رکھنا یا عورتوں کا مردوں کے میدان کی طرف قدم بڑھانا کیا یہ طریقۂ انصاف ہوگا؟ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر آپ نے عورتوں کے حقوق کے معنٰی یہ سمجھے ہیں کہ مردوں کے جو حقوق تھے۔ ان سے چھین کر عورتوں کو دیدیئے جائیں تو بیشک آپ نے ایک طرف عورتوں کی ہمت افزائی کی لیکن دوسری طرف مردوں کی حق تلفی کا بھی خیال رکھیئے۔ جہاں آپ کو اس کا لحاظ ضروری ہے کہ عورتوں کی زیادہ سے زیادہ قدر دانی کرنی چاہیئے، اسی کے ساتھ یہ خیال بھی لازم ہے پھر اس جدوجہد میں جن کی قدر دانی فطرتاً مسلّم تھی کہیں ان کی ناقدری نہ ہونے پائے۔

اب تک جو گفتگو تھی وہ نوعِ انسانی کی دو صنفوں کے متعلق تھی، اب آیئے انکے افراد کا حل ذرا سا دیکھیئے یعنی یہاں بھی اللہ تعالٰی نے ہر انسان کو اپنی نعمتوں میں سے جوڑا جوڑا عطا فرمایا ہے، دو ہاتھ دیئے ہیں، دو پیر، دو آنکھیں، دو کان، اور ناک اگرچہ ایک ہے مگر اس میں بھی دو سوراخ ہیں، دہن بھی اگرچہ ایک نظر آتا ہے مگر اندر جاکر پھر اس میں دو نالیاں ہیں، ان میں بھی بالعموم انسان کا دایاں جانب بائیں جانب سے فطرۃً قوی تر ہے اور بایاں نسبتہً ضعیف، اسی طرح اگر شرف کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں بھی نظرِ شرعی میں دائیں جانب کو بائیں پر فوقیت حاصل ہے، حتٰی کہ ہر اشرف کام کے لیے دایاں ہاتھ اور پیر ہے اور دوسرے کمتر کاموں کے لیے بائیں

جانب ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس قدرتی تقسیم میں انسان کے بائیں جانب کی کوئی حق تلفی کی گئی ہے یا اس میں کچھ توہین ہے۔ نہیں نہیں وہ عین حکمت کے مطابق ہے حتیٰ کہ اگر کسی انسان کے بایاں بازو نہ ہو تو وہ بیکار سمجھا جاتا ہے اسی طرح اس کے اگر بایاں پیر نہ ہو تو وہ سیدھا کھڑے ہونے سے بھی قاصر ہوگا۔ بیلنس برابر رکھنے کے لیے یہاں دونوں کا وجود ایک سے زیادہ دوسرے کا ضروری ہے۔

اب اگر اس کو آپ سائنٹفک طریقہ پر سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھئے کہ انسان کے نظامِ حیات کے لیئے آکسیجن (Oxygen) اور نائٹروجن (Nitrogen) دونوں ضروری ہیں، لیکن دونوں کے خواص جدا جدا ہیں حتیٰ کہ اگر ایک کے بجائے دوسرا استعمال کر لیا جائے یا اس میں کچھ زیادتی پیدا ہو جائے تو انسانی حیات کا نظام درہم برہم بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جو خواص آکسیجن میں ہیں چونکہ وہ نائٹروجن میں نہیں اس لیے یہ اس کی توہین ہے اسی طرح اگر اس کے برعکس جو خواص نائٹروجن میں ہیں، اگر وہ آکسیجن میں نہیں تو کیا اس کی توہین ہے؟ رہی یہ بحث کہ کونسا جزو کتنا زیادہ ضروری ہے اس کا جواب مختلف حالات پر مبنی ہے کہیں زیادہ آکسیجن دینا پڑتا ہے اور کہیں زیادہ نائٹروجن دینا پڑتا ہے۔

اب اس سے آگے چل کر عالمِ حیوانات پر نظر کیجیئے تو قدرت کا قانون وہاں بھی بھی نظر آتا ہے جو عالمِ انسان میں یعنی نر و مادہ میں، نر قوی تر ہوتا ہے اور مادہ ضعیف پھر ہر ایک کی ذمہ داریاں بٹی ہوئی ہیں اور یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نر کے اوپر اپنی مادہ کی بہت سی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں جن کو وہ فطرتاً ادا کرتا ہے۔

عالمِ حیوانات سے گذر کر اگر آپ عالمِ نباتات پر نظر ڈالیں تو اس میں بھی نر و مادہ کا وجود مسلم ہے، عرب میں کھجور کے درخت میں، اسی طرح پپیتہ کے درخت میں اور اسی طرح دوسرے قسم کے نباتات میں بھی نر و مادہ کا تنوع موجود ہے۔ اس میں

مادہ بار آور ہوتی ہے اور نر بار آور نہیں ہوتا۔ اس کی شرح علم نباتات کے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں، یہاں اس کی تفصیل مقصود نہیں۔ خدا تعالیٰ کا عام اعلان ہے: وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (اور ہر میوے کے رکھے اسمیں جوڑے دو دو قسم کے) (پ ۱۳، رکوع ۷) اور اسی اصل کے ماتحت تخلیق کے ساتھ ان کا جوڑا بنایا گیا ہے، خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا) (پ ۴ رکوع ۱۲) یہ بھی معلوم ہو گیا ان میں اصل و فروع کی نسبت موجود ہے پھر مساوات کا سوال کیسا؟

اب زمین کو چھوڑ کر ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھائیے تو وہاں بھی شمس و قمر، اور مختلف قسم کے ستارے نظر آئیں گے جن میں ہر ایک میں جسامت اور صفات کا اسیطرح بڑا اختلاف موجود ہے مگر یہاں بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ سب کا وجود ہی عالم کیلئے یکساں ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اگر آپ صرف عورت کی جسمانی ساخت اور اس کی زندگی کے اطوار پر ہی گہری نظر ڈالیں تو پھر اس کا فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا کہ کیا وہ ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے پیدا کی گئی ہے؟ کیا وہ حاکمیت یا مثلاً سپہ گری کے لیے موزوں ہے؟ یہ بحث کہ حاکمیت کے شرائط کیا ہیں عنقریب آپ کے سامنے آنے والی ہے۔ لیکن تعجب اس پر ہے کہ جبکہ سپہ گری کے لیے مردوں میں بھی اتنے شرائط درکار ہیں جن پر ہر مرد کا پورا اترنا مشکل ہے تو پھر عورت کو مثلاً سپہ گری کے لیے کیسے موزوں خیال کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر ان کی فوج بنا دی جائے تو کیا اس کا نام ترقی یا عورت کا احترام رکھا جا سکتا ہے؟

ایک منصف اور فہیم شخص جب ہر عورت کی زندگی، اوضاع و اطوار پر نظر ڈالتا ہے، تو جو بات پہلی نظر میں اس کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قدرت نے اس کو انسانی نشوونما کے لیے ایک "نازک گہوارہ" بنایا ہے۔ ایک مدت دراز تک بحر ظلمات میں

اس کی پرورش کرنا، اس کے بعد اپنے خون کے قطرات اس کی غذا بنا دینا، اس کے بعد اپنی جان کو گھلا گھلا کر اس کی غذا بنا دینا، اس کے بعد اس کی پاک و صاف تربیت کرنا اس کے شرف کے لیے کیا کچھ کم ہے؟ مگر یہ فیصلہ آپ ہی کر لیجئے کہ ان حالات میں کیا اس پر مردانہ ذمہ داریوں کا بار ڈالنا اس کی فطرت کے مناسب ہے؟ خوب یاد رکھیے! اگر آپ نے قدرت کے مقابلہ میں ایک ضعیف صنف کو ترقی دے کر دوسری ترقی یافتہ صنف سے آگے بڑھانا چاہا تو یہ ضعیف صنف بامِ ترقی پر پہنچے یا نہ پہنچے لیکن اس کا نتیجہ ایک نہ ایک دن یہ نکل کر رہے گا کہ جو ترقی یافتہ صنف ہے، وہ فطرتاً کمزور پڑتی چلی جائے گی، اسی طرح یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے مردانی کرسی پر عورت کو بٹھایا تو اس کے نتیجہ میں ضرور عورت کی جگہ مرد کو بٹھایا جائیگا اور اس کے نظامِ عمل میں جو خلل واقع ہوگا اور ہو رہا ہے اس کا اندازہ آپ نہیں تو آپ کی نسلیں کر لیں گی۔

یہ تو اصلِ انسانی کی تصویر کا ایک رُخ تھا اب اس کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے یعنی جس طرح آدمؑ کی خانہ آبادی کا ذریعہ حضرت حوّا بنیں اسی طرح اسلامی تاریخ ہم کو یہ بتاتی ہے کہ ان کی خانہ بربادی میں بھی ان کا کچھ حصہ تھا یعنی شیطان نے اپنی دسیسہ کاریوں کا آلہ بنانے کے لیے حضرت حوّا ہی کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا حضرت حوّا کے لیے فخر یہ نہیں کہ وہ خلیفہ بن جاتیں، اس کے لیے تو قدرت ہی نے ان کا انتخاب نہیں کیا۔ لیکن کیا یہ فخر ان کے لیے کم ہے کہ وہ خلیفہ کے لیے اُنس و سکون کا واحد سامان قرار پائیں۔ جس طرح یہ خامی اصلِ انسانی میں حضرت حوّا میں نمایاں ہوئی ضرور تھا کہ وہ ان کی نسل میں بھی نمایاں ہو کر رہتی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بہت سی حکومتوں کی بربادی صرف صاحبِ مملکت کی انیسۂ حیات کے ذریعہ ہوئی ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے جب وائسرائے مقرر ہوا کرتا تھا تو اس دور میں بندگانِ اغراض

اپنی مقصد برآری کے لیے میم صاحب ہی کے گلے میں لاکھوں کے ہار ڈالا کرتے تھے اسکے بعد جب خوش قسمتی سے آزادی نصیب ہوئی تو اس مسئلہ میں ہمارے نصیب نے ہمارا ساتھ نہ دیا اور انگریز کی جاری کردہ رسم کی بنا پر دورِ آزادی کے بعد بھی اپنے اپنے مقاصد کیلئے میم صاحبہ ہی کو آلۂ کار بنانے کی پالیسی قائم رہی اور کیا کیا عرض کیا جائے۔ ہر قسم اور ہر عہد کی مثالیں ذہن میں ہیں اس جگہ ان کی تفصیل کرنی مصلحت نہیں ہے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

میرے اس بیان کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مردوں میں کچھ نقائص نہیں۔ میرے عقیدہ میں وہ بھی ناقص ہی ناقص ہیں اور ایسے ناقص کہ ان کا یہ فطری نقصان عورت کے سوا کوئی دوسرا پورا ہی نہیں کر سکتا مگر چونکہ ہمارے وقت کا مسئلہ نہیں ہے، اس لیے اس پر کلام بے فائدہ صرف تطویل ہے۔ اسی طرح میرا یہ مقصد بھی نہیں کہ عورتیں کسی ترقی کی مستحق نہیں اور نہ میں ان کو تعلیم دینے کا مخالف ہوں، مجھ کو جو کچھ کہنا ہے وہ یہ کہ ان کی ترقی کا میدان کیا ہے اور ان کی تعلیم کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے، تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ عالمِ اسلامی کی مجموعی ترقی کے لیے کیا صرف ڈگریاں پاس کر لینا یا انگریزوں کی حرص میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دینا ضروری ہے۔

اب آپ اپنے دماغ کو بے وجہ کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں سے صاف کرنے کے بعد حدیث کے الفاظ کی تشریح پر ایک امتی کی حیثیت سے غور فرمائیے تاکہ قدرت کے اَسرار و حِکَم آپ کے شیشۂ دل میں اُتر جائیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ عہدِ نبوی ؐ میں عیدین کی خوشی ایک اسلامی خوشی سمجھی جاتی تھی اور اس وقت بڑی اہمیت تھی کہ کفار کے سامنے اسلام کی بڑھتی ہوئی کثرت اور ترقی کا مظاہرہ کیا جائے لیکن یہ بھی اتنی احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا کہ ہر عورت اپنی چادر میں

سرتاپا لپٹی ہوتی تھی اور مردوں کی صفوں سے بالکل آخر میں ان کی صفیں قائم ہوتی تھیں اور اس کی سخت ترین ممانعت تھی کہ کوئی عورت مزین لباس میں یا خوشبو لگا کر نماز کے لیے آئے۔ حالانکہ وہ زمانہ صحابیاتؓ کا زمانہ تھا اور محفل ایک اولوالعزم معصوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی تھی، آپؐ ان کے رسولِ اعظم بھی تھے اور شفیق و بزرگ والد بھی، ان کے مربی اکبر بھی۔

اسلام کو اس وقت کفار کے مقابلہ میں مال کی بھی سخت ضرورت تھی، ملک مفلس تھا اور مقابلہ اہلِ ثروت وسطوت سے تھا۔ اس لیے صدقہ کی اپیل کرنی ضروری تھی، اس مقدس عہد میں سب سے زیادہ اہتمام عارضی حیات کی بجائے دائمی حیات کا رہتا تھا۔ اس لیے مال تو مال ہمیشہ اپنے جان ومال اور اپنے ہی نہیں بلکہ اپنی عزیز تر اولاد کی جانیں بھی اس مقصد کے لیے بڑی خوشی کے ساتھ قربان کی جاتی تھیں اس لیے آپؐ نے اسی حیات دائمی کے نام پر چندہ کی اپیل کی۔ ملک گیری کی ہوس میں نہیں وہ تو خود بخود اس کا ضمنی ثمرہ بن کر سامنے آ ہی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جب عورتوں کی فطری خامیوں کا تذکرہ آیا تو اللہ اللہ کیا ان پڑھ ملک اور کس غضب کی تہذیب کہ اس پر نہ کوئی ایجیٹیشن ہوا نہ کوئی شور برپا ہوا بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی اور کتنی دانشمندی، کتنی تہذیب کا ثبوت دیا اور بڑے ادب سے اپنی خامیوں کا سوال کیا اور جب اپنے گریبان میں منہ ڈالا، تو حرف بحرف ان کو درست پایا اور اسی وقت ادب سے سر جھکا کر سب کی سب راضی برضائے مولا خاموش ہوگئیں۔ اور مہمل سوالات کا ایک حرف بھی منہ سے نہ نکالا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جب مادہ پرست فطرت پر اعتراض کا کوئی حق نہیں رکھتے تو ایک خدا پرست کو قدرت پر اعتراض کا کیا حق ہو سکتا ہے اس لیے اگر انکی شہادت یا دین میں کوئی نقصان ہے تو یہ قدرت کا پیدا فرمودہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوق میں کامل کوئی بھی نہیں، یہاں کمال ہے تو مجموعہ میں ہے ورنہ ہر ہر مخلوق، کسی نہ کسی

حیثیت سے ناقص در ناقص ہے ہاں اگر کسی کو کامل یا ناقص کہا جاتا ہے تو یہ نسبتہً کہا جاتا ہے کیونکہ ابھی تک ہم نے کمال اور نقصان کی حقیقت کو سمجھا بھی نہیں اس لیے ہم دنیا کی اشیاء پر کمال یا نقصان کا جو حکم بھی لگاتے ہیں وہ اپنی فہم کے قائم کردہ معیار سے لگاتے ہیں۔

حدیث بالا پر اگر غور کیجئے تو یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی کمال کا معیار کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے نقصان کی حقیقت کیا ہے۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے صنفِ نساء میں جو پہلا نقصان آپؐ نے بیان فرمایا وہ عقل کا نقصان تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں سب سے پہلا انسانی کمال عقل کا کمال ہے، اس کے بعد آپؐ نے ان کے دین کا نقصان بیان فرمایا کیونکہ دین کا کمال عقل کے کمال پر موقوف ہے اس لیے کامل انسان وہ ہے جو عقل و دین میں کامل ہو اور جو ان دو میں ناقص ہو وہ ناقص انسان ہے، شریعت میں دین کا مفہوم بہت وسیع ہے اور انسانی زندگی کے گوشہ گوشہ پر پھیلا ہوا ہے، اگرچہ بعض ناواقف اصحاب کے نزدیک دین کا دائرہ بہت محدود ہے۔ شرعی مفہوم کے لحاظ سے دین کا کمال یہ ہے کہ انسان حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا پورا پورا لحاظ رکھے اور جہاں ان دونوں قسموں میں سے کسی قسم میں خلقتاً یا عمداً کوئی نقصان پیدا ہوا بس سمجھ لو وہیں دین میں نقصان پڑ گیا اس کے بعد آپ نے عورتوں کے متعلق جس صفت کا اظہار فرمایا ہے وہ دین کی صفات میں سے بلکہ انسانیت کی صفات میں سے سب سے بلند تر صفت ہے۔ یعنی احسان کرنا۔ شرعی لحاظ سے مُحسن ہونا کمالِ دین کی ایک امتیازی علامت ہے اور اسی اعتبار سے احسان فراموشی یہ سب سے بڑا نقصان ہے۔ چونکہ عورتوں میں بالعموم احسان فراموشی کا مادہ زیادہ نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ ان کے دین اور انسانیت کے نقصان کا بدیہی ثبوت ہے۔

اس حدیث کے ان چند مختصر الفاظ میں گویا کمالِ انسانیت کا خلاصہ نکال کر رکھ دیا گیا ہے اور اب اسی سے قیاس کر لیجیے کہ جو ان تین صفات میں ناقص ہوگا وہ دوسری صفات میں کتنا ناقص ہوتا چلا جائے گا۔

حکومت کی صلاحیت کے لیے دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت کے ساتھ خلق اللہ کے ساتھ احسان کرنے کا جذبہ ہونا بھی ضروری ہے

(۴۱) عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ ؓ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَضْلُ عَائِشَۃَ ؓ عَلَی النِّسَآءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَآئِرِ الطَّعَامِ کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَلَمْ یَکْمُلْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَاٰسِیَۃُ امْرَاَۃُ فِرْعَوْنَ

(بخاری ص ۴۸۸، ص ۴۸۴)

ترجمہ:۔ ابو موسیٰ اشعری ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (حضرت) عائشہ ؓ کی برتری دوسری عورتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسا کہ ثرید کی (اعرب میں نہایت زود ہضم، مقوی اور لذیذ ایک کھانے کا نام ہے) بقیہ سب کھانوں کے مقابلہ میں (اس کے بعد فرمایا) مردوں کا تو کیا کہنا ان میں تو بہت لوگ رتبۂ کمال کو پہنچے لیکن گذشتہ عورتوں میں جو کمال کے رتبہ کو پہنچیں ان میں سے قابلِ ذکر یہ چند ہستیاں ہیں (۱) حضرت مریم بنت عمران (۲) آسیہ زوجۂ فرعون۔

(۴۲) عَنْ اَنَسٍ ؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ حَسْبُکَ مِنْ نِّسَآءِ الْعَالَمِیْنَ مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَدِیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ وَفَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَاٰسِیَۃُ امْرَاَۃُ فِرْعَوْنَ۔

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ص ۵۷۳)

ترجمہ:۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم کو عورتوں میں کامل عورتوں کا تعارف منظور ہو تو تم کو بس ان عورتوں کا نام کافی ہے (حضرت) مریم بنت عمران (حضرت) خدیجہ بنت خویلد (حضرت) فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آسیہ زوجۂ فرعون۔

(۴۳) عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ نَفَعَنِیَ اللّٰہُ بِکَلِمَۃٍ سَمِعْتُھَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیَّامَ الْجَمَلِ بَعْدَ مَا کِدْتُّ اَنْ اَلْحَقَ بِاَصْحَابِ الْجَمَلِ فَاُقَاتِلَ مَعَھُمْ قَالَ لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَھْلَ الْفَارِسَ قَدْ مَلَّکُوْا عَلَیْھِمْ بِنْتَ کِسْرٰی قَالَ لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً۔

(رواہ البخاری ص ۶۳۷)

ترجمہ:۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے ایک کلمہ سنا تھا۔ بس نہ پوچھو اس نے مجھ کو جنگِ جمل میں کتنا فائدہ دیا۔ میں یہ ارادہ کر ہی چکا تھا کہ اصحاب جمل کے لشکر میں شریک ہو جاؤں اور ان کے ساتھ میں بھی جنگ شروع کردوں وہ کہتے ہیں وہ کلمہ یہ تھا کہ جب آپ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے زمامِ حکومت اس کی لڑکی کے سپرد کردی ہے تو یہ سنکر فرمایا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم کبھی کامیاب ہو سکے جس نے اپنے معاملات کی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں دیدی ہو (اس بنا پر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے زیر قیادت لشکر میں شریک نہ ہوا)

شرح:۔ احادیثِ مذکورہ میں پہلی امتوں میں سے نام لے کر صرف دو عورتوں کو بتلایا گیا ہے جن کو صنفِ نساء میں کامل کہا جا سکتا ہے۔ یہ آپ پہلے پہچان چکے ہیں کمال کی تعریف کیا ہے؟ اصطلاحی الفاظ میں قدیم فلسفہ میں کمال کی دو قسمیں کی گئی

ہیں۔ ایک قوتِ نظریہ، ایک قوتِ عملیہ، ان الفاظ کا جتنا بھی تجزیہ کیا جائے اس کا خلاصہ آخر میں صرف یہی نکلے گا کہ عقل اور عمل، اعمال میں صفتِ احسان کا کمال اس کی جتنی تفصیلات بھی کریں وہ سب ان ہی الفاظ کے تحت درج ہوں گی، اس کے بعد جب قرآنی آیات کو دیکھا جاتا ہے تو ان میں بھی عورتوں میں سے نام لے کر صرف ان دو عورتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک حضرت مریم اور دوسری آسیہ زوجۂ فرعون۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ الیٰ اٰخر سورۃ التحریم

(اور اللہ نے بتائی ایک مثل ایمان والوں کے لیے عورت فرعون کی) (پ ۲۸ رکوع ۲۰)

ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دو عورتوں میں سے جو مؤمنوں کے لیے بھی اس قابل ہیں کہ ان کو بطریقِ مثال بیان کیا جائے۔ ایک عورت آسیہ فرعون کی بیوی ہیں جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش میں بڑی محنت اور محبت سے حصہ لیا تھا۔ جب فرعون کو بعد میں ان کی قلبی حالت کا علم ہوا تو اس نے ان کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا لیکن انھوں نے اس صبر و استقامت سے کام لیا کہ ان پر اس تعذیب کا ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہ پڑا حتیٰ کہ اپنی جان دیدی۔ دوسری عورت حضرت مریم ہیں، ان کا کہنا ہی کیا، پاکدامنی میں ضرب المثل بنیں اور عبادت گذاری میں مردوں کی صف میں شمار ہوئیں۔

جب ان دو عورتوں کے متعلق قرآنی بیان کردہ الفاظ پر نظر کی جاتی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی صفات میں دو صفتیں اتنی ممتاز تھیں کہ ان میں کوئی عورت امم سالقہ میں ان کے ہم پلہ نہیں تھی۔ ایک عفت و پاکدامنی، جو اس درجہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ آج تک وہ اس صفت میں ہی ضرب المثل بنی ہوئی ہیں اور قرآن نے بھی خود ان کو اس صفتِ خاصہ میں مثل ہی کے طور پر اس امت کے سامنے پیش کیا ہے۔ دوسری صفت جو قرآنی الفاظ سے ان کی نمایاں ہوتی ہے وہ عبادتِ الٰہی ہے اور وہ بھی اس درجہ کی

کہ جس کی بنا پر ان کو عورتوں کی صفوں سے نکال کر عبادت گذار مردوں کی صفوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے عربی کے لحاظ سے آیتِ مذکورہ میں وَکَانَتۡ مِنَ الۡقَانِتَاتِ کی بجائے وَکَانَتۡ مِنَ الۡقٰنِتِیۡنَ فرمایا گیا، گویا وہ صفتِ عبادت میں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ انکی مثال عورتوں میں نہیں مل سکتی، مردوں میں ہی مل سکتی ہے۔

اس کے بعد دوسری عورت کا کمال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شقیِ ازلی، مدعیِ الوہیت کی بیوی ہو، اس نے کس طرح اس تنگ ماحول میں اپنے ربِ حقیقی کو پہچانا اور کس طرح دنیوی عیش و راحت سے بیزار ہو کر بن دیکھی جنت کی دعا کی اور کس صبر کے ساتھ فرعون کی ظالمانہ تعذیب کا کوئی اثر نہ لیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں صفتوں میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں ہے خواہ وہ کسی بھی درجۂ کمال پر ہو جو حاکمیت کی صلاحیت کی خبر دیتی ہو۔

اس امت میں جن دو عورتوں کا نام لیا گیا ہے ان میں سے ایک حضرت عائشہؓ ہیں اور دوسری حضرت خدیجہؓ، ان دونوں کے کمالات سے امتِ محمدیہ خوب آشنا ہے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے بالمقابل اس امت میں حضرت عائشہؓ نظر آتی ہیں۔ جن کی پاکدامنی کے متعلق قرآن میں مستقل ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ اور حضرت خدیجہؓ کی عقل و فراست کی کیا داد دی جا سکتی ہے جنھوں نے کفر کے ماحول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو اس جزم و یقین کے ساتھ پہچان لیا جیسے ایک مشاق سنار ایک نظر میں کھرے سونے کو پہچان لیتا ہے۔ اور جانی و مالی قربانی کا وہ ثبوت دیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس عظمت اور بزرگی کے باوجود حاکمیت و امامت کی صلاحیت کے لیے جو صفات درکار تھیں وہ ان مقدس در مقدس ہستیوں میں بھی شرعی لحاظ سے مفقود تھیں۔ حضرت سیدۃ النساءؓ کے فضائل سے حدیثیں بھری پڑی ہیں، اگر عورتوں میں کوئی حاکمیت کی مستحق ہوتی تو

وہ سب سے پہلے مستحقین کی صف میں شمار ہوتی، لیکن اس کے لیے دورِ اول میں بھی انکی طرف نظریں نہیں اٹھیں۔

اسلام میں امامت کی دو قسمیں ہیں، امامتِ صغریٰ یعنی نماز کا امام اور امامت کبریٰ یعنی مسلمانوں کے عام نظم و نسق کا امام۔ پھر امامتِ صغریٰ کا منصب بھی امام اکبر میں مندرج تھا، یعنی نماز کا امام بھی خود امام اکبر ہوتا تھا یا وہ شخص ہوتا تھا جو اس کا مقرر کردہ ہو۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ بحث بہت طویل ہے جس کا یہ محل نہیں، اس لحاظ سے بھی اگر آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مذکورۂ بالا ان مقدس عورتوں میں سے کسی میں جب اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ نمازوں میں مردوں کی امام بنائی جاسکیں تو ان کے حاکمِ عام بننے کا سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا ہے؟ اس میں عورتوں کا کوئی نقصان ثابت نہیں ہوتا اور ان کے کمال کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی۔ جس طرح مرد کہ اگر ولادت نہیں ہوتی تو اس سے اس کا نقصان ثابت نہیں ہوتا اور اس کے کمال پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ ہر صنف کا کمال علیحدہ علیحدہ ہے۔ اور اس لحاظ سے اگر عورت شرعی نظر میں حکمران نہیں ہوسکتی بلکہ نماز میں مردوں کی امامت بھی نہیں کرسکتی تو اس سے اس کی عزت و احترام میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

مذکورۂ بالا صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ کمال جس کا نام ہے وہ عقل اور دین اور انسان میں مُحسن ہونے کی صفت کا نام ہے۔ قرآن شریف کی ایک دوسری آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی صلاحیت کے لیے دماغی لیاقت اور جسمانی قوت و طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ حضرت طالوت علیہ السلام اور جالوت بادشاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت طالوت علیہ السلام کی لیاقت اور حکومت کی صلاحیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں) (پ ۲ رکوع ۱۶) اس لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو

مرد اور عورت کی دو صنفوں میں مجموعی لحاظ سے جتنی دماغی لیاقت اور جسمانی طاقت مردوں کی صنف میں ثابت ہوتی ہے اتنی صنفِ نسار میں ثابت نہیں ہوتی اور آج جہاں کہیں عورتوں کی حاکمیت کا ثبوت شاذ و نادر طور پر ملتا بھی ہے تو یہ بات ثابت ہو کر رہتی ہے کہ وہاں بھی اندرونی طور پر مرد کی طاقت کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ تاریخی صفحات میں تلاش کریں تو دنیا کی تاریخ میں صنفِ نسار میں حاکمیت کا حصہ برائے نام ہی ثابت ہوتا ہے۔

آخر میں قلم یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ حاکم میں دیگر صفات کے سوا سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ زیردست رعایا پر احسان کے لیے مضطر ہو، ان کی جفاؤں پر اس کے دل میں ذرا انتقام کا خیال نہ گذرے بلکہ ہمہ تن شفقت ہی شفقت ہو پھر سوچیئے کہ جن میں صفتِ احسان کی بجائے کُوٹ کُوٹ کر اپنے محسن کی احسان فراموشی بھری ہوئی ہو ذرا ذرا سی بات پر تیزی و ناگواری کی سرشت موجود ہو وہ صنف بھلا حاکمیت کی صلاحیت کیا رکھ سکتی ہے؟ اب اگر آپ فطری اور شرعی و تاریخی جملہ حیثیات سے قطع نظر کر کے نئی جد و جہد اسی پر شروع کریں کہ عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ نظم و نسق کی ہر ہر صف میں نظر آنا چاہیئے تو یقیناً یہ ایک نیا تجربہ ہوگا اور اس کو کامیاب کہہ دینا شاید بہت قبل از وقت ہو کیونکہ جب ہزاروں سال کا تجربہ اس کے خلاف ہے، تو جب تک ہزاروں سال کا آئندہ تجربہ گذشتہ تاریخ کی تکذیب نہ کر دے اسوقت تک اس جدید تجربہ کو کامیاب سمجھ لینا انسان کی فطری عجلت پسندی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

عورت علمِ تشریح کی نظر میں

اب آئیے علمِ تشریح کی رُو سے بھی صنفِ نسار پر ایک نظر ڈالتے جائیے، تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ کیا عورتوں کو حاکم بنا دینا، یہ ان کے لیے خواہ ترقی کی راہ ہو یا نہ ہو، لیکن عالم کا

نظم ونسق قائم کرنے کے لیے موزوں ہوگا کہ نہیں؟

آج سے تقریبًا بیس پچیس سال قبل میں نے ایک کتاب "المرأۃ المُسلِمہ" دیکھی تھی جس کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "مسلمان عورت" کے عنوان سے کیا تھا۔ اس میں مرد وعورت کے اعضائے ظاہری اور حواس خمسہ کے متعلق علم تشریح کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ عورت مجموعی لحاظ سے مرد سے فطرتًا زیادہ ضعیف پیدا کی گئی ہے۔ میں نے اسی وقت اپنے ذوق کے مطابق اس کی ایک یادداشت اپنے پاس رکھ لی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت وہی میرے سامنے ہے اور اصل کتاب نہ اس وقت میرے پاس موجود ہے نہ اس کے مطالعہ کی ہمت وطاقت۔ اس لیے نقشہ ہائے ذیل میں جو اوزان نقل کیے گئے ہیں وہ اسی نقل کی بنا پر ہیں، بہت ممکن ہے کہ اس میں کہیں قلم سے سہو ہوگیا ہو، اگرچہ انشاء اللہ اس کی امید کم ہے۔

مرد اور عورت کے طول میں اوسطًا ۱۲ سنٹی میٹر کا فرق ہے

جسامت:-

مرد کے ثقل جسم کا اوسط : ۴۷ کیلو
عورت کے ثقل جسم کا اوسط : ½۴۲ کیلو
فرق : ½۴ کیلو

حرارتِ غریزی:-

کاربونک ایسڈ کے جلانے کا فرق

مرد ایک گھنٹہ میں تقریبًا ۱۱ ڈرام جلاتا ہے
عورت ایک گھنٹہ میں تقریبًا ۶ ڈرام جلاتی ہے
فرق تقریبًا : ۵ ڈرام

دماغ :۔

مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط	عورت کے دماغ کے وزن کا اوسط
۴۹½ اوقیہ	۴۴ اوقیہ
۲۸۷ دماغوں کے وزن کے نتیجہ میں سب سے وزنی دماغ ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹا ۳۴ اوقیہ کا ثابت ہوا۔	۲۹۱ دماغوں کے وزن کے نتیجہ میں سب سے وزنی دماغ ۵۴ اوقیہ اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا

نوٹ :۔ بیوقوفوں کے دماغ کا وزن ۲۳ اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا۔ مسلم داناؤں کے دماغ کا وزن ۶۰ اوقیہ سے بھی متجاوز ثابت ہوا۔

قلب :۔ عورت کا قلب مرد کے قلب سے ۶۰ ڈرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے۔

عضلات :۔

عورت کے عضلات اس قدر ضعیف ہیں کہ اگر ان کی طبعی قوت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے مرد میں اور ایک حصہ عورت میں ثابت ہوگی، یہی نسبت انکی سرعت اور ضبط میں بھی ہے۔

حواسِ خمسہ ۔ قوتِ شامہ :۔

(الف) عورت ایک خاص فاصلہ سے "عطر لیموں" کی خوشبو محسوس نہیں کرسکتی اور مرد اس درجہ کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کرلیتا ہے جس سے دوچند مقدار کی خوشبو سے عورت کو احساس ہوسکتا ہے۔

(ب) عورت ہلکے سے "براسک ایسڈ" کی بو .... ۱/۲ کی نسبت سے اور مرد .... ۱/۱ سے محسوس کرسکتا ہے جو ضعف کی بیّن دلیل ہے۔

ذوق اور سمع :۔

اسی فرق کی وجہ سے طعام کی عمدگی اور بدمزگی کے پہچاننے والے، آواز کے پرکھنے والے اور پیانو کی راگوں کے نقاد کُل کے کُل مرد ہیں۔

لا امسہ جن آلام اور تکالیف کی متحمل عورت ہوتی ہے مرد اس قدر نہیں ہو سکتا، یہ اس کے حق میں بڑی نعمت ہے ورنہ اس سے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مرد و عورت کے دماغوں کے وزن کا یہ فرق جو اس سے قبل نقشہ میں دیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کے بھیجے کا وزن اوسطاً عورت کے بھیجے سے سو ڈرام زیادہ ہوتا ہے یہ اختلاف صرف جسمانی اختلاف کا نہیں نتیجہ کہا جا سکتا کیونکہ یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس کی جسمی حالت سے وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے مگر عورت کا بھیجا اس کی جسمانی قوت سے چوالیس اور ایک کی نسبت رکھتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی ضعف پر مبنی ہے تو مقابلۃً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے علاوہ اس کے عورت کے سر کے بھیجے میں پیچ و خم نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام بھی بالکل ناکمل ہے اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کے جوہر سنجابی میں بھی سخت اختلاف ہے جو ہر سنجابی قوت ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے

تعلیم و تربیت نسواں کا صحیح مفہوم

اب یہاں ایک سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اب تک عورتوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یہ اس کا منفی پہلو تھا آخر ان کے لیے کوئی مثبت پہلو بھی ہے کہ نہیں؟ یعنی ان کی ترقی اور تعلیم کا میدان، اگر یہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ یہ مسئلہ بھی بہت طویل الذیل ہے اور غور و فکر کا محتاج ہے لیکن مختصر الفاظ میں اگر آپ سمجھ سکتے ہیں تو اس مختصر رسالہ میں اتنا ہی لکھا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے دو شعبے ہیں ایک اندرونی، دوسرا بیرونی۔ یعنی ایک باہر کی زندگی دوسری گھریلو زندگی، شریعت نے ان زندگیوں کو اسطرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ بیرونی زندگی کی ذمہ داریاں مرد پر رکھ دی ہیں اور اندرونی زندگی کی ذمہ داریوں کا بار عورتوں کے سر رکھا گیا ہے اور اس طرح تقسیم کار سے انسانی طبقات

یعنی ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ جملہ اقسام کو مکمل کر دیا ہے۔

گھریلو زندگی میں سب سے پہلے عورت کے سامنے تربیتِ اطفال اور نظامِ خانہ داری کے اہم فرائض ہیں اس لیے ان کی تعلیم و تربیت میں ان ہی چیزوں کا خیال مقدم رکھنا چاہیے جو ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ کارآمد ہو سکیں پھر اسی کے ساتھ اس میں تینوں طبقات کی رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے تاکہ غریب گھر بھی اپنے دائرۂ وسعت میں اتنی ہی راحت کے ساتھ بسر کر سکے جتنا کہ ایک متوسط یا اعلیٰ طبقہ، پھر ایک اپنی صلاحیت کے لحاظ سے جو طبقہ جتنی ترقی کر سکتا ہے وہ کر جائے۔ ظاہر ہے انسانی گھروں کے مختلف طبقات بیک وقت یکساں ترقی نہیں کر سکتے اور اسی نکتہ کی فروگذاشت کرنے کی وجہ سے آج ہمارے بہت سے گھر ویران نظر آتے ہیں یعنی ایک غریب گھرانہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی ایک دم وہ بنا لے جو کسی بڑے گھرانے کا ہوتا ہے ظاہر ہے ایک دم اس کو یہ ترقی کرنی مشکل ہوتی ہے۔ اور اس لیے اس کو مختلف قسم کے مصائب کا شکار بننا پڑتا ہے اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی ادنیٰ طبقہ کو ترقی کرنے کا موقع نہ دیا جائے یہ تو حکومت کا اولین فرض ہے لیکن ظاہر ہے کہ جو ترقی تدریجی ہو سکتی ہے اس کو فوری طور پر تو پیدا نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے کچھ وقت درکار ہے اور اس درمیانی وقفہ کیلیے یہ ضروری ہے کہ ہر طبقہ اپنی اپنی وسعت کے دائرہ میں رہ کر اپنی زندگی کو راحت بخش اور بلند بناتا رہے۔

عورتوں کی زندگی پر ایک سطحی نظر ڈالنے کے بعد جو بات سب سے پہلے ہماری نظر میں آتی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بعض ذمہ داریاں اتنی اہم ہیں جن کو ہر مرد انجام نہیں دے سکتا۔ مثلاً تربیتِ اطفال اور نظامِ خانہ داری۔ لبظاہر گو یہ بہت مختصر عنوانات ہیں مگر اس کی ذیلی دفعات مختلف طبقات کے لحاظ سے بہت وسعت رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان مسائل پر تفصیلی غور کریں آئیے اپنے غریب اور متوسط

گھروں کا پہلے مختصر سا جائزہ لیں تاکہ ان کی اصلاحی تدابیر میں ہم کو کچھ مدد مل سکے اور جو غیر اصطلاحی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ان کے ترک کرنے کی وجوہات خودبخود واضح ہو جائیں۔

ہمارے غریب گھر بد قسمتی سے نہ صرف "غیر تعلیم یافتہ" بلکہ "غیر تربیت یافتہ" ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچے گندگی میں پرورش پاتے ہیں۔ غذا ان کے لیے مہیا نہیں ہو سکتی اور جو غذا ان کے لیے مہیا ہوتی ہے اس کا نہ اہتمام کیا جاتا ہے اور نہ اس کو وقت پر دیئے جانے کا کوئی خاص انتظام ہوتا ہے اس طرح ان کی نشوونما میں بہت فرق پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کے ماحول کی جہالت کی وجہ سے ان کی دماغی صلاحیتیں روز بروز مضمحل پڑتی چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ جب وہ جوان ہوتے ہیں تو جنگ وجدال کے سوا اور کوئی چیز ان کے ذہن میں نہیں ہوتی۔ اسی طرح جو کپڑے بمشکل ان کو میسر آجاتے ہیں وہ بھی اتنے بدقطع اور بدوضع سلے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے دماغوں میں کوئی اولوالعزمی پیدا ہی نہیں ہو سکتی بلکہ ترقی کرنے کے لیے حرص کا مادہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اب اگر انکے گھروں پر نظر ڈالیے تو نہ اس میں برتن، نہ سونے کے لیے چارپائی اور نہ کوئی دوسرا انتظام نظر آتا ہے اور ان میں سے جو چیزیں ہوتی بھی ہیں وہ گودڑ کی طرح میلی کچیلی گھر کے اندر بکھری پڑی نظر آتی ہیں۔

شوہر محنت و مزدوری کے بعد خدا خدا کر کے جو چند کوڑیاں جمع کر کے لاتا ہے صحیح طور پر اس کو ٹھکانے لگانے کا سلیقہ تو کیا اس کی بیوی ذرا سی دیر میں اس کو اڑا دیتی ہے۔ اپنا شوہر اور اپنے بچے اگر بیمار پڑ جاتے ہیں تو ان کی تیمارداری کا تصور بھی اسکے دماغ میں نہیں آتا، غرض ہماری اکثریت جو زیادہ تر غربت کا شکار ہے، دن بدن صحت تہذیب اور دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے اتنی گرتی چلی جاتی ہے کہ گویا وہ ایک ترقی یافتہ جانور ہو کر رہ گئی ہے اب رہے وہ غرباء جو شہروں میں آباد ہیں وہ متوسط یا بڑے طبقہ کی

حرص میں افلاس کا شکار بنے ہوئے ہیں اور مجبوری قرض لے لے کر اپنی زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔

اس لحاظ سے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارے گھر کی عورتیں میٹرک اور ایف اے میں داخلہ لینے کے بجائے یہ سیکھیں کہ ان کو اپنے بچوں کی کس طرح پرورش کرنی چاہیے، ان کی صحت اور غذا کا اہتمام کس طرح کرنا چاہیے اگر وہ بیمار پڑ جائیں تو کسی قریبی ہسپتال میں جا کر ان کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ان کی دماغی صلاحیتوں کا اندازہ رکھنا چاہیے اور جو ان میں شوقین یا ہونہار نظر آئے اس کو کسی تعلیم گاہ میں داخل کر دینا چاہیے، اپنی خانہ داری کے امور میں جو کچھ رزق اور سامان قدرت نے ان کے نصیب میں لکھ دیا ہے اس کو کس طرح صرف میں لانا چاہیے اور ان کی صفائی و ترتیب کا خیال رکھنے میں کتنی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے مزدور شوہر کی اطاعت شعاری اور دلداری کتنی کرنی چاہیے تاکہ ایک غریب جو کہ باہر سے ابھی ابھی گالیاں سن کر آرہا ہے کم از کم اپنے گھر میں تو کچھ عزت کے سانس لے سکے اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنی بیرونی زندگی میں بھی اس میں خودداری اور عزتِ نفس کا مادہ پیدا ہو اور گھر کی عورتوں کے حسنِ سلیقہ کی وجہ سے اپنے گھر میں اپنی حیثیت کے مطابق اس کی ضرورت کا سامان اس کو اتنا مل جائے کہ وہ پیٹ بھرنے کے لیے چوری اور لوٹ کھسوٹ کے لیے مضطر نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے معاشرہ کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے ہمارے سامنے ہماری قوم کے غریب گھرانے ہیں اور بالخصوص عورتیں ہیں جن کے گھروں کی بربادی کی وجہ سے مرد جرائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اگر اس طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو ہمارے ملک کے تقریباً نصف افراد جو جرائم کے خوگر ہو چکے ہیں ممکن ہے گھریلو اصلاح کی وجہ سے جرائم سے باز آجائیں اور بڑی حد تک چھوٹے چھوٹے جرائم کا خود بخود انسداد ہو جائے۔

اب اگر متوسط طبقہ پر نظر ڈالیے تو ان کی حالت غریبوں سے بڑھ کر ناگفتہ بہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عورتیں ہی نہیں بلکہ مرد بھی اپنے گھروں کا وہ معیاری نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں جو اعلیٰ طبقہ کا معیار ہے قلیل آمدنی خواہ تنخواہ کے ذریعہ ہو، خواہ تجارت کے ذریعہ، ان کی اس حرص کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ان کی بیوی ان کے بچے اپنے تن ڈھانکنے کیلیے جو کپڑا بمشکل خریدتے ہیں چاہتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ کی وضع قطع پر اس کو تیار کرائیں اسلیے اس پر دوگنے مصارف پڑ جاتے ہیں اندازہ کیجیے کہ جہاں کپڑا خریدنے کی گنجائش ہی مشکل سے ہو، وہاں مہنگی سلائی کہاں سے ادا کی جائے۔ اب رہا غذا کا مسئلہ تو وہ بھی اعلیٰ طبقہ کے معیار کے مطابق، اسی طرح برتن اور گھر کے دوسرے آرائشی سامان کہاں سے مہیا ہوں؟ اس کے بعد چونکہ ان کے ذہنوں میں کچھ نہ کچھ شعور ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کو اسکولوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی فیس ادا کرنے اور ان کے لباس وغیرہ کے مصارف کا بار مزید براں ان کے کاندھوں پر آ پڑتا ہے۔ ادھر لڑکیاں اپنی کم سنی کے باعث گھر سے باہر نکل کر جو سماں دیکھتی ہیں اور گھر کے محدود دائرہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں پاتیں تو گھٹ گھٹ کر رہ جاتی ہیں اور یہ غریب مسکین اگر بمشکل میٹرک یا ایف۔ اے تک پہنچ بھی جائیں تو اس قابل بھی نہیں رہتیں کہ اپنے بچوں کی تربیت کر سکیں۔ اپنی چھوٹی موٹی چیزوں کو مرتب کر سکیں۔

اگر وہ کم از کم فرسٹ ایڈ (First Aid) کی تعلیم حاصل کر لیتیں، کٹنگ اور ٹیلرنگ سیکھ لیتیں تو خود اپنے اور اپنے بچوں کے لباس کو اعلیٰ طبقہ کے برابر نہیں تو انکے قریب قریب بنانے کے قابل ہو جائیں۔ میرے ناقص اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کی خواتین کو ہومیوپیتھک ڈاکٹری کی تعلیم دی جانی ضروری ہے تاکہ اپنے گھر کے بچوں کا معمولی علاج وہ خود کر لیں اور معمولی معمولی بیماریوں میں ڈاکٹروں کی بڑی بڑی فیسیں اور گراں ادویات کی قیمتوں کا بار اٹھانے سے بچ جائیں۔

اسی طرح تقریباً تین سو انگریزی کے الفاظ ان کو سکھلا دیے جائیں جو متوسط اور اعلیٰ گھرانوں میں غذاؤں، برتنوں، سامانِ آرائش اور بجلی وغیرہ کے متعلق عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں اس کے علاوہ بہت مختصر جغرافیہ جس میں صرف ممالک کے نام، ان کی آبادی، ان کے مشہور دریا، مشہور صنعتوں اور ان کی مختصر خصوصیات کا تذکرہ ہو، اسی طرح مختلف سمندروں کے نام، ان کی خصوصیات مثلاً جو سردی میں منجمد ہو جاتے ہیں یا ہمیشہ منجمد رہتے ہیں اسی طرح مشہور پہاڑوں کے نام اور اسی قسم کی ضروری اور موٹی موٹی باتیں ان کی جغرافیائی تعلیم میں شامل ہونی چاہییں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہر عورت کے گھر میں دنیا کا نقشہ ٹنگا ہوا ہو اور وہ اس کو دیکھ کر بآسانی ممالک کے نام، ان کے محلِ وقوع اور اسی طرح ان میں دریاؤں، ریلوں اور ان کے اطراف میں سمندروں کے ناموں کو دریافت کر سکے، اس کے بعد یہ بھی از بس ضروری ہے کہ ان کو مشہور شاہانِ اسلام کے واقعات سنہ وار اور ان کی خصوصیات کے ساتھ پڑھائی جائیں اور اردو کی تعلیم اونچی سے اونچی دی جائے کیونکہ اس زبان میں مذہب کے ہر ہر شعبہ کے متعلق مکمل تراجم موجود ہیں تاکہ جس عورت کا دل چاہے وہ تاریخ اسلام کا واقعہ اپنی زبان میں بآسانی خود بیان کر سکے اور اگر اس آخری دور میں کوئی خوش نصیب ایسی ہو کہ اسے اپنے مذہب کے مطالعہ کی توفیق نصیب ہو جائے تو وہ احادیث و قرآن اور اپنی زندگی کے ضروری مسائل خود ہی مطالعہ کر کے آخرت میں اپنی سرفرازی کے سامان مہیا کرے۔

اب رہ گیا اعلیٰ طبقہ تو ان کے دماغ اتنے بلند ہو چکے ہیں کہ ان کے متعلق مجھ جیسے عاجز کا کچھ لکھنا سودمند نہیں ہو سکتا عنقریب آپ دیکھیں گے کہ زمانہ کے انقلابات ان کو خود بخود سیدھا کر دیں گے اور اس کے بعد وہ حسرت کریں گے کاش وہ اپنی اصلاح خود اپنے ہاتھوں پہلے کر لیتے کتنی بھی ڈگریاں حاصل کر لی جائیں مگر عورتوں کے امبیسیڈر (Ambassador) بننے میں کچھ مخفی راز بھی ہوتے ہیں ہاں سکول کی ماسٹرنیاں بننا اگر کچھ فخر ہو تو سفارشوں کے بعد اس کے امکانات قوی ہیں، وزارت اور افسری کے لیے بھی

صرف لیاقت کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بھی کچھ رموز درکار ہیں، یہ اعلیٰ طبقہ ہماری قوم میں بہت تھوڑا ہے مگر بدقسمتی سے اس کے متعدی اثرات نے ہمارے قومی معاشرہ کو بالکل تباہ کر رکھا ہے میں ان کے متعلق زبان ہلانا نہیں چاہتا صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب قدرت نے ان کو عزت و مال دونوں سے نواز دیا تو وہ اپنا معیار زندگی متوسط بنالیں تو ان کی شان میں تو کوئی فرق نہ پڑے گا لیکن ہمارے غریب اور متوسط طبقہ کے لیے ترقی کا میدان بہت وسیع ہو جائے گا یعنی اپنے دائرۂ وسعت سے نکل کر ان میں جو بیجا ہوس پیدا ہو چکی ہے وہ ان میں باقی نہ رہے گی۔

یہ ان کا اختیار ہے کہ اگر وہ ترقی اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی معصوم لڑکیوں کو امریکہ اور لندن بھیج کر اجنبی ملک اور غیر اسلامی طریقوں کا عادی بنائیں اور ان کے عواقب اور انجام کی کوئی پروا نہ کریں تو اس کی ذمہ داری ان ہی کے سر ہو گی لیکن یہ ہوس اپنے دل سے نکال دیں کہ اگر عورتیں کثیر تعداد میں بیرونی ڈگریاں حاصل کر کر کے اپنے ملک میں واپس آجائیں تو وہ ملک کی ترقی کا باعث بن سکیں گی ہاں یہ ممکن ہے کہ بہت سی ان میں سے دوسرے ممالک میں ہی آباد ہو جائیں اور جو واپس آئیں وہ اپنے ملک کی محبت کی بجائے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی محبت لے کر واپس آئیں پھر وہ اپنے ملک کی ترقی کا باعث بھلا کیا بن سکتی ہیں؟

تعلیمی لحاظ سے ابھی ہمارے پس ماندہ ممالک میں بھی تعلیم یافتہ مردوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان ہی کو ملازمت ملنی مشکل ہو رہی ہے تو اگر اپنے گھروں کی فارن کرنسی (Foreign Currency) برباد کر کے عورتیں اپنے ملک کا مفاد پیدا کرنا چاہیں بھی تو اوسطاً اس فائدہ سے اس کا نقصان کہیں زیادہ رہے گا اس لیے یہ ضروری ہے کہ خاص کر عورتوں کی تعلیم میں تینوں طبقات کی رعایت رکھی جائے اور ہر طبقہ کی تعلیم کا معیار اس کے لحاظ سے ہو پھر آہستہ آہستہ ادنیٰ طبقہ متوسط میں اور متوسط اعلیٰ میں ترقی کر

کرکے داخل ہوتا رہے حتیٰ کہ کچھ سالوں کے بعد تمام ملک حسنِ معاشرت، حسنِ معیشت حسنِ اخلاق اور حسن کردار کے لحاظ سے اپنے اپنے صحیح لیول (level) پر نظر آئے، لیکن یہ آسان بات نہیں۔ حکام کی دلسوزی، مکمل ہمدردی، بڑے ایثار اور انتہائی جدوجہد اور بے حد دلچسپی کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ اگر نفسی نفسی کا یہی بازار گرم رہا تو ہماری قوم کا نقشہ بہت جلد بدل کر تاریخ میں ایک عبرت ناک انقلاب حوادث کی شکل میں باقی رہ جائے گا اور اس انقلاب کی ابتدا اور بنیاد ہمارے گھروں کی عورتیں ہی ہوں گی اگر آج آپ کو اس کا یقین نہیں آتا تو کل تجربہ آپ کو بتلا دے گا کہ حقیقت اس سے کہیں دور نہ تھی۔

اس جگہ بے موقع نہ ہوگا اگر میں چند سطور اپنی قوم کے لڑکوں کے لیے بھی لکھ دوں۔ یہ بہت عظیم غلطی ہے کہ لڑکوں کے دماغوں کا جائزہ لیے بغیر ان کے والدین صرف اپنی رائے کے مطابق ان کو تعلیم دلائے چلے جاتے ہیں سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اس کے لیے مستقل ایک کمیٹی حکومت کی طرف سے قائم ہو جو ایف۔ اے تعلیم کے بعد بچوں کے دماغوں کا جائزہ لے کہ ان کے طبعی رجحانات اور دماغی صلاحیتیں کس طرف مائل ہیں، جن کے دماغ ڈاکٹری، انجینیرنگ یا اقتصادیات، صنعتی معلومات یا اگریکلچر (Agriculture) غرض جدید تقاضوں کے جس شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں اسی لائن پر ان کو چلایا جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو بہت سے وہ دماغ جو اپنی دماغی خاص خاص صلاحیتوں کی وجہ سے خاص خاص لائنوں میں نمایاں ترقی کرسکتے تھے وہ اس کے خلاف چلنے کی وجہ سے بہت پیچھے بلکہ بیکار ہوکر رہ جائیں گے۔

ڈرتے ڈرتے یہ لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ اگر کسی ہونہار بچے کے دل میں یہ تمنا ہو اور اس کے دماغ میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ علمِ نبوت کی تعلیم حاصل کرے تو حکومت کا جب تک کہ وہ اسلام کی طرف نسبت رکھتی ہے یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ ایسے

چیدہ چیدہ افراد کی اعلیٰ تعلیم کا بھی بند و بست کرے جو اسلام کی طرف اس کی نسبت کے شایانِ شان ہو کہ وہ نیچے صرف ماڈرن ٹائپ (Modern Type) کے مولوی بن کر نہ رہ جائیں۔

مرد اور عورتوں کے لیے تعلیمی درسگاہوں میں اسلامی تربیت کا لحاظ اور اسلامی معاشرت کی فوقیت کا اہتمام اگر نہ کیا گیا تو یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان قوم دنیا میں کتنی بھی ترقی کر جائے لیکن وہ بحیثیت مسلمان ہونے کے نہیں ہوگی بلکہ بحیثیت ایک انسان ہونے کے ہوگی اور یہ ترقی بالفرض اگر حاصل بھی ہو جائے تو گو معاد (آخرت) سے غافل دماغوں کے لیے کچھ دنوں کے لیے سبز باغ نظر آئیں لیکن معاد یعنی آخرت کی دائمی زندگی کے لیے انتہائی مہلک اور لاعلاج ہو کر رہے گی۔

یہ جو کچھ آپ سے کہا گیا اس کی حیثیت صرف ایک الف لیلہ کی سی ہے جو آپ نے سُن لی لیکن آپ اگر درحقیقت دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے اپنی اسلامی معاشرت کو زندہ کرنا ہوگا جس کے لیے سب سے اہم درسگاہیں خود آپ کے گھر ہیں۔ اگر ہم اپنے گھر یعنی اپنی عورتوں کو جو درحقیقت ہماری اسلامی معاشرت کی بنیادیں قائم کرنے والی ہیں ایسی تعلیم و تربیت دیں کہ وہ قوم کے آئندہ نونہالوں کو ٹھوس طریقہ پر اسلامی معاشرت کے سانچے میں ڈھال کر اس طرح باہر نکالیں کہ پھر دنیا کی کوئی دوسری معاشرت ان پر اثر انداز نہ ہو سکے جیسا کہ مشترکہ ہند میں کبھی ہندوؤں نے گردکل کے نام سے بنارس یونیورسٹی قائم کی تھی۔ اس کے طلباء کی تعلیمی استعداد اور رہائش کی سادگی اور مذہبی عقائد کی پختگی یا تعصب کا حال مشہور رہا ہے اور سب تعلیم یافتہ طبقہ کو خوب معلوم ہے۔

اس کے بالمقابل میں یہاں علماء کا نام نہیں لینا چاہتا کہ ان سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے مصلحین کا ذکر کرتا ہوں اور سب سے پہلے سر سیّد

جو بانی علی گڑھ کالج تھے اور جن کا فوٹو آج تک لوگوں کے گھروں میں بڑی عزت کے ساتھ موجود ہے ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں میں ان کی زندگی پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے علی گڑھ کے طلباء کے لیے ایک ایسا یونیفورم (Uniform) بھی مقرر کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان بھر میں ہر فرقہ سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتے تھے اور وہ خود بھی اس لباس کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ لباس سیاہ شیروانی سفید پائجامہ، سیاہ پمپ اور ٹرکش کیپ تھا انہوں نے کالج میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی تھی اور طلباء پر جماعت کی پابندی بھی لازم قرار دی تھی اور جو نماز نہ پڑھے اس پر جرمانہ بھی مقرر کیا تھا اگرچہ وہ جرمانہ ایسا تھا کہ جو طلباء نماز میں شریک نہ ہونا چاہتے وہ اپنی فیس کے ساتھ ایک ماہ کی نمازوں کا جرمانہ بھی جمع کر دیتے تھے اور وہ قابل قبول سمجھ لیا جاتا تھا۔

اکبر الٰہ آبادی جو بڑے فاضل ججوں میں گذرے ہیں ان کے خیالات کا اندازہ ان کے اشعار سے ہو سکتا ہے نمونہ کے طور پر ایک شعر ہی دیکھ لیجیے۔ ؎

یہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ۔۔۔ تو پھر اسکی کیا خوشی ہو کوئی جنٹ کوئی جج ہے

اسی طرح علامہ اقبال مرحوم جن کے دماغ میں سب سے پہلے پاکستان کا تخیل گذرا تھا جس پر درد انداز میں اپنے قومی تنزل اور دوسری اقوام کی نقالی کا شکوہ کر گئے ہیں وہ آج کسی پر مخفی نہیں ہے۔

یہ تینوں شخصیتیں وہ ہیں جو نہ خود محتاج تعارف اور نہ ان کے خیالات محتاج تعارف لیکن اگر صحیح معنی میں ہم وہی اسلامی زندگی چاہتے ہیں جو علامہ اقبال مرحوم کی تمنا تھی جسکا مرثیہ وہ ان الفاظ میں پڑھ گئے ہیں ؎

فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی ۔۔۔ رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے ۔۔۔ یعنی وہ صاحب اوصافِ حجازی نہ رہے

غرض یہ داستان بہت طویل ہے مجھ کو تو یہ بتانا ہے کہ اگر اسلامی زندگی کا صحیح نقشہ کوئی حقیقت رکھتا ہے اور ہم اپنے آپ کو دل سے اس سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تو اس کیلیے کیا ہمارے موجودہ سکول اور کالج کافی ہیں یا ہم کو ان درس گاہوں میں آنے سے پہلے جب ہماری نرم فطرت میں اتنی لچک تھی کہ ہم جس سانچہ میں ڈھالنا چاہیں طبیعت اور عادت کے درجہ میں ڈھال سکتے ہیں) اس کے لیے وہی زمانہ اور اپنے گھر کا اسکول درکار ہے یہ سوچنا چاہیے کہ کسی خاص جانور کے گوشت سے ایک ہندو کو نفرت یا ایک مسلمان کو نفرت ہے تو کیا یہ کسی تعلیم کا نتیجہ ہے یا ان تاثرات کا جو وہ اپنے گھر سے لیکر باہر آیا ہے اسی طرح اگر آج کسی قوم کو پتے پر کھانا رکھ کر یا چوکا لگا کر کھانے میں عزت محسوس ہوتی ہے تو یہ کسی تعلیم کا ثمرہ ہے یا اس کے گھر کی تربیت کا، اسی پر زندگی کے تمام گوشوں کو قیاس کرتے جائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جتنے گہرے نقوش انسانی فطرت پر اس کے دورِ طفولیت میں قائم ہو سکتے ہیں وہ بعد میں ہرگز نہیں ہو سکتے اور نہ کسی تعلیم سے اور نہ کسی تربیت سے اگر یہ صحیح ہے تو آپ کو یہ فیصلہ کر لینا ضروری ہے کہ ہم کو اپنے گھروں کی زندگی میں اپنی عورتوں کو کس قسم کے کورس کے تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔

بنیادی لحاظ سے مسلمانوں کی کتاب قرآن پاک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسکی تعلیم صرف اسی طرح کافی ہو سکتی ہے جس طرح کہ مسلمانوں کے بچے مشن اسکول میں انجیل پڑھ لیتے ہیں یا اس کے ساتھ وہ والہانہ عقیدت اور شیفتگی پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کا ہاتھ لگانا بلا وضو کے ممکن نہ ہو اور اس کی تلاوت کیے بغیر ہمارے دل کو چین نصیب نہ ہو۔ ہم صرف نماز اور روزہ نہیں بلکہ اپنی نشست و برخاست اور زندگی کے گوشہ گوشہ میں اسلامی معاشرت کے سانچے میں ایسے ڈھل جائیں کہ ہماری نظریں اسکے خلاف ہر معاشرت کو بہت پست تصور کرنے پر ایسے ہی مجبور ہو جائیں جیسا کہ بدقسمتی سے

آج ہم اپنی اصلی معاشرت کو پست تصور کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں اس لیے یہاں صرف قرآن کے الفاظ رٹا دینا کافی نہیں ہوگا بلکہ اس کے ساتھ ایک ایسا نصاب بھی بنانا ہوگا جس میں کہ اردو زبان میں اسلامی عقائد و اعمال، عبادات و معاملات، طعام و لباس اور وضع قطع حتیٰ کہ زندگی کے ایک ایک گوشہ کی تفصیلات موجود ہوں۔

اس میں ہمارے خلفاءِ راشدین اور دیگر اکابر اور گذشتہ سلاطین کی صحیح تاریخ بھی شامل ہو، مقدس بیبیوں کی اسلامی جانبازی اور پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی کے واقعات اس مؤثر انداز میں پڑھائے جائیں کہ ہم کو بجا طور پر اپنی تاریخ کے دہرانے پر فخر محسوس ہونے لگے یہ بات ہمارے دماغوں میں گذرنے بھی نہ پائے کہ ہم دنیا میں کسی دور میں بھی حاکم نہ تھے بلکہ یہ جذبہ پیدا ہو کہ جو آج حاکم نظر آتے ہیں یہ مدتوں ہمارے محکوم رہ چکے ہیں اس لیے پھر ہم کو اپنی گدی سنبھالنی ہے اور نفوسِ انسانی کی نگہبان اور اقوام دنیا کی پرورش اس طرح کر کے دکھا دینی ہے جو آج دنیا میں کسی قوم کو نصیب نہیں۔

دنیا میں ترقی یافتہ قومیں آج جو کچھ کر رہی ہیں وہ صرف اپنے اغراض اور اپنے جینے کی خاطر کر رہی ہیں لیکن مسلمان کی زندگی اس سے کہیں بالاتر ہے وہ اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتا وہ خدا کا خلیفہ ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی خلافت کا حق ادا کرے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ خدا کی تمام مخلوقات پر اس کا خلیفہ بن کر سب کو راحت کی زندگی میں دیکھنا اس کا منتہائے نظر ہو۔ یہاں یہ تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ جو چیز ہمارے گھروں میں اس وقت مفقود ہو چکی ہے اور پھر ہم کو پیدا کرنی ہے وہ اسلامی تربیت ہے یہ خوب یاد رکھ لینا چاہیے کہ تعلیم خواہ کچھ بھی ہو یعنی انگریزی ہو یا عربی لیکن اگر تربیت اسلامی نہیں تو اس کا کوئی مفید ثمرہ نہیں نکل سکتا اور اگر تربیت اسلامی ہو بشرطیکہ وہ پختہ ہو تو پھر تعلیم خواہ کسی قسم کی ہو وہ مضرت رساں نہیں ہو سکتی اگر اس نکتہ کو معمولی سمجھا گیا یا قدیم خیالات کی ترجمانی سمجھ کر ٹال دیا گیا تو یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ

جانتا ہوں کہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے اس زمانہ میں جبکہ ہماری عورتیں اونچی ایڑیوں کے جوتے، کھلی پنڈلیوں کے لباس، کٹے ہوئے بال اور عریاں لباس کی عاشق ہوں تو پھر اس بھڑکی ہوئی آگ میں میرے یہ چند فقرے کیا کارآمد ہو سکتے ہیں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ دین تو برباد کر دیا اب دنیا تو برباد مت کرو۔ قبر کا یقین تم کو نہیں، حشر کا تم کو نہیں، فرشتوں کا یقین تم کو نہیں، جنت اور دوزخ کا یقین تم کو نہیں، پھر حساب و کتاب کا تم کو غم ہو تو کیا ہو۔ اگر ایسا اسلام لے کر اپنے خدا کے سامنے آنے پر خود راضی ہو تو میرے آنسو بہانے سے تمہارا دل کب پسیج سکتا ہے صرف اسلامی ہمدردی ان کلمات کو لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

من قاش فروش دل صد پارہ خویشتم

دعا کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں خدا تعالیٰ توفیق دے کہ اس میں غفلت نہ ہو، اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور اصلاح کے لیے اس کی بارگاہِ بے نیاز میں ہمیشہ ہاتھ اٹھتے رہیں۔

عورتوں کی جنگی خدمات عہد نبوت میں

(۴۴) عَنْ اَنَسٍ رضؓ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَغْزُوْ بِاُمِّ سُلَیْمٍ وَّنِسْوَۃٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ مَعَہٗ اِذَا غَزَا یَسْقِیْنَ الْمَآءَ وَیُدَاوِیْنَ الْجَرْحٰی۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص ۳۴۲)

ترجمہ:۔ انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غزوہ کے لیے تشریف لے جاتے تو اپنے ہمراہ ام سلیم اور انصار کی کچھ عورتوں کو بھی لیجاتے اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ زخمیوں کو پانی پلائیں اور ان کی مرہم پٹی کریں۔

(۴۵) عَنْ اُمِّ عَطِیَّۃَ قَالَتْ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ اَخْلُفُھُمْ فِیْ رِحَالِھِمْ فَاَصْنَعُ لَھُمُ الطَّعَامَ وَاُدَاوِی الْجَرْحٰی وَاَقُوْمُ عَلَی الْمَرْضٰی (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص ۳۴۲)

ترجمہ:۔ ام عطیہ فرماتی ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی میں سات غزوات میں شرکت کا فخر حاصل ہوا ہے، مرد تو جنگ کے لیے جاتے اور میں اپنے خیمہ میں رہا کرتی اور ان کے لیے کھانا تیار کرتی۔ مریضوں کی مرہم پٹی کرتی اور انکی تیمارداری کے فرائض انجام دیا کرتی تھی۔

شرح:۔ احادیث مذکورہ کی تشریح سمجھنے سے پہلے تین باتوں پر غور کرلینا ضروری ہے پہلی بات یہ کہ عرب کی یہ قدیم عادت تھی کہ وہ بڑے بڑے معرکوں میں عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے اور زمانہ کفر میں عورتوں کی شرکت کا بڑا مقصد یہ ہوتا

کہ وہ مردوں کو جنگ میں اور تیز کرنے کے لیے ایک ماں اپنے بیٹے کو اور ایک بی بی اپنے شوہر کو یہ عار دلایا کرتی تھیں کہ خبردار جو تم نے دشمن سے منہ پھیرا یا اپنی پیٹھ پر کوئی زخم کھایا، اس دور کے عرب لوں بھی مردانگی کے جوہر رکھتے تھے مگر اگر کوئی نازک موقع پیش آجاتا تو اس عار سے خائف ہو کر جہاں تک ممکن ہوتا میدانِ جنگ سے ذرا پہلے قدم اٹھانے میں اپنی بڑی ذلت تصور کرتے۔ اب اس ماحول کو سامنے رکھیے۔ دوسری بات یہ سنیے کہ ابتدائی اسلامی دور کا نقشہ کیا تھا۔ یعنی مجاہدین ایک طرف اتنی قلت میں تھے کہ مٹھی بھر مسلمانوں کو ہزاروں کفار کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا تھا اس لیے جب کبھی کوئی معرکہ پیش آتا تو بچہ بچہ میدانِ جنگ میں نکلنے کے لیے تڑپنے لگتا ہے اور جب اس طرح چن چن کر ایک ایک کرکے اسلام کے شیر میدانِ جنگ میں نکل پڑیں تو مذکورۂ بالا ضروریات کو پورا کرنا عورتوں ہی کا فریضہ رہ جاتا تھا۔

تیسری بات یہ کہ جب آپ اس ماحول اور اس وقت کی ضرورت کا لحاظ کرکے اس پر غور کریں گے کہ ان عورتوں کی خدمات اس وقت بھی کیا تھیں کیا ان کی کوئی باضابطہ فوج ہوا کرتی تھی، کیا وہ باضابطہ مردوں کی طرح جہاد کی مامور تھیں یا جنگ میں بھی جو خدمات ان کے سپرد تھیں یہ وہی گھریلو خدمات تھیں جو وہ حالتِ امن میں بھی اپنے گھروں میں بیٹھ کر انجام دیا کرتی تھیں پھر یہ کس قدر ظلم اور غیر منصفانہ نظر ہے کہ ایک طرف ان عورتوں کی یہ خدمات تو بڑی بلند آہنگی سے بیان کی جائیں، مگر دوسری طرف ایک نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھا جائے کہ اگر یہ عورتیں ایک بار ان خدمات کے لیے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں تو یہی عورتیں پانچ وقت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کا شرف حاصل کرنے کے لیے مسجد نبوی کی طرف نکلا کرتی تھیں، اگر اس کی بھی کچھ اہمیت محسوس کی جاتی تو دل کو صبر آجاتا۔ لیکن اس ناانصافی پر کس طرح صبر کیا جا سکتا ہے کہ طرح طرح کے خوشنما عنوانات سے عورتوں کو مجاہد بنانے کی توسعی کی جائے جب کہ

بحمد للہ آج مسلمان مردوں کی تعداد اتنی کافی موجود ہے کہ عورتوں کی خدمات کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں اور نہ اب ہمارا ماحول وہ پہلا ماحول ہے لیکن ان کو نماز کی پابند بنانے کی طرف ذرا توجہ نہ کی جائے بلکہ جو عورت نماز پڑھے اس کو دقیانوسی سمجھ کر ایسا نظر انداز کر دیا جائے کہ اس غریب کو اپنا جوڑ املنا بھی ناممکن ہو جائے، اب رہا یہ مسئلہ کہ اس زمانہ میں عورتوں کو مساجد میں بھی آنا چاہیے یا نہیں تو اس رسالہ میں یہ موضوع ہمارا نہیں اور نہ پردہ ہمارا موضوع ہے اس پر دوسرے رسائل کافی روشنی ڈال چکے ہیں لیکن اگر ضمنی طور پر اتنا سا کلمہ لکھتا چلوں تو زیادہ بے موقعہ بھی نہ ہوگا کہ بے پردگی اور بے حجابی میں عرفاً کچھ فرق ہے، جو لوگ بے پردگی کے حامی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ بے پردگی کے ساتھ عریانی اور بے حجابی کی بھی ضرورت ہے۔ اگر یہ ہے تو پھر معاف کیجیے کہ بے غیرتی اور بے حجابی میں کچھ فرق بتانا یہ آپ کا کام ہوگا۔

قرآنی آیت پر بحث کرنے والے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتوں کے پردوں کی نوعیت پر غور کیے بغیر اس سے استدلال کرنے والے خود یہ انصاف سے بتا دیں کہ جس پردہ کی آڑ میں وہ بے پردگی پھیلا رہے ہیں کیا عہد نبوت میں وہ یہی پردہ تھا۔ کیا وہ انہی لباسوں کے ساتھ تھا کیا وہ اسی ماحول میں تھا۔ کیا وہ انہی مقاصد کے لیے تھا۔ اگر ان سب کا جواب نفی میں ہو تو پھر بے حجابی اور بے پردگی کو اگر اختیار کرنا ہی ہے تو خدارا اس کو شریعت کے سر تو نہ رکھیے اور اسلام کیطرف تو نسبت نہ کیجیے۔

اسلامی معاشرت میں ایک اجنبی صنف کا دوسری اجنبی صنف کو ہاتھ لگانا بھی معیوب ہے اگرچہ کفر کی معاشرت میں اس کو کتنی ہی اعلیٰ تہذیب سمجھا جائے

(۴۶) عَنْ عَائِشَةَ رض قَالَتْ فِیْ بَیْعَةِ النِّسَاءِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَمْتَحِنُهُنَّ بِهٰذِهِ الْاٰیَةِ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ یُبَایِعْنَكَ فَمَنْ اَقَرَّتْ بِهٰذَا الشَّرْطِ مِنْهُنَّ قَالَ لَهَا قَدْ بَایَعْتُكِ کَلَامًا یُکَلِّمُهَا بِهٖ وَاللّٰهِ مَا مَسَّتْ یَدُهٗ یَدَ امْرَاَةٍ قَطُّ فِی الْمُبَایَعَةِ . (متفق علیہ ۔ مشکوٰۃ ص ۳۵۴)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ عورتوں کو بیعت کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی پختگی کا امتحان کرنے کے لیے ان ہی باتوں پر عہد لیتے تھے جن کی وہ زمانۂ جاہلیت میں عادی تھیں اور اس آیت میں ان باتوں سے منع کیا گیا تھا۔ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ الخ اے نبی جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو (پارہ ۲۸ رکوع ۸) تو ان میں سے جو عورت ان شرطوں کی پابندی کرنے کا اقرار کرتی تو اس سے آپ فرما دیتے کہ میں نے تجھ کو بیعت کر لیا لیکن یہ عہد و معاہدہ صرف زبانی گفتگو کے ساتھ ہوتا تھا خدا کی قسم آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے ذرا لگایا ہو (حالانکہ مردوں کو بیعت کرنیکے وقت ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت کرنے کا آپ کا عام دستور تھا)

شرح:۔ موجودہ تحقیق کے مطابق انسان کے جسم میں بجلی کی طاقت موجود ہے اور جب دو آدمی مصافحہ کرتے ہیں تو اس بجلی کے ذریعہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اتصال پیدا

ہو جاتا ہے اور شاید آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیعت کے وقت مردوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا کچھ اس لیے بھی ہو کہ اس اتصال سے بارگاہِ نبوت کے باطنی خصائلِ حمیدہ بیعت کرنے والے میں منتقل ہو جائیں ورنہ کیا یہ شرف ہی کچھ کم ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ آپ کے دستِ مبارک کے ساتھ لگ جائیں۔ اب اندازہ فرمایئے کہ عقدِ بیعت کی اہمیت اور آپ کے دستِ مبارک کے عظیم شرف کے باوجود آپ نے عورتوں کو صرف کلام کے ذریعہ بیعت کرنا پسند فرمایا اور یہ گوارا نہ کیا کہ آپ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح بیعت فرمالیں۔

حضرت عائشہؓ نے آپ کے اس فعل کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس کو خدا کی قسم کھا کر بیان فرمایا ہے۔ یہ تو اسلام کی پاکیزگی اور نزاہت ہے اب ہماری موجودہ معاشرت کی طرف نظر کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انگریز کی غلامی کے نتیجہ میں غیر عورت سے مصافحہ کرنا ہماری تہذیب کا ایسا جز ہے کہ اس کا ترک کرنا گویا ایک بہت بڑی بدتہذیبی ہے اس قسم کی وہ جزئیات ہیں جن کا نام اس زمانہ میں تاخر اور قدامت پسندی رکھدیا گیا ہے اور اگر اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے تو اس کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا یہ تاخر کی ایک دعوت دی جارہی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ ایسی بہت سی چیزیں جو بالکل غیر ضروری ہیں صرف انگریزی تہذیب کی اتباع میں اس طرح داخل ہو چکی ہیں کہ ان کے ترک کرنے سے فوراً انگشت نمائی ہونے لگتی ہے

یہاں اس شرعی مسئلہ کا تذکرہ کرنا بھی منظور نہیں ہے کہ کسی مرد کا کسی عورت کے عضو کو ہاتھ لگانا جائز ہے یا ناجائز ہے کیونکہ یہ ایک مستقل بحث ہے کہ ایک لڑکے کے لیے بھی اپنی والدہ کے کن کن اعضاء کو چھونا اور دیکھنا جائز ہے اور کن کن کو ناجائز، یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جب کوئی معاشرہ اصولی طور پر فاسد ہو جاتا ہے تو پھر عقول کو اس کے حدود سے نکلنے میں بے وجہ ضیق اور تنگی محسوس ہونے لگتی ہے اور

یہ ضیق صرف عادت پر مبنی ہوتی ہے کسی فلسفہ پر نہیں جو لوگ مسئلہ چھوت کے قائل ہیں ان میں سے بعض روشن دماغوں سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اس مسئلہ کو ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ مسلمان ایک گوشت خور قوم ہے یہی چھوت ایک ایسی حد ہے کہ اگر ہم اس کو اٹھا دیں تو پھر حیوان کے خصائل ہیں وہ ہم میں سرایت کرنے لگیں گے اس لیے ان کے تحفظ کا ایک راستہ یہی ہے کہ ان کے ہاتھ سے لگی ہوئی چیزیں کسی برقی اتصال کی وجہ سے ہمارے تبدیل خصائل کا سبب نہ بنیں۔

انسان بھی عجیب فطرت رکھتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسکی جدوجہد بھی کرتا ہے کہ اپنی علمی قوت سے اس کو معقول ثابت کرے اور اس طرح دلائل کی طاقت بہت سی قبیح اشیاء کو مستحسن بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے اس لیے مذہب ہی ایک ایسی چھنی چھنائی قطعی حقیقت ہے کہ اس کو اختیار کر لینے سے بہت سی غلط راہیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں اور محض خود رائی پر چلنے سے بہت سی غلط راہوں میں بھٹکنا پڑتا ہے آپ اس کو بے وجہ سائنس اور مذہب کے تصادم سے تعبیر کر لیتے ہیں میرے خیال میں ہم بھی بڑی حد تک چھوت کے قائل ہو چکے ہیں اور یہ بہت قدیم تہذیب ہمارے اندر بھی سرایت کر چکی ہے اور اسی وجہ سے کسی کا جھوٹا پانی پینا اور جھوٹا کھانا کھانا حتیٰ کہ کسی کا بستر یا تولیہ استعمال کرنا یہ سب ہماری جدید معاشرت میں ممنوع ہے فرق ہے تو اتنا کہ دوسری قوم کا نظریہ یہاں کچھ اور ہے اور ہمارا نظریہ جراثیم کا خوف ہے۔

بیعت کی حقیقت اسلام میں وہ ہے جو آجکل حلف وفاداری کی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ آج حلفِ وفاداری صرف درزاء کے طبقہ میں محدود ہے اور اسلام میں اس کا دائرہ ہر ہر مسلمان تک وسیع ہے یعنی ہر مسلمان کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کا آخری حد تک وفادار بن کر رہے گا اور تنہائی میں بھی سازشیں تیار کرنا تو

درکنار اس عہد شکنی کا وسوسہ بھی دل میں نہ لائے گا خواہ اس کے لیے اس کو کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں۔

یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے کہ اسلام میں بیعت کب اور کتنے مقاصد کیلیے لی گئی ہے اور اس شرعی رسم کے لیے آں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دست مبارک میں ہاتھ دینا کیوں لازم تھا، اس کو زاہدِ خشک اور مادہ پرست آزاد کیا سمجھ سکتا ہے، شمع کے جلنے اور پروانہ کی جاں نثاری کے راز شمع اور پروانہ کے سوا کوئی اور کیا جانے؟ ہاں اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ آپ کے دستِ مبارک میں ہاتھ دینے سے جو کسی بے علم کو آپ کے ساتھ اتصال نصیب ہو جاتا ہوگا تو اس کے قلب میں اس ظاہری (کنکشن، Connection) تعلق کی وجہ سے نبوت کی بجلی (Electricity) کچھ اس طرح سرایت کر جاتی ہوگی کہ سالہاسال کے کفر کے جراثیم اور ان کے مہلک اثرات آن کی آن میں جل کر خاکستر بن جاتے ہوں گے اگرچہ یہاں روئے انور کا ایمان اور عقیدت کے ساتھ ایک ذرا سا نظارہ بھی کافی تھا لیکن اس کنکشن (Connection) کے بعد نہ معلوم نبوت کے برکات اور انوار ایک ادنی اشخص کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہوں گے شاید کوئی دور آجائے کہ مسلمانوں میں اس راز کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے لیکن راز جو بھی ہو پھر بھی خاص عورتوں کے حق میں سب سے عظیم معصوم اور سب سے برتر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس عظیم عہد کے وقت بھی اپنے دستِ مبارک سے عورتوں کا ہاتھ چھوئیں، اب اگر آپ عورتوں کے ساتھ شیک ہینڈ (Shake Hand) کرنا ترقی اور بابرکت سمجھتے ہیں تو یہ آپ جانیں۔

❊ ❊ ❊

❊ ❊

مسئلہ تعدد ازدواج میں اگر اس کی ذیلی دفعات پر بھی نظر رکھی جائے تو اس سے بڑھکر کوئی اور متوازن قانون نہیں ہو سکتا

(۴۷) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رض عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَھُمَا جَآءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَشِقُّہٗ سَاقِطٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی ص ۲۷۹)

ترجمہ:۔ ابوہریرۃؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان قانونِ شرعی کے مطابق عدل کی دفعات کو پورا پورا ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک پہلو فالج زدہ شخص کی طرح جھکا ہوا ہو گا (گویا دنیا میں ایک بیوی کی طرف میلان کی مخفی تصویر محشر میں اس طرح مجسم ہو کر اہلِ محشر کے سامنے نمایاں ہو گی)

(۴۸) عَنْ عَائِشَۃَ رض اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقْسِمُ بَیْنَ نِسَآئِہٖ فَیَعْدِلُ وَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَآ اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَآ اَمْلِکُ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی۔ مشکوٰۃ ص ۲۷۹)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ آپؐ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ آپ اپنی بیبیوں کے درمیان عدل کے قانونی دفعات کی پوری پوری رعایت رکھنے کے باوجود اپنے رب کے سامنے معذرت کے یہ کلمات فرمایا کرتے کہ الٰہی بیویوں کے درمیان دفعات عدل کو اپنی مقدور بھر جہاں تک میں پورا کر سکتا ہوں وہ تیرے

سامنے ہے اور جو میری مقدور سے باہر ہیں تو ان کا مالک ہے اگر اس میں مجھ سے کچھ تقصیر ہو تو اس کا مواخذہ مجھ سے نہ فرمانا۔

شرح :۔ ہمارے موجودہ زمانہ میں کفر کی معاشرت کے غلبہ نے بہت سے سلجھے ہوئے مسائل میں بے وجہ پیچیدگی پیدا کر دی ہے ان میں سے ایک مسئلہ تعداد ازدواج کا بھی ہے اصولی طور پر میرے لیے یہاں یہ بیان کرنا ضروری تھا کہ جدید شرائع سماویہ کا نزول کن کن اسرار اور حکم پر مبنی ہوتا ہے لیکن اگر اس موضوع کو چھیڑا جاتا ہے تو بات بہت طویل ہو جاتی ہے۔ اس لیے مختصراً یہ لکھا جاتا ہے کہ جو شریعت عالمگیر شریعت ہے اس کی نظر بھی اتنی ہی وسیع ہونی لازم تھی۔ ظاہر ہے کہ طبقاتِ انسانی آب و ہوا اور ملک کے اختلاف سے مختلف قسم کی طاقتوں میں بڑا تفاوت رکھتے ہیں حتیٰ کہ اس اختلاف کی وجہ سے انسانوں کی عمروں میں بھی بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، جو اصحاب انسانی حیات و موت کے اعداد و شمار پر نظر رکھتے ہیں وہ اس سے بخوبی آشنا ہیں، اسی طرح ایک ملک کے اندر بھی ایک ہی طبقہ کے انسانوں میں بہت کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ ایک طبقہ ہے جس کی خوراک بہت کم اور اعضاء کمزور اور اسی ملک میں بلکہ اسی شہر کے بالکل قریب آبادی میں دوسرا طبقہ ایسا نظر آتا ہے جس کی غذا اور جسمانی اعضاء کی جسامت میں اتنا تفاوت نظر آتا ہے گویا وہ دو ملک کے باشندے ہیں۔

ایک جامع شریعت کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان ضروریات کے ساتھ ساتھ وہ انسانوں کے مختلف طبقات کے لیے بھی پوری پوری رعایت رکھے، مگر مصلحتِ قانونی اس کی متقاضی تھی کہ قانونی شکل میں مساوات رکھی جائے تاکہ دماغوں میں بے وجہ سوال و جواب کا الجھاؤ پیدا نہ ہو، البتہ ذیلی دفعات ایسی مقرر کر دی جائیں، کہ جن میں ان تمام اختلافات کی رعایت ملحوظ رہے۔ دراصل اگرچہ یہ قانون ایک طرف وسیع نظر آتا ہے تو دوسری طرف اپنی دفعات کے لحاظ سے اتنا محدود ہے کہ ایک

ذمہ دار شخص کے لیے ان وسعتوں سے فائدہ اٹھانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد آپ اسلام میں تعدد ازدواج کے مسئلہ پر غور فرمائیے تو آپکو معلوم ہوگا کہ اگر ایک طرف اس میں کچھ وسعت رکھی گئی ہے تو وہ طبقاتِ انسانیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ناگزیر تھی، لیکن دوسری طرف اس میں اتنی تنگی کردی گئی ہے کہ اگر ایک ضرورت مند بشرطیکہ وہ خدا کا خوف دل میں رکھتا ہو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو مشکل سے اٹھا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ازدواجی زندگی کے مقرر کردہ اعداد کے بعد بھی اگر کوئی شخص مقرر کردہ حدود سے ناجائز طور پر تجاوز کر جائے تو پھر اس کی سزا پر غور کر لینا بھی ضروری ہے، شریعت نے اس کی سزا سنگساری مقرر کی ہے۔ جب سزا اتنی شدید مقرر کی گئی تو دوسری طرف لازم ٹھیرا کہ اصل قانون کے اندر اتنی لچک رکھی جائے کہ ایک ضرورتمند شخص اس قانون سے فائدہ اٹھا کر اپنے نفس کو اس سزا سے محفوظ رکھ سکے۔

دوسرے آئین میں ایک طرف بہ لحاظ عدد اگرچہ بہت تنگی رکھی گئی ہے، لیکن دوسرے عنوانات سے اتنی توسیع کردی گئی ہے کہ ایک شخص کو آئینی طور پر بھی ایک محدود مدت کے لیے بہت سی عورتوں سے استفادہ کا حق دیا گیا ہے، بعض آئین میں اگر یہ آزادی نہیں ہے تو اس کے ساتھ رضا اور جبر کا فرق قائم رکھا گیا ہے، رضا کو تو جرم کی تعریف میں داخل نہیں کیا گیا البتہ جبر کو جرم کی تعریف میں داخل کیا گیا ہے۔ پھر جو اس کی سزا مقرر کی گئی ہے وہ اتنی خفیف ہے کہ کسی بے عقل اور نافہم انسان کو اپنی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے میں زیادہ پس وپیش کی ضرورت باقی نہیں رہتی جو اپنی خواہشات کو بڑی دور تک آزادی سے پورا کرنے کے مجاز ہوں۔ وہ اس قیدوبند کے اسرار وحِکَم سے کیا آشنا ہوسکتے ہیں، اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے تو یہ مسئلہ بھی خود بخود حل ہوجاتا ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے

اس کی معاشرتی زندگی کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے اس جرم کی سزا شریعت نے سنگساری کیوں مقرر کی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک طرف قانون میں شروع ہی سے وسعت رکھی گئی ہے تو پھر ایسے جرم کا ارتکاب اگر ہوا تو کیوں ہوا، اس لیے اسکو نظر اندازی کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اس وقت میں اسلامی حدود کے متعلق بحث کرنا نہیں چاہتا، اس پر مستقل تصانیف علماء لکھ چکے ہیں۔ یہ تذکرہ ضمناً صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جن حکم اور اسرار کی بنا پر کسی غیر شریفانہ فعل کی سزا اتنی سخت مقرر کر دی جائے تو پھر دوسری طرف اس کو قانون میں کچھ نہ کچھ وسعت دینا عقل اور انصاف کا تقاضا ہونا چاہیئے، شریعت اسلامیہ نے اس مسئلہ کی اتنی اہمیت محسوس کی ہے کہ خود قرآن کریم نے اس کو اپنے الفاظ میں اس انداز میں بیان کیا ہے کہ جس کے بعد آپ خود غور کر لیں کہ اس وسعت سے فائدہ اٹھانا کسی دیندار انسان کے لیے کتنا مشکل ہے۔ اب آیت ذیل کو ملاحظہ فرمائیے:۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے ادھر میں لٹکتی، اور اگر اصلاح کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے) (پارہ ۵ رکوع ۱۶)

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے بارے میں جو وسعت دی گئی ہے وہ اسی شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ جملہ معاملات میں بیویوں کے درمیان مساوات کا برتاؤ قائم رکھا جائے اور نئی اور پرانی کا بھی کوئی فرق نہ کیا جائے اور یہ ایسی ٹیڑھی کھیر ہے کہ تمھاری کوشش کے باوجود اس کا پورا ہونا مشکل ہے بلکہ تاکیدی لفظ میں یوں فرمایا ہے کہ تمھارے بس سے باہر ہے کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ان

نازک تعلقات میں ایک طرف ڈھل کر رہتا ہے اگرچہ وہ شرعی حدود کو قائم بھی رکھتا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی باہمت ایسا نکل بھی آئے تو پھر یہ قانون اتنی نزاکت رکھتا ہے کہ ان دفعات کو پورا کرنے کے بعد بھی اپنے قصور اور لغزش سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اس نازک مرحلہ میں باہم آشتی اور خدا کا خوف دل میں رکھنے کے باوجود ایک مسلمان کی نظر خدا کی رحمت اور مغفرت پر لگی رہنی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ حدیثِ بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیبیوں میں پورا پورا عدل قائم رکھنے کے بعد بھی پروردگارِ عالم کی جناب میں بصد عجز و انکسار یہ عرض کیا کرتے تھے کہ الٰہی! جو میری طاقت ہے وہ میں ادا کر لیتا ہوں لیکن کبھی کبھی کسی کی تمیز اور لیاقت اور فہم و فراست کی بنا پر انسانی قلب غیر اختیاری طور پر اس کی طرف زائد مائل ہو جاتا ہے تو اگر ایسا ہو تو اس غیر اختیاری میلان کا بھی مجھ سے مواخذہ مت فرمانا۔

آیتِ مذکورہ میں لفظ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ میں شوہر کی انسانیت سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ یہ بھی کیا انصاف اور انسانیت ہے کہ ایک عورت کو اپنی قید میں ڈال کر نہ تو اس کے حقوق پورے پورے ادا کرے اور نہ اس کو علیحدہ کر دے کہ وہ اپنی زندگی کے ایام شرعی حدود میں کسی دوسرے کے ساتھ راحت سے بسر کر سکے اب سوچئے کہ نیک لوگ اور طبائعِ آزاد دونوں کی رعایت رکھ کر یہ قانون اور یہ وسعت کتنی قرینِ عقل ہے۔ یہ معلوم ہے کہ دنیا ہمیشہ نیک لوگوں سے آباد نہیں رہے گی اس میں آزاد منش افراد بھی ہوں گے جو حدود شریعت سے تجاوز کیے بغیر نہیں رہ سکتے تو اصل قانون میں اگر بہت تنگی کر دی جائے تو کیا یہ صرف یکطرفہ نظر نہیں ہے اور کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اتنی بڑی سخت سزا کا نفاذ حکومتِ اسلامیہ کو مجبوراً عام طور پر کرنا پڑ جائے۔

اس مسئلہ پر مجھ سے پہلے بہتیرے اہلِ قلم تفصیلی تبصرہ کر چکے ہیں اس لیے میں نے مختصراً چند سطور لکھ دی ہیں۔ اب جو طبائع الٰہی قانون کی پرواہ نہ کریں ان کو انسانی قوانین کی پابندی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی، رہا توالد اور تناسل کا مسئلہ، سو اس کا تعلق تعدد ازدواج کے مسئلہ سے بہت کم ہے، اول تو بلحاظ مردم شماری تعدد ازدواج کے معاملات ہیں کتنے اور پھر یہ معلوم ہے۔ بسا اوقات جس کے مقدر میں اولاد ہوتی ہے ایک عورت سے بھی بہت ہو جاتی ہے اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند شادیوں کے بعد بھی اولاد نہیں ہوتی اس لیے اس کو فیصلہ کُن نہیں سمجھنا چاہیئے [1]

[1] رموزِ قدرت کا بھلا کون احاطہ کر سکتا ہے لیکن جو بات آنکھوں سے سب کو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری عام ضروریات کی خود قدرت متکفل بنی ہوئی ہے بلکہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ انسانی حیات کے لیے جو شے جتنی اہم ہے قدرت نے اس کو اتنا ہی ارزاں اور بے قیمت بنا رکھا ہے۔ مثلاً ایک ہوا ہی کو دیکھ لیجیئے کہ ہمارے لیے وہ کتنی ضروری ہے، پھر وہ کتنی بے قیمت ہے اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسری اشیاء کو قیاس کرتے چلے جائیے۔ عرب کے بے آب و گیاہ ملک میں لاکھوں حاجی آتے ہیں، بعض سالوں میں حجاج کی تعداد دس لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہے اور کم از کم منٰی میں دو لاکھ جانوروں سے کم کبھی ذبح نہیں ہوتے اور یوں بھی چار پانچ ماہ تک گوشت کے مصارف بے اندازہ رہتے ہیں مگر یاد نہیں آتا کہ کبھی جانوروں میں کمی واقع ہوئی ہو یا گوشت کے نرخ میں کوئی زیادتی، دوسری اشیاء کیلیئے تو آپ سائنس کے زور سے کچھ نہ کچھ اسباب تراش ہی لیں گے مگر پانی کے متعلق کیا فرمائیں گے وہ تو نہ روس سے آتا ہے نہ امریکہ سے، پھر جس ملک میں یہ اژدہام ہوتا ہے وہاں نہ کوئی دریا ہے نہ کوئی نہر۔

اس کو بھی جانے دیجیئے تقسیم ہند کے بعد یہ بات بہت قرینِ قیاس ہو سکتی تھی کہ غریب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد دوسری طرف منتقل ہو جانے کے بعد جانوروں کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ شاید ان کے بسنے کے لیے بھی کوئی جگہ باقی نہ رہے گی اور دودھ اور گھی کی تو شاید (بقیہ حاشیہ بر صــ)

اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ایک طرف عاشقانہ تصانیف کی کثرت فحش ناولوں کی اشاعت، عریاں تصاویر اور گندے سینما اور طرح طرح کی نشہ آور چیزوں کی اجازت ہو اور دوسری طرف دین میں یہ اصلاح کی جائے کہ ایک مرد کا تعلق صرف ایک ہی عورت کے ساتھ محدود کر دیا جائے تو ان دو متضاد قوانین کا جمع کرنا کہاں تک قابلِ عمل ہو سکتا ہے ۔ اور اگر ہو بھی سکتا ہے تو کتنے محدود طبقہ کے لیے، اور اگر بالفرض اس کی عمومیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے لیے کتنی مدت درکار ہو گی اور اس مدت میں اسلامی معاشرہ کتنا برباد ہو چکا ہو گا۔ جس پاکیزگی کا دعویٰ کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں اور نظر اور قلب میں کوہِ ہمالیہ کے حائل ہونے کا خیالِ خام جمائے بیٹھے ہیں، میں اس کے متعلق بھی کچھ لکھتا، لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

قومی انحطاط کی انتہا یہ ہے کہ وہ دوسری اقوام کی بدنما معاشرت اختیار کرنے میں اپنا فخر محسوس کرنے لگے

(۴۹) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رضؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ندیاں نہ نکلیں گی مگر واقعہ یہ ہے کہ جب یہ مسلمان مشترکہ ہند میں رہتے تھے تو جانوروں کا احترام کرنے والے مسلمان شکاریوں کی بڑی خوشامد کیا کرتے تھے کہ وہ کسی طرح ان پر بے رحمی کر کے انسانوں پر رحم کھائیں تا کہ ان کی کھیتیاں برباد نہ ہوں ۔ ان حقائق پر نظر کرنے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر انسانوں کی تعداد کتنی بھی ترقی نہ کر جائے لیکن قدرت یقیناً ان کو بھوکا نہیں مرنے دے گی۔ ہم خود ہی مفت میں اس خوف سے مرے جاتے ہیں ۔

حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ قُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ آلْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی قَالَ فَمَنْ (بخاری ص ۱۰۸۸) وعند الترمذی عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَاْتِيَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ كَمَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰی اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰی اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِیْ اُمَّتِیْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ (مشکوٰۃ ص ۳۰)

ترجمہ :۔ ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنے سے پہلی امتوں کے طریقوں کی ہو بہو پوری پوری نقلیں ضرور اتار کر رہو گے، یہاں تک کہ اگر بالفرض ان میں کوئی شخص گوہ جیسے ذلیل جانور کے تنگ سوراخ میں گھسا ہوگا تو تم بھی اس میں ضرور گھس کر رہو گے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا پہلی امتوں سے آپؐ کی مراد یہود اور نصاریٰ ہیں، آپؐ نے فرمایا تو پھر اور کون مراد ہوتے (بخاری شریف)

ترمذی کی روایت میں اس اندھی اور بیہودہ تقلید کی تفصیل عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ صحابی سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ اگر ان امتوں میں سے کوئی ایسا ناہنجار بے حیا گذرا ہوگا جس نے اپنی ماں کے ساتھ برا فعل کیا ہو تو میری امت میں بھی کوئی شخص ایسا ہوگا جو یہ بدتر عمل کرکے رہے گا۔

تشریح :۔ ادیانِ سماویہ میں نسخ ایک مسلّم مسئلہ ہے اگرچہ بے علم طبقہ کتنا ہی اس کا انکار کرتا رہے اور یہ آج بھی مسلّم ہے کہ جب کوئی قانون منسوخ ہو جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ اب وہ قابلِ عمل نہیں رہا۔ اگر اس کے بعد بھی اس پر کوئی عمل کرتا ہے تو یہ اس کی جہالت کا ثبوت ہوتا ہے۔ جب اسلام دنیا میں آیا تو اس نے زمانہ کے ارتقاء کے مطابق بہت سے وہ فروعی قانون منسوخ کر دیئے جو اس کے

دَور میں غیر مفید تھے اور اس نسخ کا مطلب صرف ایک علمی تبدیلی نہ تھا بلکہ عملی ترمیم تھی۔ اب اگر جدید قوانین کے بعد بھی کوئی شخص ان منسوخ شدہ قوانین پر عمل کرتا ہے تو اسکا مطلب دوسرے الفاظ میں یہی نکل سکتا ہے کہ وہ جدید مجوزہ قوانین کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے، اسی لیے اسلام کے ابتدائی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو توریت اور انجیل کے مشغلہ سے شدت کے ساتھ منع فرمایا تھا اور اسی طرح اسلامی قوانین میں جن جن قوانین کی حدود کہیں قدیم قوانین کے ساتھ ملتی جلتی تھیں وہاں بڑی اہمیت کے ساتھ اپنے حدود کے تحفظ کی تاکید فرمائی تھی۔

اور جس طرح ممالک میں اپنے اپنے حدود کے تحفظ کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس سے کہیں زیادہ اسلام میں شرعی حدود کے تحفظ کا مسئلہ اہمیت رکھتا ہے لیکن جن کی نظروں میں اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین کی قدر و قیمت ہے افسوس ہے کہ آج ان کے نزدیک اپنی شریعت اسلام کی وسیع مملکت میں بڑے سے بڑے میدانوں کو بھی چھوڑ دینے کا نام ترقی اور بلند حوصلگی ہے اور اس کے برخلاف ان حدود کے تحفظ کا نام تنگ نظری اور تعصب ہے یا اس کو رجعت پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو رجعت پسندی اور تاخر تو اس کا نام ہونا چاہیئے کہ ہم ان شریعت والوں کی اتباع کریں جو ہم سے سینکڑوں سال پہلے کے ہیں، نہ یہ کہ ہم اس شریعت پر عمل کریں کہ جو ہماری تقدمی شریعت ہے یعنی اسلام۔ لیکن جب قومی ادبار آتا ہے تو وہ سب سے پہلے قوم کے افراد میں ایک عظیم ذہنی انقلاب پیدا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکل کر رہتا ہے کہ وہ اپنی اساس حیات کو خود اپنے ہاتھوں سے اکھیڑنا شروع کر دیتی ہے اور اس کے بعد جو تعمیر اس پر بنائی گئی تھی، وہ خود بخود بڑی آسانی سے گر پڑتی ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ اپنی زندگی

گذارنے کے لیے غیروں کے گھروں کو تکا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے اس انقلاب کی بڑی حسرت کے انداز میں پیشگوئی فرمائی ہے کہ ایک دن وہ ضرور آنا ہے کہ تم اپنا مرکز چھوڑ کر اپنے حریفوں کی دُموں کے پیچھے پیچھے پھرنے لگو گے، کاش کہ یہ تقلید ان کے اوصافِ حمیدہ میں ہوتی تو بھی چلیئے اس کا گلہ نہ تھا مگر حسرت تو یہ ہے کہ یہ ان کے ان عیوب تک سرایت کر گئی ہے جو اسلام کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے لیے بھی بدتر سے بدتر داغ ہیں۔ قوم میں جب یہ انقلاب رونما ہوتا ہے تو اس طرح آہستہ آہستہ رونما ہوتا ہے کہ وہ افراد جن میں اس کا شعور ہوتا ہے وہ کچھ تو لٹتے جاتے ہیں اور جو باقی بچتے ہیں وہ رفتہ رفتہ اس سے متأثر ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس جدید نسل کو یہ احساس ہی باقی نہیں رہتا کہ ہم کل کہاں تھے اور آج کہاں جا پہنچے اور اس کے اسباب بھی ایک سے ایک عجیب پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے خود سنا ہے کہ جو حرام چیز اسلام میں سب سے پہلے حلال کی جائے گی وہ شراب ہو گی۔ اس پر کسی نے آپؐ سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیسے ہوگا حالانکہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت صاف صاف الفاظ میں بیان فرمادی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ اس طرح ہوگا کہ لوگ اس کا نام بدل کر دوسرا نام رکھ لیں گے (اور اس حیلہ سے اس کو حلال بنا کر استعمال کریں گے۔ افسوس ہے کہ اب تو اس حیلہ کی بھی ضرورت باقی نہیں ہے) (مسند دارمی، مشکوٰۃ شریف ص ۴۶۰)

حدیثِ بالا سے معلوم ہوا کہ جب قوم بگڑتی ہے تو اس کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ عیب اس کی نظر میں عیب ہی نہیں رہتا بلکہ ہنر نظر آنے لگتا ہے اور اس کے لیے وہ طرح طرح کے حیلے تراشنے لگتی ہے۔ پھر جب آنکھیں عیب کو

ہنر دیکھنے لگیں تو یہ ایسا مہلک انقلاب ہوتا ہے کہ اس کے سنورنے کی امید بھی منقطع ہوجاتی ہے۔ حیرت ہے کہ آج دنیا نے اتباعِ سنت کا نام اندھی تقلید رکھ لیا ہے۔ والعیاذ باللہ حالانکہ اندھی تقلید یہ ہے کہ جو ہمارے کھلے دشمن ہیں ہم ناپ ناپ کر ایک ایک بالشت ان کے قدم بقدم چلنے میں اپنے لئے فخر محسوس کرنے لگیں اور اپنی اسلامی معاشرت پر قائم رہنے اور دوسروں کی غلط معاشرت سے متنفر رہنے کا نام تعصب رکھا جائے۔

حدیث کی روشنی میں مذموم عصبیت وہ ہے جو حضرت فسیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے والد ماجد سے روایت کرتی ہیں کہ میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ایک شخص اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے تو کیا یہ بھی تعصب میں داخل ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ تعصب یہ ہے کہ اپنی قوم کوئی ظالمانہ قدم اٹھائے تو اس میں بھی قوم ہی کا ساتھ دیا جائے، اور اس کی مدد کی جائے (مسند احمد، مشکوٰۃ شریف ص ۴۱۸)

اس حدیث سے اجمالاً مذموم تعصب کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے، دوسری اقوام کی اتباع طعام و شراب، لباس کی وضع اور قطع میں تو بڑی بات ہے، اسلام نے تو اپنی ملکی صنعت کو دوسری ملکی صنعتوں پر بھی اتنی ترجیح دی ہے کہ اگر اپنی ملکی صنعت سے کام چل سکتا ہے تو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں ایک عربی کمان تھی، آپکی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی کہ جس کے ہاتھ میں حسب اتفاق پارسی ساخت کی کمان تھی۔ آپؐ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے اس کو پھینک دے اور اپنی کمان کی طرف اشارہ فرمایا کہ ہمیشہ تم لوگ ایسی کمان کو استعمال کیا کرو اور ان میں جنگی اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے فرمایا کہ سیدھے سیدھے سخت نیزے جو جنگ میں کارآمد ہوتے ہیں ان کی مشاق جاری رکھو، کیونکہ ان ذرائع سے اللہ تعالیٰ دین کی بلندی میں

تمہاری تائید فرمائے گا اور اپنے ملک میں تم کو اطمینان کے ساتھ بیٹھنا نصیب فرمائے گا
(ابن ماجہ، مشکوٰۃ ص ۳۳۸)

ایک اور حدیث میں ہے جس کو ابو عقبہؓ روایت کرتے ہیں، یہ ابو عقبہ اہلِ فارس کے آزاد کردہ غلام تھے، کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگِ اُحد میں شریک تھا تو میں نے مشرکین میں سے ایک شخص پر تلوار کا وار کیا اور کہا کہ میں ہوں ایک فارسی نوجوان، لے یہ وار میری جانب سے لیتا جا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ واہ یہ کیا بات کہی، یہ کہنا چاہیئے تھا کہ لے مجھ سے لیتا جا اور میں ہوں ایک انصاری نوجوان (ابوداؤد، مشکوٰۃ ص ۴۱۸)

عرب میں نسبت کے بہت سے طریقے تھے، ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جو شخص کسی قبیلہ کا آزاد کردہ غلام ہوتا وہ اپنے آپ کو اس کی طرف نسبت کر دیا کرتا تھا۔ اور اسی نسبت کے لحاظ سے انھوں نے اپنے آپ کو فارسی نوجوان کہا تھا، عُرف اور استعمال کے لحاظ سے اگرچہ یہ نسبت صحیح تھی لیکن اس پر بھی آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ آیا کہ جب یہ انصار میں سے تھے تو پھر انھوں نے اپنی اس اسلامی نسبت کو جنگ کے موقع پر کیوں ترجیح نہ دی۔ میں نے اس موقع پر ان احادیث کو اس لیے پیش کیا ہے کہ آپ یہ محسوس کر سکیں کہ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اسلامی نام و نسبت تک کی رعایت کی جاتی تھی تو پھر بڑی باتوں کا اس سے خود اندازہ کر لینا چاہیئے اور اسی سے یہ بھی اندازہ کر لینا چاہیئے کہ اپنی معاشرت کو بکلیۃً چھوڑ کر دوسروں کی نہیں بلکہ دشمنوں کی معاشرت میں ڈوب جانا یہ اسلامی نظر میں کتنا مکروہ فعل ہوگا اور سیاسی لحاظ سے بھی اس کا نام قومی موت ہے، خواہ اس کا نام آپ تعصب رکھیں یا کچھ اور۔

مقدمہ ابن خلدون اٹھا کر دیکھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کی زندگی کے لیے

عصبیت کتنی اہم ہے، اسلام نے آکر اس کی تردید نہیں کی بلکہ اس کو اور مضبوط اور مستحکم بنایا ہے، البتہ اس کی اصلاح یہ کی ہے کہ اپنی حیات اور بقا کے لیے جو صحیح تعصب کر سکتے ہیں وہ ضرور قائم رکھیں لیکن ظلم پر اپنی قوم کا ساتھ نہ دیں اور اس پر اس کی امداد کرنے سے سخت احتراز کریں کیونکہ یہ تعصب اسلام کی نظر میں مذموم ہے۔

پھر یہ اندھیر نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ اپنے دشمنوں کی ایک ایک ادا کو اختیار کرنا پسند کرتے ہیں اور اس کا نام آج کل کی اصطلاح میں "تقدم" رکھ لیتے ہیں اور اسلام کے اہم سے اہم مصالح اور پُراسرار امور کے اختیار کرنے کا نام "تأخر" رکھتے ہیں۔ جہاں تک میں نے غور کیا مجھ کو تو یہی ثابت ہوتا رہا ہے کہ تقدم اور ترقی کا جو مفہوم آپکے دماغوں میں بدقسمتی سے بیٹھ چکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سب سے پہلے پردہ توڑ ڈالا جائے، اجنبی مرد اور عورتوں کے اختلاط میں کوئی روک ٹوک باقی نہ رہے، پورے تزئین کے ساتھ عریاں لباس میں آزادانہ پھرنے کی عورتوں کو عام اجازت ہو، سینما دیکھنا کوئی عیب شمار نہ رہے، رقص اور شراب وکباب، گانا وبجانا یہ تمام فیشن ہو جائے۔ غرضیکہ دشمنوں کی جتنی حیا سوز حرکات ہیں وہ سب اپنالی جائیں۔ اور اس کے خلاف اگر کوئی عمل بھی ہو تو بس اس کا نام "تأخر" رکھ لیا جائے ورنہ آپ بتائیں کہ آج انگریزی زبان کی تعلیم میں آپ نے کتنی ٹھوس ترقی کی ہے، میرے تجربہ میں تو آجکل کا بی اے (B.A.) پہلے میٹرک کے برابر بھی استعداد نہیں رکھتا اور پھر یہ سوچیے کہ ان کی زندگی میں سے آپ نے صرف امورِ مذکورۂ بالا کو ہی چن کر پسند کر لیا ہے یا ان کے احساسِ ذمہ داری، فرض شناسی یا وقت کی پابندی اور نمائشی دیانتداری اور راست گوئی، حقیقی تعصب یعنی اپنی قوم کے نفع کی خاطر دوسروں کی زندگی کی کوئی قیمت نہ سمجھنا اور اپنی اغراض پر دوسروں کو بیدردی سے قربان کر دینا اور اپنی عزت کے لیے دوسروں کو اتنا ذلیل سمجھنا کہ اپنی مجالس اور اپنے

سفر وحضر کے مقامات میں ان کے لیے علیحدہ انتظامات محفوظ کر لینا وغیرہ وغیرہ میں بھی آپ نے کسی ایک صفت کو اختیار کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے جو تقلید بھی کی ہے وہ صرف ان کے عیوب میں کی ہے اور اسی کا نام "تقدم" رکھا ہے ورنہ آپ ہی انصاف کریں کہ فنون جدیدہ اور صنائع جدیدہ اور سائنس جدیدہ سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ تو بہت دور کی باتیں ہیں، ابھی تو ہم کو ان کی سی ڈبل روٹی اور بسکٹ بنانے بھی نہیں آتے اور زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ ابھی تک ہماری توجہات بھی ان خامیوں کی طرف نہیں گئیں، ہماری جماعتی اور انفرادی مساعی صرف اپنے ذاتی منافع پر لگی ہوئی ہیں اگرچہ ہمارے قومی شیرازہ کا ایک ایک تار بھی کیوں نہ بکھر جائے۔ کیا میں اس کا نام "تقدم" رکھوں، کیا میں اس بے تعصبی کو عزت کی نظر سے دیکھوں، کیا میں اس اندھی تقلید کی تعریف کروں، اس کی امید یں آپ مجھ سے تو منقطع کریں۔

عالم برزخ کا ایک عجیب منظر، یعنی مغفرت بھی ہو جائے، اور سزا بھی بھگتنی پڑے

(۵۰) عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ الطُّفَیْلَ بْنَ عَمْرٍو الدَّوْسِیَّ لَمَّا هَاجَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَی الْمَدِیْنَةِ هَاجَرَ اِلَیْهِ وَهَاجَرَ مَعَهٗ رَجُلٌ مِّنْ قَوْمِهٖ فَمَرِضَ فَجَزِعَ فَاَخَذَ مَشَاقِصَ لَهٗ فَقَطَعَ بِهَا بَرَاجِمَهٗ فَشَخَبَتْ یَدَاهُ حَتّٰی مَاتَ فَرَاٰهُ الطُّفَیْلُ بْنُ عَمْرٍو فِیْ مَنَامِهٖ وَهَیْأَتُهٗ حَسَنَةٌ وَّرَاٰهُ مُغَطِّیًا یَدَیْهِ فَقَالَ لَهٗ مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ فَقَالَ غَفَرَ لِیْ لِهِجْرَتِیْ اِلٰی نَبِیِّهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

وَسَلَّمَ فَقَالَ مَالِي أَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ قَالَ قِيلَ لِي لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا أَفْسَدْتَ فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ۔ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ ص ۳۰۰)

ترجمہ: ۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو طفیلؓ بن عمرو اور ان کے ہمراہ ان کی قوم کے ایک شخص نے بھی ہجرت کی۔ حسب الاتفاق وہ شخص بیمار پڑ گیا اور تکلیف کی شدت کی تاب نہ لاکر اس نے اپنے تیر کے پیکان ہاتھ میں لیے اور اپنے ہاتھوں کے پورے کاٹ ڈالے جس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں سے خون بہہ پڑا، یہاں تک کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ طفیلؓ بن عمرو نے ان کو خواب میں دیکھا، ان کی صورت تو بہت اچھی تھی لیکن وہ اپنے دونوں ہاتھ ڈھانکے ہوئے تھے۔ انھوں نے اُن سے پوچھا کہو تمھارے پروردگار نے تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا، انھوں نے جواب دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرنے کی برکت سے مجھ کو بخش دیا انھوں نے کہا اچھا تو پھر آپ کے دونوں ہاتھ ڈھکے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ مجھ پر یہ عتاب ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ جو تو نے خود بگاڑا ہے اس کی اصلاح ہم ہرگز نہیں کریں گے۔ یہ خواب طفیل رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیان کیا اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی کہ الٰہی اس کے دونوں ہاتھوں کو بھی بخش دے۔ (مسلم شریف)

شرح: ۔ عالم برزخ کا یہ منظر بھی عجیب ہے کہ یہاں ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ مؤمن کی مغفرت تو ہوجاتی ہے مگر جرم کی سزا بھی مل کر رہتی ہے، اب یہاں دیکھیے کہ اس صحابی کی مغفرت تو ہوگئی مگر اس کے ہاتھ اس کی لغزش کے باعث پھر سزا بھگت گئے اور بارگاہ رب العزت کی جانب سے اس محرومی کا جو سبب بیان ہوا وہ

بھی کتنا مؤثر، کتنا معقول اور کتنا عبرت ناک ہے یعنی یہ کہ جو اس کی بنائی ہوئی چیز کو خود بگاڑے تو اس کی درستی اور اصلاح کی قدرت ضمانت نہیں دے گی، اللہ رے شانِ رحمت اور اس کے ساتھ اللہ رے شانِ بے نیازی کہ اتنی سی کوتاہی سے اتنی سی کسر بھی رہ گئی مگر اتنا خوش نصیب کون ہو گا جس کی تقصیر کی تصویر اس طرح خواب میں دکھلادی جائے اور پھر وہ رحمۃٌ للعالمین کے علم میں بھی آجائے اور اس پر بے چین ہو کر آپؐ کے محبت بھرے ہاتھ اس کی اس کوتاہی کی مغفرت کے لیے اٹھ جائیں، پھر ارحم الراحمین کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ ان پیارے ہاتھوں کو یونہی خالی واپس فرما دیتا۔

اس حدیث میں ایک اور اہم سبق یہ بھی ملتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے جو صورت قدرت خود پسند فرما چکی ہے اگر وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کوئی ناجائز ترمیم کرلے تو اس کے بگاڑنے کا ذمہ دار وہ خود ہی ہو گا اور اب اس کے لیے وہ پیارے ہاتھ کہاں جو اس کی مغفرت طلب کرنے کے لیے اٹھیں۔ اسی لیے حدیث میں ایک عام قانون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ خدا لعنت کرے، ان عورتوں پر جو نمائشی حُسن پیدا کرنے کے لیے اپنی جانب سے خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ اعضاء میں تغیر اور ترمیم کرتی ہیں۔ مثلاً وہ عورتیں جو اپنے ہاتھوں یا رخسار پر مشینوں کے ذریعہ سے مختلف قسم کی تصویریں بناتی ہیں اور اسی طرح وہ عورتیں بھی جو اپنے جسم پر مختلف قسم کی تصویریں بنواتی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو اپنے چہرہ کے اوپر پیدا شدہ بالوں کو خوشنمائی کے لیے نُچواتی ہیں اور اسی طرح وہ عورتیں بھی جو سوہان کے ذریعہ سے اپنے دانتوں کا حُسن بڑھانے کے لیے انکا درمیانی فاصلہ بڑھاتی ہیں۔ الیٰ آخرہ۔ متفق علیہ مشکوٰۃ شریف ص ۳۸۱)

دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ لعنت کرے ان مردوں پر جو عورتوں کے ساتھ اپنی

صورت کو زبردستی مشابہ بناتے ہیں اور اسی طرح خدا لعنت کرے ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہ بننا چاہتی ہیں (بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف)

اس کا بہت بڑا عمیق ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ قدرت نے نوعِ انسانی کی دو صنفوں میں جو قدرتی امتیاز پیدا فرما دیا ہے اس کو مٹانے کی کوشش کرنا۔ یہ قدرتی خلقت کے تغیر میں بہت بڑی جرأت ہے اور ان قدرتی اسرار و حکم کو فنا کر دینا ہے جو اس نے اس امتیاز میں پنہاں رکھے تھے۔ دنیا میں ہر کمپنی اپنی اپنی مصنوعات کا خاص موڈل رکھتی ہے اور کسی دوسرے کو اس موڈل میں ترمیم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ پھر قدرت یہ کب پسند کر سکتی ہے کہ اس نے اپنی خاص مخلوق میں جس صنف کے لیے جو موڈل پسند کر لیا ہے اس میں کوئی زبردستی دست اندازی کرے۔

قرآن یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے ہر عمل کے لیے ایک ہی راہ متعین کر دے بلکہ وہ انسانی ضعف کے پیشِ نظر یہ چاہتا ہے، کہ اگر ضابطہ میں کوئی وسعت مل سکتی ہے تو اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے

(۵۱) عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْھَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَہِکُوْھَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْھَا وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَآءَ مِنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْھَا۔ (رواہ الدار قطنی، مشکوٰۃ ص ۳۲)

ترجمہ:۔ ابی ثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض قرار دی ہیں ان کی بڑی حفاظت اور نگرانی کرنا اور ان میں ادنیٰ سی فروگذاشت بھی نہ کرنا کہیں وہ برباد نہ ہو جائیں اور کچھ باتیں حرام قرار دی ہیں تم ان کا

پورا پورا احترام کرنا اور ان کے ارتکاب کرنے سے دور دور رہنا اور ان کے احترام میں ذرا سا فرق نہ پڑنے دینا اور کچھ باتوں کی حدیں مقرر کر دی ہیں تم ان سے تجاوز نہ کرنا اور کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے قرآن نے قصداً سکوت اختیار فرمایا ہے خبردار اس سکوت کو کسی سہو ونسیان کی بنا پر مت سمجھنا، لہٰذا تم اس کے کھود کرید کے درپے نہ ہونا۔

شرح:۔ شریعت میں مختلف قسم کے احکامات آئے ہیں۔ بعض کو فرض قرار دیا گیا ہے اور بعض کو حرام اور ان دونوں کو صاف طور پر علیحدہ علیحدہ بیان فرما دیا گیا ہے، جسکے بعد کسی تحقیق اور تفتیش کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اس لیے جہاں جس بات کی اہمیت ملحوظ رکھنی ضروری ہے، حدیثِ مذکور میں اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے اور جس طرح ملکوں کی حدود مقرر کر دی جاتی ہیں اسی طرح شریعت نے بھی کچھ حدیں مقرر فرمائی ہیں جن کے عبور کرنیکی تم کو ممانعت فرمائی گئی ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو بالکل ظاہر ہیں اور کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں ہیں لیکن جو بات بڑی اہم اور قابلِ تنبیہ ہے وہ یہ ہے کہ کج فطرت انسان بہت سے مواقع پر قانونی الفاظ میں بے وجہ ایسی تشریحات کا متلاشی رہتا ہے جن سے قانون میں قصداً اغماض کیا جاتا ہے اور بعض مرتبہ یہ اغماض اس لیے ہوتا ہے کہ اگر اس قانون کے ہر پہلو کی پوری پوری شرح کر دی جائے تو پھر اس کے بعد ان کے پورا کرنے میں ذرا سا انحراف کرنا بھی قانون شکنی کے جرم کے مُرادف ہوتا ہے اس لیے قانونی الفاظ میں اتنی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ بوقتِ ضرورت اس وسعت سے ایک کمزور فطرت انسان کو اگر کوئی فائدہ پہنچنا ممکن ہو تو وہ پہنچ سکے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کو ایک قتل کی تفتیش کے معاملہ میں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں، اگر وہ اس مجمل حکم سے فائدہ اٹھالیتے اور کوئی بھی معمولی گائے ذبح کر لیتے تو قانون کا منشا پورا ہو جاتا لیکن انھوں نے بے وجہ اپنے رسول سے یہاں بحثیں شروع کر دیں اور اپنی جانب سے ایسے بے معنی سوالات اٹھا دیئے کہ پھر ان کے

جوابات کے بعد ان شروط کے مطابق گائے کا ملنا ہی مشکل ہوگیا آخر کار اس گائے کے خریدنے میں ان کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

اس لیے قرآن پاک کے الفاظ میں جگہ جگہ اتنی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اس کے تحت ائمۂ اربعہ کے علاوہ اور بھی دین کے اماموں کو اس کی تشریحات میں اختلاف کرنے کا جائز موقع مل گیا اور ان مختلف دفعات کا فائدہ جو قرآنی الفاظ کی وسعت کے تحت پیدا ہوسکتی تھیں، مختلف طبقاتِ انسانی کو پہنچ گیا اور اسی بنا پر اختلافِ امت کو رحمت قرار دیا گیا ہے، اگر قانونی الفاظ میں اس ضرورت کے ماتحت ہر جگہ پوری پوری وضاحت کردی جاتی تو پھر کہیں بھی کسی ادنیٰ سی لچک کا موقع باقی نہ رہتا اور ہر طبقہ کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں بس ایک ہی راہ باقی رہ جاتی۔ مثلاً ملکی لحاظ سے بعض مقامات پر پانی بافراط موجود ہے اور بعض مقامات پر بہت کمیاب ہے۔ اس لیے اب طہارت اور نجاست کا کوئی ایک ہی قانون اتنی وضاحت سے مقرر کردیا جاتا کہ پھر اس کے بعد کوئی دوسرا احتمال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تو پھر یہ ظاہر ہے کہ جن ممالک میں پانی کمیاب ہے وہاں ان احکام کے نفاذ میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا اور اگر شروع سے ہی اس میں اصولاً پوری وسعت رکھی جاتی تو جہاں پانی بافراط ملتا ہے وہاں اتنی وسعت نہ صرف غیر ضروری رہتی ہے بلکہ ممکن ہے کہ طہارت اور نجاست کے درمیان کوئی حد فاصل مقرر کرنا ہی باریک بات بن جاتی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ جس طرح آج ہمارے موجودہ قانون (LAW) میں یہ حق ہر شخص کا نہیں ہے بلکہ ہر وکیل اور ہر عدالت کا بھی نہیں ہے کہ وہ قانون کی شرح جو بھی اس کی رائے میں آجائے وہ کرڈالے اسی طرح اسلامی قانون میں بھی ہر بے بال و پر کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض اپنی عقلی رائے کے مطابق قرآنی قانون کی جو چاہے وہ من مانی شرح کر بیٹھے، یہاں بھی اس کے لیے بہت سی

قیود ہیں جس کی رعایت کیے بغیر محض اپنی رائے سے قرآن میں کسی قید و شرط کا اضافہ یا کمی کرنی یا اس کی کوئی ایسی تشریح کرنی جو آج تک احادیثِ نبویہ اور قضایا یا صحابہ و تابعین پھر اس کے بعد اسلام کے معتمد ججوں نے کبھی نہ سمجھی ہو، کیسے جائز تصور کی جا سکتی ہے۔

افسوس ہے کہ آج جبکہ ہم کو اسلامی دورِ آزادی کا دیکھنا نصیب ہوا تو ہم اس حقیقتِ واقعیہ کا انکار صرف ایک یہ فقرہ کہہ کر کر دیتے ہیں کہ قرآن پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر ایک ڈاکٹر کسی وکیل سے جا کر یہ کہے کہ عدالت کی پیروی کرنے پر آپ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے یا ایک وکیل ایک ڈاکٹر سے یہ کہنے بیٹھ جائے کہ ڈاکٹری آپ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے تو کیا اس کا یہ کہنا معقول ہوگا؟ بیشک نہ قرآن کسی کی اجارہ داری ہے۔ اور نہ کسی خاص فن پر کسی کی کوئی اجارہ داری ہے بلکہ ہر وہ شخص جو اس اجارہ داری کی قیمت ادا کرے گا وہ خود بھی اس اجارہ داری کا شریک بن سکتا ہے لیکن قیمت ادا کیے بغیر اس اجارہ داری کو توڑنا ڈنڈے کے زور سے تو ممکن ہے مگر کسی معقولیت سے نہیں، غالباً اسی اجارہ داری کے توڑنے کے لیے دماغوں میں یہ تجویز پیدا ہوئی ہے کہ سرے سے احادیثِ نبویہ کا انکار کر دیا جائے اور جب احادیث کی کوئی قید باقی نہ رہے تو پھر صحابہ اور تابعین کے فیصلے اور قرونِ اولیٰ کی حکومتوں کے ججوں کے احکامات کی کیا قدر و قیمت رہ سکتی ہے۔

سچ ہے کہ جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے چوٹی کے افراد سے اختلاف اور ان کے علمی ذخائر کی ناقدری میں گرفتار ہو جاتی ہے، اسی ناقدری کی بدولت انجیل اور تورات خواہ ان کی صحت کا کتنا ہی بلند آہنگی کے ساتھ دعویٰ کیا جائے مگر وہ اپنی صحیح صورت میں موجود نہ رہ سکیں اور اگر کہیں قرآنِ کریم کی

حفاظت کی کفیل قدرت خود نہ بن جاتی تو پھر حدیث کی طرح قرآن پاک کا بھی انکار کردینے میں دشواری کیا تھی۔ آخر عیسائی اور ان کے ساتھ بعض جماعتیں جو اپنی اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ قرآن پاک کے متعلق بھی محرف ہوجانے کا دعوٰی کرتے ہیں والعیاذ باللہ۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس دعوٰی کے لیے ان کے پاس ثبوت تو کیا ہوتا، بلکہ ان کا ضمیر بھی خود ان پر ملامت کرتا ہوگا، کاش کہ مسلمان قرآن کریم کی حفاظت کا عقیدہ رکھتے ہوئے اس کے معنٰی کو صحیح طور پر سمجھیں، آخر جن کے واسطہ سے یہ قرآن پہنچا ہے انھیں کے واسطہ سے احادیث نبویہ کا ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں پہنچا ہے پھر اگر قرآن کو تسلیم کیا جائے اور اس کی جو تشریحات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعۂ وحی خود ارشاد فرمائی ہیں، یا آپؐ کے دیکھنے والے صحابہؓ نے ان کو سمجھا ہے۔ یہ تمام کا تمام ذخیرہ ناقابلِ اعتماد رہ جائے تو پھر قرآنی حفاظت کا مفہوم صرف الفاظ تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے اور بعثتِ نبویؐ کا سب سے اہم مقصد یعنی قرآنی قانون کی تشریحات اور ذیلی دفعات یکسر گم ہوجاتی ہیں، اس کی تفصیل مقدمۂ "ترجمان السنۃ" جلد اول میں ملاحظہ کرلی جائے۔

حدیث مذکور کے آخری جملہ کی اہمیت خود قرآن عزیز نے اتنی محسوس کی ہے کہ اس دفعہ کو صراحت کے ساتھ ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ (اے ایمان والو! مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھول جاویں تو تم کو بُری لگیں اور اگر پوچھو گے یہ باتیں ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہورہا ہے تو تم پر ظاہر کردی جاوے گی) (پ ۷، رکوع ۴)

ان آیات میں اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ جو بات شارع علیہ السلام نے

خود بیان نہیں فرمائی اس کے متعلق تم دوراز کار فضول سوالات مت کیا کرو کیونکہ جس طرح اس کا بیان سہولت کا سبب ہے، اسی طرح جہاں اس نے سکوت اختیار فرما لیا ہے وہ بھی رحمت اور سہولت کا سبب ہے۔ اگر تم قرآن پاک کے نزول کے زمانہ میں ایسے سوالات کا دروازہ کھولو گے تو بہت ممکن ہے کہ مبادا ان کے جوابات میں بعض ایسے احکام نازل ہو جائیں جو قانونی آزادی تم کو پہلے حاصل تھی وہ سلب ہو جائے، پھر یہ سخت جرم کی بات ہو گی کہ جو قانون خود مانگ کر تم نے بنوایا ہے اس کو پورا نہ کرسکو اس بارے میں بہت سی احادیث بھی وارد ہیں۔ ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جس کے سوالات کی بدولت کوئی چیز حرام کر دی جائے جو پہلے حرام نہ تھی۔

کسی بگڑے ہوئے ماحول میں صحیح مسلک پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہاتھ میں چنگاری پکڑنا

(۵۲) عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ اَلصَّابِرُ فِیْھِمْ عَلٰی دِیْنِہٖ کَالْقَابِضِ عَلَی الْجَمْرِ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب اسنادًا، مشکوٰۃ ص ۴۵۹)

ترجمہ:۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کے سامنے ایک زمانہ وہ آئے گا جس میں اپنے دین پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہو گا جتنا کہ چنگاری کا ہاتھ میں پکڑنا۔

شرح:۔ ایک زمانہ تھا جبکہ دین اختیار کرنا لوگوں کی نظروں میں اتنا ہی محبوب تھا جتنا کہ آج سیم و زر ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ، لیکن بدقسمتی سے جب کسی قوم کی حالت بگڑنے لگتی ہے تو پھر اس کے عادات و اخلاق ہی نہیں بلکہ اس کے عقائد و اعمال

بھی بدلنے لگتے ہیں، آخرکار اس درجہ بگڑ جاتے ہیں کہ جس کو وہ اپنے دور اول میں قابلِ فخر سمجھا کرتی تھی۔ اپنے دورِ انحطاط میں اسی کو قابلِ نفرت سمجھنے لگتی ہے اور تنزل کی یہ رفتار اسی پر جاکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بڑھتے بڑھتے وبا کی طرح عام طور پر پھیل جاتی ہے۔ پھر نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ اگر اس وقت کوئی خوش بخت اپنے صحیح عقیدہ پر قائم رہنا بھی چاہے اور وہ بیچارہ صرف اپنا دین علیحدہ رہ کر بچانا چاہے تو یہ بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اور بد دین دنیا اس کو مجبور کرکے یہ چاہتی ہے کہ اس کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لے۔ ان حالات میں اس کو اپنے دین پر قائم رہنا ٹھیک اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ حدیثِ مذکور کے الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنا دین بچاکر ان سے علیحدگی اختیار کرلے۔ اس قسم کے مایوس کُن حالات میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوموں کو چھوڑ کر مجبوراً ہجرت کی راہ اختیار فرمائی ہے۔

حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ انھوں نے لوگوں کو اس کی دعوت دی کہ آؤ ہم سب مل کر خدا تعالیٰ کی عبادت کریں، انھوں نے جواب دیا کہ ہم یہ نہیں کریں گے، انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر تم عبادت نہیں کرتے تو میں عبادت کروں گا، تم میری مدد کرو، انھوں نے کہا یہ بھی نہیں کریں گے، اس پر انھوں نے فرمایا کہ اگر میری مدد نہ کرو تو کم از کم مجھے ایذا تو مت دو، انھوں نے کہا ہم اس سے بھی باز نہیں آئیں گے، آخرکار انھوں نے فرمایا کہ اگر تم اتنا بھی نہیں کرسکتے تو پھر لو میرا سلام لو، اور یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اس لیے لازم ہے کہ جب کسی بگڑے ہوئے ماحول کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور خود اپنا دین خطرہ میں نظر آنے لگے تو پھر گوشہ نشینی اختیار کرلینا ہی بہتر ہے۔ امام بخاریؒ نے اس پر ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے اور اس کا عنوان یہ رکھا ہے "مِنَ الدِّیْنِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ"۔

خدا تعالیٰ کی محبت کی علامت سرمایہ و دولت نہیں، ایمان و تقویٰ ہے

(۵۳) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ قَسَمَ بَیْنَکُمْ اَخْلَاقَکُمْ کَمَا قَسَمَ بَیْنَکُمْ اَرْزَاقَکُمْ وَاِنَّ اللّٰہَ یُعْطِی الدُّنْیَا مَنْ یُّحِبُّ وَمَنْ لَّا یُحِبُّ وَلَا یُعْطِی الْاِیْمَانَ اِلَّا مَنْ یُّحِبُّ (رواہ الحاکم فی المستدرک ص ۳۳ وقال الذہبی صحیح الاسناد ورواہ احمد اطول من ھٰذا کما فی المشکوٰۃ ص ۴۲۵)

ترجمہ:۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس طرح تم میں روزی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے اخلاق کی بھی تقسیم کر دی ہے (جیسے رزق تنگ و فراخ رکھا ہے ایسے ہی اخلاق بھی کسی کے تنگ اور کسی کے وسیع رکھے ہیں) وہ دنیا تو سب ہی کو دیتا ہے، اس کو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبت نہیں کرتا، لیکن دولت ایمان صرف اسی کو دیتا ہے جس کو محبوب رکھتا ہے۔

شرح:۔ اس حدیث میں ایک اہم سبق یہ ملتا ہے کہ خدا کی محبت کی علامت دولتِ ایمان ہے، سیم وزر کی دولت نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سیم وزر کی دولت دوست و دشمن میں یکساں طور پر بکھیر دی گئی ہے لیکن دولتِ ایمان صرف اس کے دوستوں ہی کے حصہ میں لگا دی گئی ہے۔

یہاں دو اہم مسائل پر اور روشنی پڑتی ہے کہ رزق اور اخلاق یہ دونوں موہوب ہیں یا مکسوب؟ اخلاق کے متعلق "علم الاخلاق" میں اس پر مستقل بحث کی گئی ہے کہ اخلاق کسبی ہیں یا خلقی؟ اور اس بارے میں دونوں قول ہیں، لیکن حدیث کا فیصلہ دونوں کے

متعلق ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ ربّانی تقسیم پر موقوف ہیں. مسند امام احمد میں ابو دردائؓ سے
روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا
ہے اس کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی پہاڑ
کے متعلق یہ سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس بعید بات کی تو تصدیق کر لینا.
لیکن اگر کسی شخص کے متعلق یہ سنو کہ اس کی فطری عادتیں بدل گئی ہیں تو اس بات کی تصدیق
نہ کرنا، کیونکہ وہ بالآخر اسی کی طرف لوٹے گا جو اس کی فطری خلقت ہوگی (مشکوٰۃ شریف
ص ۲۴) "جبل گردد جبلت نہ گردد" اسی کا ترجمہ ہے.

اب رہا رزق کا مسئلہ تو حدیث اس کو بھی خدائی تقسیم کے ماتحت قرار دیتی ہے.
اور آنکھیں اس کا مشاہدہ کرتی ہیں کہ بہت سے بے عقل مالدار اور بہت سے ہوشیار اور
تعلیم یافتہ تنگ دست نظر آتے ہیں. ایک شخص تجارت کرتا ہے اور تھوڑی سی مدت میں
کروڑپتی نظر آتا ہے. اور ایک شخص مدتوں اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے اور پھر بعض
اوقات اپنا اصل سرمایہ بھی کھو بیٹھتا ہے. اس کھلے ہوئے تجربہ کے بعد فیصلہ تو آسان تھا
لیکن دنیا قارون کے الفاظ میں پھر یہی کلمات کہتی ہے جس کے خزائن کی کنجیاں اونٹوں
پر لد کر جایا کرتی تھیں کہ "اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ" (یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر
سے جو میرے پاس ہے) (پ ۲۰، رکوع ۱۱) یعنی "یہ دولت میرے علم و فہم اور میری جدوجہد کا
نتیجہ ہے.

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حدیث کو اپنے رزق کی ترقی اور اپنے اخلاق کی بہتری
کی جدوجہد سے روکنا منظور ہے. ان دونوں باتوں کا تو انسان شرعاً مامور ہے اور حلال
رزق کے لیے جدوجہد کرنا تو انسانی فرض ہے بلکہ یہ ایک ایسی مخفی حقیقت پر متنبہ کرنا
منظور ہے جس کو مادی نظریں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ یہی کہ اگر کسی کو رزق وسیع ملتا ہے
یا کسی کے اخلاق اعلیٰ ہیں تو یہ اس کا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کو اپنا کمال تصور نہ کرے

بلکہ الٰہی نعمت اور اس کی تقسیم کا نتیجہ سمجھے۔ پس مذہب اور سائنس میں اس کے سوا اور کچھ فرق نہیں کہ عمل کی اگرچہ دونوں راہ دکھلاتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں مگر مذہب اس کا رشتہ خالقِ کائنات پر جا کر ختم کر دیتا ہے اور سائنس خود اپنی جدوجہد پر مغرور و مفتون بنائے رکھتی ہے، لہٰذا عملی جدوجہد کے لیے مذہب کی جانب سے کسی غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں، یہ اپنے اپنے مشرب کی بات ہے کہ اپنا رشتہ مختارِ مطلق، خالقِ کائنات سے جوڑ دو یا بے حس و حرکت محض مادہ کی استعداد کے ساتھ لگا دو، شاعر کہتا ہے ؎

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا ❁ غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

یعنی جو کچھ بھی ہوا وہ سب خالقِ کائنات کی تقسیم سے ہوا۔

اسلامی معاشرت میں بیکار باتوں کا مشغلہ اسلامی حُسن پر ایک بدنما داغ شمار ہوتا ہے

(۵۴) عَنْ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ (رواہ الترمذی وغیرہ وحسنہ الحافظ ابن رجب الحنبلیؒ فی جامع العلوم والحکم، مشکوٰۃ ص۴۱۳)

ترجمہ:۔ حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بیکار باتوں کا قطعاً مشغلہ چھوڑ دے۔

شرح:۔ اس حدیث کی اہمیت کے پیش نظر مالایعنی کے لفظ کی کچھ توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے، حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ لفظی وسعت کے لحاظ سے تو "لایعنی" کا لفظ اقوال و افعال سب کو شامل ہے لیکن محاورہ و استعمال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا زیادہ تر اطلاق لغو باتوں پر ہوتا ہے۔ اسی کی طرف حسب ذیل آیات و احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے:۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (انسان کوئی

بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر ایک نگراں اس کے لکھنے کے لیے تیار رہتا ہے (پارہ ۲۶، رکوع ۱۶) لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بہتری اور خیر کا نام بھی نہیں ہوتا مگر ہاں صرف ان سرگوشیوں میں جو خیرات اور نیک باتوں کی صلاح دینے کے متعلق ہوں) (پ ۵، رکوع ۱۴)

(۱) آدمی کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیکار باتیں نہ کرے (مسند امام احمد)

(۲) جو آدمی اپنے عمل اور باتوں کا موازنہ کرتا رہے گا وہ خود بخود صرف حاجت کی بات کرنے کا عادی بن جائے گا (ابن حبان)

(۳) اسی حقیقت کے مخفی رہنے کی وجہ سے حضرت معاذؓ نے یہ سوال کیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جو باتیں ہم کرتے ہیں کیا ان پر بھی ہم سے گرفت کی جائیگی، آپؐ نے فرمایا، کیوں نہیں زیادہ تر لوگ اسی جا و بیجا زبان چلانے کی بدولت ہی دوزخ میں منہ کے بل گرائے جائیں گے۔

(۴) حضرت ام حبیبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ ابن آدم کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اس کے نقصان ہی نقصان کی ہوتی ہے نفع کی نہیں ہوتی، بجز ان صورتوں کے ۱ بھلی بات کا حکم دینا، ۲ بری بات سے روکنا، ۳ اور اللہ کی یاد کرنا (ترمذی)

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایک صحابی کا انتقال ہوگیا تو کسی نے کہا تجھے جنت کی بشارت ہو۔ آپؐ نے فرمایا تمھیں کیا خبر ہے شاید اس نے کبھی بیکار بات منہ سے نکالی ہو یا اپنی حاجت سے زیادہ چیز پر بخل کیا ہو (ترمذی)

(۶) ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنی قوم کا سردار ہوں جو کہتا ہوں میری مانتے ہیں ان سے کیا کہوں، آپؐ نے فرمایا کہ ہر کس و ناکس کو سلام کیا کریں اور غیر ضروری باتیں کرنا چھوڑ دیں (ابن ابی الدنیا)

(۷) ایک صحابی کی بیماری میں (عیادت کے لیے) کچھ لوگ گئے، دیکھا تو وہ ہشاش بشاش

تھے، سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا دو عمل میرے پاس ایسے ہیں کہ ان سے زیادہ بخشش کی امید مجھے کسی عمل سے نہیں ہے، ایک تو یہ کہ میں غیر ضروری باتیں نہ کرتا تھا۔ دوم یہ کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے میرا سینہ صاف اور ٹھنڈا رہا کرتا تھا (ابن ابی الدنیا)

(۸) حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ کسی آدمی سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کرنے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اس کو بیکار باتوں کے مشغلہ میں الجھا دے۔

(۹) سہل تستریؒ فرماتے ہیں جو بے ضرورت باتیں کریگا وہ راستگوئی سے محروم ہو جائیگا۔

(۱۰) معروف کرخیؒ فرماتے ہیں آدمی کا بیکار باتوں کا مشغلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکو رسوا کرنے کی ایک علامت ہے۔ اس قسم کی احادیث اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا زیادہ تر تعلق اقوال ہی کے ساتھ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان بیکار اور بے حاجت قول و فعل چھوڑنے اور ضرورت کے مطابق بات اور اسی کے موافق کام کرنے کا عادی بن جائے تو اسے بشارت ہو کہ اب اس نے صفت انسانیت میں قدم رکھ دیا ہے اور اب اس کی ایک نیکی صرف دس یا سات نیکیوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے لیے رحمت کا وہ وسیع دروازہ کھل گیا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نازک حسن بیکار باتوں کی ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا پھر آپ یہ کیا سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی غفلت اور من مانی آزادی کے بعد بھی اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا آپ کو یہ مرتبۂ عالی کیسے ملا، آپ نے فرمایا تین باتوں سے ۱ راست گوئی ۲ اداءِ امانت ۳ اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی کی عادت سے (مؤطا)

یہ بات قاعدۂ کلیہ کے طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام میں دنیا کے ہر گوشہ کا رُخ بھی آخرت ہی کی طرف رہتا ہے اور اسلام میں خدا پرستی کی یہی سب سے بڑی

روح ہے لہٰذا جن کی دنیا کا رُخ ہر جگہ آخرت سے کٹ چکا ہے ان کو ہر جگہ یہ مغالطہ لگتا ہے کہ اسلام میں دنیا کی تعلیم نہیں۔ اب سوچیئے کہ موجودہ دنیا میں کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں کیا بیکاری کا وجود ملتا ہے۔ اس کا وجود اگر ہے تو ایک صرف ہم مسلمانوں میں ہے۔ بیشک یہ ہماری پسماندگی کا ایک بھاری سبب ہے مگر اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں مذہب نہیں، ہمارے مذہب کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہماری زندگی کا ایک لمحہ بھی بیکاری میں صرف نہ ہونا چاہیئے، اب اگر اس میں نیت آخرت کی ہے تو پھر یہ آخرت کے اجر کا موجب بھی ہے اور نُورٌ علیٰ نور ہے۔ آخر کافر کی دنیا میں اور ایک مسلمان کی دنیا میں کسی مرحلہ پر بھی فرق کرنے پر آپ کبھی راضی ہوں گے بھی یا نہیں۔

سب سے اچھا مُفتی خود انسان کا ضمیر ہے بشرطیکہ وہ آفت رسیدہ نہ ہو

(۵۵) عَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍؓ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ الْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَیْہِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَیْہِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاکَ النَّاسُ وَاَفْتَوْکَ (رواہ احمد والدارمی فی مسندیھما باسناد حسن، ترمذی ص ۲۲۰)

ترجمہ:۔ وابصہ بن معبدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے فرمایا کیا گناہ اور نیکی کی تعریف پوچھنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا تو اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کر جس بات پر دل ٹھک جائے تو وہ نیکی کی بات سمجھو، اور جس میں کھٹک اور تردّد باقی رہے وہ گناہ کی بات سمجھو اگرچہ لوگ تمھیں کتنے ہی فتوے دیتے رہیں (مسند احمد ودارمی)

شرح :۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا ہے، ان میں اچھے برُے، حق و ناحق کا احساس اور اس کا امتیاز اسی طرح ودلیعت فرمایا ہے جس طرح آنکھ میں دیکھنے، ناک میں سونگھنے، کان میں سننے، اور ہاتھوں میں چھُو کر محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ جب تک انسان اپنی اصلی فطرت پر قائم رہتا ہے، اس کے فطری احساس کی قوت بھی ظاہری احساسات کی طرح ٹھیک ٹھیک کام کرتی ہے۔ جس طرح کان ایک اچھے نغمے کی طرف بلا ارادہ لگ جاتے ہیں اور برُے نغمے سے غیر اختیاری طور پر ہٹ جاتے ہیں، اسی طرح انسان کا صحیح و سلیم فطری احساس بھی خدا تعالیٰ کے احکام سے طبعًا مانوس اور منہیات شرعیہ سے فطرۃً متنفر ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث قلب کی اسی فطری سلامتی پر مبنی ہے۔

لیکن جب فطرتِ انسانی کچھ خارجی اسباب کی بنا پر مجروح ہو جاتی ہے تو اسمیں وہ احساس بھی باقی نہیں رہتا اور جس طرح بیمار حواس اپنا صحیح کام انجام نہیں دیتے اس کی فطرت بھی پورے طور پر کام نہیں کرتی اور رفتہ رفتہ ایسے اسٹیج پر پہنچ جاتی ہے جہاں اسے حق و ناحق کا کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہتا۔ یہ انسان اس نابینا کی طرح ہو جاتا ہے جو سرُخ و سفید کا نام تو سنتا ہے مگر ان میں طبعی طور پر پہچان نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ انسان جس کی فطرت بیمار ہو جاتی ہے حق و باطل کا فرق صرف دلائل کی قوت سے ہی سنتا یا سمجھتا ہے حتیٰ کہ اسلام سے اس کی رغبت اور کفر سے نفرت بھی استدلالی رہ جاتی ہے، طبعی نہیں رہتی۔ یہ انسان صحیح فطرت سے ہٹا ہوا انسان ہے اس کا احساس غیر معتبر اور بیمار ہے۔ حضرت شیخ مجدد صاحبؒ نے اپنے مکتوب ۲۶ جلد اول میں اس کی خوب تحقیق فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ نیک انسان کو نیکی کے ساتھ ایک فطری تناسب ہوتا ہے ٹھیک اسیطرح جس طرح لوہے کو مقناطیس سے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی امر کا نیکی ہونا شرعًا

معلوم ہو جائے تو ایک انسان کی فطرت کی سلامتی کی علامت یہ ہے کہ اس کی طرف وہ اپنی قلبی کشش محسوس کرے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا شرعاً نیک ہونا ثابت ہو جائے تو پھر کسی مشتبہ امر کے نیک و بد ہونے کی علامت اس کی فطرت ہے اگر اس کی جانب اس کے دل میں کشش موجود ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ نیکی کا عمل ہے ورنہ نہیں۔

ایک صحیح حدیث میں ارشاد ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا ہے، اگر وہ درست ہو گیا تو تمام جسم تندرست ہو جاتا ہے اور اگر کہیں وہ بیمار ہوا تو تمام جسم بیمار ہو جاتا ہے، اس کا نام دل ہے۔ لہٰذا انسان کا دل ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ صالح ہو جائے تو سب سے بڑا امین ہے اور اگر بگڑ جائے تو سب سے بڑا خائن ہے اور جب یہ خائن ہو جاتا ہے تو پھر آئین و ضوابط خواہ کتنے ہی بہتر سے بہتر ہوں مگر ان کی کچھ پار نہیں بستی۔ تمام آئین و ضوابط کے باوجود ایک حاکم اپنی کرسی پر اپنی غریب رعایا اور حتیٰ کہ ایک بیوی اپنے غریب شوہر کے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور ان کا دل بھی اس پر شاہد ہوتا ہے۔ خوب یاد رکھیئے کہ پہلے اپنی معاشرت درست کیجیئے ورنہ ضوابط صرف ایک باضابطہ بربادی کا ذریعہ ہیں اور بس۔

مسلمانوں میں وہ عبرتناک انقلابات جن کے بعد بڑے بڑے انقلابات کا انتظار کرنا چاہیئے

(۵۶) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اتُّخِذَ الْفَیْءُ دُوَلًا وَّ الْاَمَانَةُ مَغْنَمًا وَّ الزَّكٰوةُ مَغْرَمًا وَّتُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَاَطَاعَ الرَّجُلُ امْرَاَتَهٗ وَعَقَّ اُمَّهٗ وَاَدْنٰى صَدِيْقَهٗ وَ اَقْصٰى اَبَاهُ وَظَهَرَتِ الْاَصْوَاتُ فِی الْمَسَاجِدِ وَسَادَ الْقَبِيْلَةَ فَاسِقُهُمْ وَكَانَ زَعِيْمُ الْقَوْمِ اَرْذَلَهُمْ وَاُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ وَظَهَرَتِ

اَلْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ وَلَعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَارْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِكَ رِيْحًا حَمْرَآءَ وَزَلْزَلَةً وَّخَسْفًا وَّمَسْخًا وَّقَذْفًا وَّاٰيَاتٍ تَتَابَعُ كَنِظَامٍ قُطِعَ سِلْكُهٗ فَتَتَابَعَ (رواه الترمذی مشکوٰۃ ص ۴۷۰)

ترجمہ:۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مندرجہ ذیل باتیں تم کو نظر آنے لگیں تو پھر اس وقت آفات کا انتظار کرنا چاہیئے۔ سرخ آندھیاں، زلزلے، زمین میں دھنس جانا، آدمیوں کی صورتوں کا بگڑ جانا، اور آسمان سے پتھروں کا برسنا اور ایسے ہی پے درپے عجائبات کا اس تیزی کے ساتھ پیش آنا جیسا کہ کسی ہار کا تاگا ٹوٹ جائے اور اس کے دانے بہ دانے تیزی کے ساتھ گرنے لگیں۔ وہ باتیں یہ ہیں:۔

(۱) جبکہ مالِ غنیمت اپنی ذاتی دولت بنالی جائے (یعنی اس کے مستحقین میں تقسیم نہ کی جائے) (۲) اور امانت کو مفت کی غنیمت سمجھ لیا جائے (یعنی اس کو ادا کرنے کے بجائے اپنے مصارف میں استعمال کرلیا جائے) (۳) اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے (یعنی خوشدلی کی بجائے بکراہت ادا کی جائے) (۴) اور علم دنیا کے لیے طلب کیا جائے نہ کہ رضائے حق کے لیے (۵) اور آدمی بیوی کی فرمانبرداری کرے اور ماں کی نافرمانی (۶) اور دوست سے محبت و بے تکلفی رکھے اور والد سے تکلف اور نفرت (۷) اور مسجدوں میں کھلم کھلا شور مچنے لگے (۸) اور قبیلہ کا سردار وہ مقرر ہو جو اُن سب میں فاسق انسان ہو نہ وہ شخص جو متقی اور نیک ہو (۹) اور قوم کا سردار وہ ہو جو سب سے زیادہ کمینہ خصلت ہو (۱۰) آدمی کا احترام کیا جائے تو صرف اس کے شر سے بچنے کے لیے نہ کہ اس کی صفاتِ حمیدہ کی وجہ سے (۱۱) گانے بجانے والی عورتیں گلی گلی پھرنے لگیں (۱۲) اور شراب نوشی عام ہو جائے (۱۳) اور اس امت کے آخر لوگ پہلے لوگوں پر لعنت و ملامت کرنے لگیں۔

شرح:۔ یہ تیرہ باتیں ہیں کہ جس وقت ان کا تذکرہ کیا جارہا تھا اس وقت اس کا کیا وہم و گمان کیا جاسکتا تھا کہ امتِ محمدیہ کے حکام اور بعض علماء سب اس ناگفتہ بہ نوبت کو

پہنچ جائیں گے، اب اگر ان میں سے ایک ایک کے متعلق تفصیل کی جائے اور اس کے اسباب جو اس ناقص در ناقص کے ذہن میں کچھ کچھ ہیں، ضبط تحریر میں لائے جائیں تو پھر اس کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا، اگر کسی کے سینہ میں دل اور دل میں ایمان کی کچھ روشنی ہوگی تو اس روشنی میں جتنا دیکھ سکتا ہے خود دیکھ لے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔
مختصر کرتے کرتے یہ رسالہ یونہی بہت طویل ہوگیا، اللہ تعالیٰ یہ بھی قبول فرمائے تو یہ بھی کافی ہے

شریعتِ اسلام میں کسی مسلمان یا کسی کافر رعیّت کا ناحق قتل کرنا بھی کفر کے ہم پلّہ گناہ شمار ہوتا ہے

(۵۷) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِيْ فُسْحَةٍ مِّنْ دِيْنِهٖ مَا لَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا رواه البخاری وعند ابی داؤد فاذا اصاب دما حراما بلح۔ مشکوٰۃ ص ۲۹۹-۳۰۱)

ترجمہ:۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مؤمن کے لیے دین میں اس وقت تک بڑی وسعت رہتی ہے جب تک کہ وہ کسی کا ناحق خون نہ بہائے۔ (بخاری شریف)

اس کے بعد ابوداؤد شریف میں اتنی زیادتی اور ہے کہ جب بدقسمتی سے وہ اس جرم کا ارتکاب کرلیتا ہے تو بس اسی دن سے عمل خیر سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے (پھر یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ گرتے گرتے کس نوبت کو جا پہنچتا ہے)

شرح:۔ مسلمان کا قتل کرنا شرعی نظر میں کوئی معمولی جرم نہیں اس کی اہمیت صرف حدیثوں میں ہی بیان نہیں ہوئی بلکہ قرآن کریم نے اس کا ان الفاظ میں اعلان فرمایا ہے کہ اس سے بدترین جرم کا بدلہ تو یہ ہے کہ اس کا مرتکب اسی سزا کا مستحق ہے جس کا کہ ایک کافر یعنی دوزخ کا دائمی عذاب، قتل مسلم تو درکنار، ابن ماجہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اس سلسلہ میں ذرا سا کلمہ کہہ کر بھی کسی قاتل کی مدد کی تو قیامت کے دن وہ اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کی پیشانی پر یہ نقوش لکھے ہوئے ہوں گے "یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہے" (مشکوٰۃ شریف ص ۳۰۲)

اس حدیث میں ایک عمیق حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی زندگی میں جب کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے تو وہ یک لخت رونما نہیں ہوتا بلکہ جس طرح کہ دن کی روشنی اور شب کی تاریکی تدریجی طور پر آتی ہے اسی طرح اس انقلاب کی رفتار بھی آہستہ آہستہ اس طرح ہوتی ہے کہ خود اس شخص کو بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کہاں تھا پھر کہاں جا پہنچا ہے، اسی طرح قاتلِ مسلم کا حال ہے کہ اس کی دینی مستعدی روز بروز ایسی رفتار سے مدھم پڑتی چلی جاتی ہے کہ خود اس کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، آخر اس کا دین ایک دن غرق ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا معلوم اس کا شمار پھر کس طرف ہو جاتا ہے، اب یہ رحمت کے رموز ہیں کہ کبھی کبھی اس ڈوبتے کو غیب سے کوئی سہارا مل جاتا ہے کہ وہ پھر وہ غوطہ کھا کر سطح آب پر آجاتا ہے اور رحمت کشاں کشاں اس کو باہر لے آتی ہے لیکن یہ سب اتفاقات ہی ہوا کرتے ہیں، ورنہ ڈوبا ہوا بھلا کب باہر آتا ہے، اس لیے ایسی باتوں سے ڈرتے رہنا چاہیئے اور خدا تعالیٰ سے ہمہ وقت پناہ ہی مانگنا چاہیئے۔

ہمارے موجودہ معاشرہ میں جہاں دوسری بہیمی صفات راہ پا چکی ہیں ان میں سے ایک بدترین خصلت ناحق قتل کرنا بھی ہے، ذرا سی بات پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر ڈالتا ہے، کاش کہ وہ یہ بھی جان لیتا کہ اس نے ایک مسلمان کی دنیا ختم کی ہے لیکن اپنی تو آخرت برباد کر ڈالی ہے اسی لیے اسلام نے قتل کی سزا "قصاص" مقرر فرمائی ہے یعنی اگر ایک شخص کسی کی دنیا ختم کرتا ہے تو اس کو یہ سزا ملنی چاہیئے کہ اس کی دنیا بھی ختم کر دی جائے اور بعض ائمہ کے نزدیک تو یہ بھی لازم ہے کہ اس کو سزائے موت بھی اسی طریقہ سے دینی چاہیئے جس طرح کہ اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے حتیٰ کہ اگر اس نے

کسی کا سر پتھر سے کچلا ہے تو اس کا سر بھی اسی طرح کچل دینا چاہیئے، قرآن کہتا ہے قاتل کو قتل کر دینا یہ بے رحمی نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی زندگی کا رازہ اسی سزا کے نفاذ میں مضمر ہے، اس حقیقت کی زیادہ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، علماء جانتے ہیں اور بے علم ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔

یہاں مجھ کو یہ تنبیہ کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے مذاہب اپنے منہ سے خواہ کچھ ہی دعوٰی کریں لیکن ان کے نزدیک عملاً خون کی کوئی قیمت ثابت نہیں ہوتی لیکن یہ اسلام ہے کہ اگر کھلا کافر یعنی دشمنِ اسلام ہماری مملکت میں شرائط کے موافق ہماری پناہ میں رہتا ہے تو اگر کوئی مسلمان اس کو قتل کرے گا تو اس کو جنت کی خوشبو سونگھنی بھی نصیب نہ ہوگی (مشکوٰۃ شریف) یہ اس وجہ سے کہ کفر اور اسلام میں امتیاز کا دن عالمِ آخرت ہے لیکن اس دنیا میں اسلام ایک نظام رکھتا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ ان معاملات میں اس عالم میں اپنے نظام میں اپنے دوست و دشمن کے درمیان کوئی امتیاز باقی رکھے۔

یہ بات ان اوراق میں بار بار آپ کی نظر سے گذرے گی کہ اسلام صرف عارضی اور ظاہری نظام پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ ایک دوسرے اندرونی قانون کا دباؤ بھی انسان کے ضمیر پر ڈالتا ہے جو اس کے ماننے والوں کی نظروں میں دنیوی نظام سے زیادہ بلند اور زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے ایک سچا مسلمان اس پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ظاہری قانون کی پابندی صرف ظاہری حکومت کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے دل و جان سے کرنے پر مجبور ہو اور جب تک اس قسم کا کوئی خوف انسان کے دل پر مستولی نہ رہے اس وقت تک صرف ظاہری قوانین نظامِ عالم قائم رکھنے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہو سکتے۔

خودکشی کرنے والا مصیبت سے نجات نہیں پاتا بلکہ اپنے اوپر دائمی مصیبت مسلّط کر لیتا ہے

(۵۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَدّٰی مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ یَتَرَدّٰی فِیْهَا خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا وَمَنْ تَحَسّٰی سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَسَمُّهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَحَسَّاهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِیْدَةٍ فَحَدِیْدَتُهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَوَجَّأُ بِهَا فِیْ بَطْنِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۲۹۹)

ترجمہ: ۔ ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خودکشی کرے گا وہ دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا اسی طریقہ پر ہمیشہ ہمیشہ خودکشی کرتا رہے گا، اگر پہاڑ سے گر کر اس نے خودکشی کی ہوگی تو وہ ہمیشہ اسی طرح اپنے آپ کو پہاڑ سے گراتا رہے گا اور اگر اس نے زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کیا ہوگا تو وہ اسی طرح ہمیشہ دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا اپنی جان کو ہلاک کرتا رہے گا اور اگر اس نے کسی ہتھیار سے اپنے آپ کو قتل کیا ہوگا تو اس کا ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا اس کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا۔

شرح: ۔ ایک آزاد مسلمان خواہ کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو یہ صرف سنتا ہی سنتا ہے کہ اس کی جان خود اس کی ملکیت نہیں بلکہ جان آفرین کی ملکیت ہے اسی طرح وہ مابعد الموت کی زندگی کو صرف سنتا ہی سنتا ہے مگر نہ اس پر اس کو پورا یقین حاصل ہوتا ہے اور نہ اس کی تفصیلات سے وہ کچھ آشنا ہوتا ہے اس لیے ذراسی بات پر وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی موجودہ مشکلات سے بڑی

آسانی سے رستگاری حاصل کر لی لیکن اگر وہ کچھ مذہب سے بھی آشنا ہوتا تو وہ یہ بھی سوچتا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اس مسکین کو یہ بھی علم نہیں کہ جس حیات کو اس نے زندگانی سمجھا تھا یہ تو بہر حال فانی تھی اور جس کو اس نے موت تصور کیا تھا در حقیقت وہ دائمی حیات تھی اس لیے اس کی خودکشی سے اس کو نجات نصیب نہیں ہوگی بلکہ اور دائمی مصیبت گلے پڑ جائے گی۔

حدیث مذکور سے پاداش عمل کے ایک عجیب قانون کا بھی پتہ ملتا ہے جس کو "جزاء من جنس العمل" کہا جاتا ہے یعنی عالم غیب میں قانون یہ ہے کہ سزا اسی جنس کی ملتی ہے جس جنس کا عمل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جس شخص نے اپنی جان کو جس آلہ کے ذریعہ ہلاک کیا ہوگا اس کی سزا بھی یہی ملے گی کہ وہ ہمیشہ اپنی جان کو اسی آلہ سے ہلاک کرتا رہیگا اور ہمیشہ اسی طرح اس کو عذاب ہوتا رہے گا بے عقل انسان یہ سمجھتا ہے کہ ایک مرتبہ چھری گھونپ کر بس اس کی مصائب کا خاتمہ ہو گیا کاش کہ اس کو یہ علم و یقین بھی حاصل ہوتا کہ آئندہ اس کو نجات کہاں؟ ہمیشہ کے لیے اسی عذاب میں گرفتار رہنا ہے۔

وہ نفوسِ قدسیہ (یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کہ جب سے وہ گم ہوئے دین کا مزہ جاتا رہا

(۵۹) عَنْ اَنَسٍ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ اَصْحَابِیْ فِیْ اُمَّتِیْ کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ لَا یَصْلُحُ الطَّعَامُ اِلَّا بِالْمِلْحِ قَالَ الْحَسَنُ رضؓ فَقَدْ ذَھَبَ مِلْحُنَا فَکَیْفَ یَصْلُحُ۔

(رواہ فی شرح السنۃ، مشکوٰۃ ص ۵۵۴)

ترجمہ:۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری تمام امت میں میرے صحابہ کی مثال (یعنی وہ لوگ جنھوں نے مجھ کو ایمان کے ساتھ ایک بار بھی دیکھ لیا ہے یا ان کو میری صحبت نصیب ہوئی اور اسی حالت پر ان کا خاتمہ ہوگیا) ایسی ہے جیسا نمک کھانے میں کہ جیسے کھانا نمک کے بغیر اچھا اور لذیذ نہیں ہوسکتا اسی طرح میری امت کی اصلاح میرے صحابہ کی اتباع کے بغیر نہیں ہوسکتی، حسنؓ صحابہ کے دور کے گذرنے پر بڑی حسرت کے انداز میں یہ فرماتے ہیں کہ جب ہمارا نمک ہی ختم ہوگیا تو اب ہمارے دین میں لذت کہاں اور کیسے۔

شرح:۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے ان کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا) (پ ۲۰ رکوع ۱۰) خلاصہ یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی شان یہ ہے کہ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور پھر اس میں سے جس کو چاہے انتخاب فرما لیتا ہے یعنی جس طرح پیدا کرنا یہ خاص اس کی صفت ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں، اسی طرح کسی کا انتخاب فرما لینا یہ بھی اس کی شان ہے اس میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں، مثلاً زمین میں اس نے مکہ مکرمہ کو بیت اللہ کے لیے انتخاب فرمایا اور مدینہ طیبہ کو اپنے حبیب پاک کے دفن ہونے کے لیے انتخاب فرمایا اسی طرح انسانوں میں سے جس کو چاہا اپنی رسالت کے لیے منتخب فرمایا اور رسولوں میں سے جس کو چاہا اپنا حبیب بنانے کے لئے انتخاب فرمایا صلوات اللہ وسلامہٗ علیہ۔ پھر جس طرح اپنے حبیب پاک کی زوجیت کے لیے صنف نساء میں سے چند عورتوں کا انتخاب فرمایا اسی طرح آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کے لیے تمام عالم میں سے چند نفوسِ قدسیہ کا انتخاب فرمایا یہ سب انتخابات اسی خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ کی صفت اختیار کے ماتحت ہیں جس میں کسی کا کوئی دخل نہیں اور نہ کسی کو اس سے باز پُرس کرنے کا کوئی حق ہے۔

اب آپ سوچ لیجیے کہ جو عالم میں خدائی انتخاب کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

شرفِ صحبت کے لیے چنے گئے ہوں گے وہ کیسے قیمتی اور پاک نفوس ہوں گے، لہٰذا ان کا کیا پوچھنا جو تمام جہان سے آپ کی فیضِ صحبت کے لیے منتخب ہوئے خدا کی کتاب اور خدا کا دین انھیں کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلا اور انھیں کے دم سے یہ دین ہم کو نصیب ہوا۔ وہی قرآن کے سب سے پہلے حامل تھے اور وہی سب سے پہلے اس پر عمل کرنے والے تھے، جنھوں نے سب سے پہلے دین کے لیے اپنا وطن چھوڑا تجارت اور مال و دولت سے منہ موڑا اور وہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے دین کے واسطے اللہ اور رسولؐ کی محبت میں اپنی گردنیں کٹوائیں اور شوق ذوق سے اپنی بیویوں کو بیوہ بنایا اور اپنے پیارے بچوں کو یتیم بنایا اور یہ سب کچھ اتنی خوشی سے کیا گویا ان تمام قربانیوں کے لیے ہی وہ پیدا کیے گئے تھے۔ انھیں کے تذکروں سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے اور زمین کا چپہ چپہ ان کی سچی قربانیوں کی گواہی دے رہا ہے۔ تاریخ ان کے زرین کارناموں کو یاد کرکے رو رہی ہے اور زمین و آسمان اس کی شہادت پر بے ساختہ گواہی دے رہے ہیں یہ ان کی مدح سرائی نہیں بلکہ حقیقت ہی حقیقت ہے اور وہ حقیقت ہے جس کے اظہار سے قلم درماندہ اور زبان عاجز ہے۔

حسب بیانِ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض خاص حواریین یعنی صحابیوں نے اپنے رسول پاکؑ کے ساتھ غداری کی اور خود انجیلوں کے بیان کے موافق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری میں خاص حصہ لیا لیکن خدا کے اس آخری پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام علیہ کے صحابۂ کرامؓ نے ایک موقع پر بڑے جوش وخروش کے ساتھ یہ جواب دیا کہ اے خدا کے پیارے رسولؐ! ہم وہ نہیں جو اصحاب موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح یہ کہہ دیں کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (سو تو جا اور تیرا رب اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) (پ ۶، رکوع ۸) یعنی اے موسیٰؑ! بس تو اور تیرا رب جا کر ہمارے دشمنوں سے لڑو اور ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم

وہ ہیں کہ اگر آپ ہم کو حکم دیں گے تو ہم بلا کسی پس و پیش کے اسی دم اپنے گھوڑوں کو سمندر میں ڈال دیں گے ؎

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کہ اندر میانِ خاک وخوں بینی سرے

یہ صرف ان کے زبانی دعوے نہ تھے بلکہ ہر موقع پر مدت العمر اپنے اعمال واقوال سے اس کا ثبوت دیتے رہے، مجھ کو یہاں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی کا صحیح نقشہ کھینچنا منظور نہیں اور نہ میرے قلم میں اس کی اہلیت اور لیاقت ہے یہ چند سطور اس رسالہ کے آخر میں صرف تبرکاً درج کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ انھیں کے طفیل میں آج میرا شمار مسلمانوں کی قطار میں ہے، سورۂ فتح کے آخر میں ان کا نقشہ جس انداز میں کھینچا گیا ہے اس کو لکھے بغیر قلم نہیں رُکتا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہے اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زورآور ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں) (پ ۲۶ رکوع ۱۲) کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور ان کی صداقت کا بدیہی ثبوت وہ نفوس ہیں جو ہمہ وقت ان کے گرد و پیش ان کی صحبت میں رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک قاعدہ ہے کہ انسان کی اولوالعزمی اور بلندی پہچاننے کا معیار اس کے رفقاء و ہم نشین یعنی اس کی سوسائٹی ہوتی ہے۔

یہاں آپؐ کے فیضِ صحبت یافتہ نفوس کے جن چیدہ صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں کہ وہ باہم تو بہت نرم دل اور ہمدرد ہیں لیکن دشمنِ خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں بڑے سخت اور کڑوے، ان کی عبادتِ الٰہی کا نقشہ دیکھنا چاہو تو اس طرح دیکھو گے گویا وہ ہمہ وقت نمازوں میں سربسجود ہیں، پھر نیت کے اتنے بلند کہ دنیوی کسی طمع کا ان کے دلوں میں نام نہیں، صرف ایک رضائے الٰہی اور اس کے

فضل کے متلاشی نظر آئیں گے ؎

آں نمی خواہم کہ گردد قصر جنت جائے من
وائے برمن گر نشد راضی زمن مولائے من

اس شعر میں گویا ان ہی کی کیفیت کی حکایت ہے۔ نمازوں کی پابندی خصوصاً تہجد کی نماز سے ان کے چہروں پر خاص قسم کا نور اور رونق ہے گویا خشیت وخضوع اور حسنِ نیت واخلاص کی شعاعیں باطن سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر کو روشن کر رہی ہیں۔ حضرتؐ کے اصحاب اپنے چہروں کے نور اور متقیانہ چال ڈھال سے لوگوں میں الگ پہچانے جاتے تھے۔ پہلی کتابوں میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی ایسی ہی شان بیان کی گئی تھی، چنانچہ بہت سے غیر متعصب اہلِ کتاب ان کے چہرے اور طور وطریق دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ واللہ! یہ تو مسیحؑ کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں صحابہؓ کی مثال ان آیات میں کھیتی کی سی بیان کی گئی ہے کہ جب دانہ پھٹ کر زمین سے باہر نکل آتا ہے تو وہ اس کمزور حالت میں ہوتی ہے کہ ذرا سی لُو لگے تو خشک ہو کر رہ جائے لیکن رفتہ رفتہ قدرت اس کو اتنا مضبوط اور قوی بنا دیتی ہے کہ وہ لمبی لمبی شاخوں پر خود کھڑی ہو کر لہلہاتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی بڑھتی ہوئی شان دیکھ کر جو کافر ہیں وہ جلے مرتے ہیں کہ یہ مٹھی بھر کمزور مسلمان ذرا سی مدت میں اس قابل کیسے ہو گئے کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اتنے مضبوط ہو گئے کہ مخالفین ان کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فوائد میں لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں کوئی ایک دو فرد داخل ہوئے، پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے فوج در فوج لشکر در لشکر بن گئے اور آخر کار تمام عالم پر غالب آ گئے۔ صحابہؓ کی شانِ رحمت وغلظت کے متعلق تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ صفات انسان میں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن فطری صفات کا ظہور اچھے اور بُرے محل کی تمیز نہیں کرتا یعنی جو رحم دل ہے وہ ہر جگہ رحم دل ہے، اور جو کڑوے مزاج کا ہے وہ ہر جگہ کڑوے مزاج کا رہتا ہے لیکن جب یہ صفتیں ایمان سے پھوٹ کر نکلتی ہیں تو پھر ان کے ظہور کا محل علٰحدہ علٰحدہ ہو جاتا ہے، یعنی نرمی اس جگہ ہوتی ہے جہاں نرمی چاہیئے اور سختی اس محل پر ہوتی ہے جہاں اس کی ضرورت ہے علماء نے لکھا ہے کہ کسی کافر کے ساتھ احسان اور حُسنِ سلوک سے پیش آنا اگر مصلحتِ شرعی ہو، کچھ مضائقہ نہیں مگر دین کے معاملہ میں وہ تم کو ڈھیلا نہ سمجھے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مناقب میں یوں تو صحیح حدیثوں کے انبار لگے ہوئے ہیں لیکن جس حدیث کو یہاں میں نے انتخاب کیا ہے وہ صرف اسلیے انتخاب کیا ہے کہ اپنے دورِ شباب میں جب کبھی میں نے انجیل کا مطالعہ کیا تھا تو ہر چند کہ وہ محرف ہو چکی ہے لیکن اس کا ایک فقرہ اتنا مؤثر ہے کہ اس کا اثر آج تک میرے دل میں تازہ محسوس ہوتا ہے اِس وقت اُس کا جو مضمون میرے دماغ میں ہے اس کے الفاظ قریب قریب یہ ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں" دیکھو تم دنیا کا نمک ہو لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو پھر وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔"

یہی مضمون آپ کے سامنے آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صحابہؓ کے متعلق ہے، آپؐ فرماتے ہیں کہ میرے صحابہؓ سے دین کی رونق اور دین کا مزہ اسی طرح ہے کہ جیسے کھانے کا مزہ نمک سے، مگر یہ وہ نمک نہ تھے جن کا مزہ جاتا رہتا بلکہ جب تک وہ دنیا میں موجود رہے، دین اور دنیا ان کے وجود سے لطف اندوز ہوتے رہے اور جب وہ گذر گئے، راوی ان کو حسرت سے یاد کرکے ان کا نوحہ ان الفاظ میں کر رہا ہے کہ ہائے جب ہمارا نمک ہی باقی نہ رہا تو ہمارے

دین میں مزہ کیا باقی رہے گا۔

صحیح مسلم میں ابو بردہ رضؓ اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سرِ مبارک کو آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا اور آپؐ کی اکثر عادتِ مبارکہ یہی تھی کہ (وحی کے انتظار میں) آسمان کی طرف نظر اٹھایا کرتے تھے، ارشاد فرمایا کہ ستارے جب تک جگمگا رہے ہیں اُس وقت تک آسمان پاش پاش ہونے سے محفوظ ہے اور جب ستارے ٹوٹ کر گر جائیں تو اس کے بعد آسمان کی خیر نہیں، اسی طرح میں اپنے صحابہؓ کے لئے ہر آفت سے ایک سپر ہُوں اور جہاں میں دنیا سے رخصت ہوا تو میرے صحابہؓ کی خیر نہیں اور اسی طرح میرے صحابہ رضؓ کا وجود میری ساری اُمت کے لئے باعثِ حفظ و امن ہے اور جب میرے صحابہ رضؓ کا دور ختم ہو جائے گا تو میری اُمت کی خیر نہیں (مشکوٰۃ شریف ص ۵۵۴) اس حدیث کی کچھ تشریح جواہر الحکم حصہ دوم کے مطالعہ سے واضح ہو سکتی ہے وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا کچھ مجمل نقشہ رزین کی روایت میں مذکور ہے، اس سے ان کی صفاتِ عالیہ کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جس کسی کو کوئی صحیح طریقہ اختیار کرنا ہو تو وہ ان صحابہ رضؓ کا طریقہ اختیار کرے جو خطرناک فتنوں سے محفوظ ہو کر دنیا سے گذر گئے اور ہم میں سے جو زندہ ہے اس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فتنوں کے چکر میں پڑ کر کدھر نکلیں گے۔

خوب یاد رکھو کہ وہ لوگ جو آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف ہوئے وہ اس تمام اُمت میں سب سے افضل تھے، ان کے قلوب نیکی اور تقوای میں سب سے بڑھ کر، ان کا علم سب سے زیادہ گہرا اور نہایت بے تکلف

اور یہ فضیلت اُن کے لئے کم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے سب سے افضل رسول کی رفاقت کے لئے پسند کیا اور ان کے ذریعہ سے اپنا پسندیدہ دین، دنیا میں صحیح طور پر پھیلایا، لہٰذا یہ تمہارا فرض ہے کہ تم بھی ان کی اس فضیلت کو پہچانو اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہو اور جہاں تک ممکن ہو ان کی ایک ایک عادت اور اخلاق کو اختیار کرو کیونکہ وہ بلاشبہ ہدایت کی سیدھی راہ پر قائم تھے (مشکوٰۃ شریف ص ۳۲)

اس حدیث میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں اس مختصر رسالہ میں ان کی تشریح کی گنجائش نہیں۔ دیکھنے میں وہ معمولی نظر آتی ہیں، لیکن ایک صحیح الفہم شخص کے لئے وہ ایک ایسا گہرا سمندر ہے جس کی تہ تک پہنچنا مشکل ہے، اگر طاقت اور فرصت میرا ساتھ دیتی تو اپنی چھوٹی سی حیثیت کے مطابق میں بھی کچھ لکھتا، اب یہ اہلِ قلم کے سپرد ہے کہ وہ ایک ایک صفت کو پھیلا کر دنیا کو یہ بتا دیں کہ یہ صفت ان میں کس درجہ کی تھی اور تمام دنیا کو جو حصہ اس میں سے ملا ہے وہ کتنا ہے۔

اہلِ ایمان سے یہ درخواست ہے کہ وہ باریک بینی اور موشگافیوں سے قطع نظر کر کے ان صفات میں سے اگر کوئی ذرہ اپنی زندگی میں پیدا کر سکتے ہیں تو اس کی کوشش کریں، یعنی دل میں تقویٰ اور نیکی، علم میں طول و عرض اور پھیلاؤ کے بجائے اختصار مگر گہرائی، تصنّع اور تکلف سے احتراز اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے مایوسی ہے تو اس کی بجائے آپ کی ایک ایک سنت کا دل و جان سے والہانہ جنون شاید ان صفات کی کوئی جھلک ہم میں پیدا کر دے تو جس رب العزت نے اپنی تمام مخلوق میں سے صحابۂ کرام کو پہلے چُنا تھا وہ آخر اُمت میں سے ہم ناقص در ناقص اور نالائق اُمتیوں کو اس شرف کے لئے چُن لے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا
تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ
عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ
لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ
سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

تمت

(مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۴۰۰ھ)